

خواتین اور شجرہائے اکیسویں صدی کا سفر دیکھیں

رداء دیجسٹل

FEBRUARY
2018

ماڈل: عیناں پتول
میک اپ: روز پھوٹی پاپلر
فوٹو گرافی: سمیعی ارشد

www.urdugem.com

چیف ایڈیٹر
صالحہ محمود

ایڈیٹورز
سکریٹری محمود جعفری، بلال جعفری
نائبہ امیر، فرار جعفری
E-Mail: frazjatri@aol.com
نائبہ UAE، عمیر علی جعفری
E-Mail: saqrchil@omirates.net.ae
نائبہ لندن، شکار آصف خان
آرٹسٹ: جنید انصار

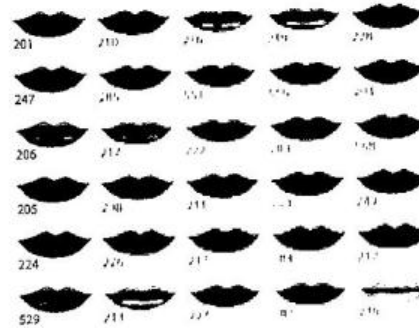
رداء انجسٹ
خط و کتابت کا ہنر
رداء انجسٹ
۱۳۶-۲۰۰ ڈی-۲
پتہ: سی-۱، ایس-۱
کراچی



Medora
Matte Lipsticks with matching Nail Enamel
"MATTE LOOK with LASTING COMFORT"



AVAILABLE IN 100 SHADES,
30 Selected Shades are shown here



'Matte' never goes out of trend! Beautiful, Bold, Smooth, Vibrant and
clayey lip colors. The perfect long wearing matte Formula.

MEDORA OF LONDON for a more beautiful you

ناولٹ



موت عطا فرما اور جو مجھ پر ایمان نہ لایا، میری تصدیق نہ کی اور یہ یقین نہ کیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے، اس کو بہت مال اور اولاد دے اور اس کی عمر طویل فرما دے۔“

برکت:

حضرت نقادہ (بن عبد اللہ) اسدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک آدمی کی طرف بھیج کر اس سے ایک اونٹنی طلب فرمائی۔ اس شخص نے (اونٹنی دینے سے) انکار کر دیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ایک اور آدمی کی طرف بھیجا۔ اس نے ایک اونٹنی بھجوا دی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی کو دیکھا تو فرمایا: ”یا اللہ! اس میں برکت عطا فرما اور اسے بھیجے والے کو بھی۔“

حضرت نقادہ نے کہا: میں نے کہا جو اسے لے کر آیا (اس کے لیے بھی برکت کی دعا فرمائیں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اور جو اسے لے کر آیا (اللہ اسے بھی برکت دے)۔“

پھر آپ کے حکم سے اسے دوہا گیا، اس نے بہت دودھ دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پہلے شخص کے بارے میں جس نے انکار کر دیا تھا، فرمایا: ”یا اللہ! فلاں کا مال زیادہ فرما۔“ اور

زیادہ مال رکھنے والے:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”زیادہ مال رکھنے والوں کے لیے ہلاکت ہے مگر جس نے مال کو اس طرح، اس طرح، اس طرح اور اس طرح (خرچ) کیا۔“

یہ فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں، بائیں آگے اور پیچھے چاروں طرف (ہر ایک بار) ارشاد فرمایا۔

سخاوت:

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اگر میرے پاس احد پہاڑ جتنا سونا ہو تو میں نہیں چاہوں گا کہ مجھ پر تیسری رات آئے اور (اس وقت بھی) اس میں سے کچھ میرے پاس (بچا ہوا) موجود ہو، مگر اتنی چیز جسے میں قرض کی ادائیگی کے لیے سنبھال رکھوں۔“

مسلمان کے لیے:

حضرت عمرو بن عیوان ثقفیؓ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یا اللہ! جو شخص مجھ پر ایمان لایا، میری تصدیق کی اور اس نے (دل سے) جان لیا کہ میں جو (شریعت) لے کر آیا ہوں وہ تیری طرف سے حق ہے تو اسے کم مال اور اولاد دے اور اسے اپنی ملاقات کی محبت نصیب فرما اور اسے جلدی

قارئین! آپ سب کا بے حد شکریہ۔ سال نو نمبر پر ردا کی پذیرائی اچھی لگی۔ آپ کی حوصلہ افزائی نے ہمیں سال کے آغاز میں ہمت و توانائی عطا کر دی ہے۔ فردری کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تب جنوری کی ہواؤں کا زور ٹوٹ چکا ہوگا۔ ٹوٹنے اور جوڑنے کا عمل صرف اور صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے لہٰذا کے فیصلے زندگی کے فاصلے کبھی کم اور کبھی اتنے طویل ہوتے ہیں کہ ہمیں احساس بھی نہیں ہوتا اس آنے والے کل کا جس کا ہمیں ادراک نہیں۔

قارئین! فردری موسم بہار کا آغاز زندگی کی وہی رفتار، کبھی ہم کبھی تم، خوب صورت لہجوں کے سائے زندگی کی یہ ادا میں کو بھائی، وقت کی آنکھ چوٹی، خوب صورت لہجوں کا ساتھ۔ رب کائنات کی ٹھنڈی ٹھنڈی بارشیں اور سرد ہواؤں کے جھونکے پورے ملک کو حسین بنا رہے ہیں۔ وہیں تھری بیمار یوں پر آنکھیں بند نہیں ہو سکتیں۔ یہ نرم اور گرم جھونکے زندگی کے ساتھ ساتھ موسم بہار میں زندگی خوشگوار لگتی ہے وہیں کہیں گرم لہریں ہمیں سرد کر دیتی ہیں۔ زندگی رب کائنات میں یکساں رواں دواں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر عمل پر ہم بے بس اور وہ با اختیار ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا یا ہم نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ ایک یک ذرے کا عمل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہے۔ اس ذات باری تعالیٰ کو ڈھونڈیں یا قریب جائیں اتنے ہی اس کے قرب میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔ وہی ایک راز ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ماہ فردری میں آپ سرد ہواؤں سے محفوظ رہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتیں آپ پر نازل ہوں۔ اپنا خیال رکھیے سندیہ ضرور لکھیے۔ تو اس ماہ کا ردا آپ کو کیسا لگا، سندیہ ضرور لکھیے۔ نئے لکھنے والے ردا کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھیے اپنی تحاریر اس امید کے ساتھ بھیجیں کہ ہم انہیں موقع ضرور دیں گے۔

آپی

new
freedom
Ultra thin sanitary napkins

اب مخصوص دن بھی گزاریں خوشگوار!!!

Ultra Thin Extra Long

freedom

ULTRA THIN 7 EXTRA LONG

Ultra Thin Long

freedom

ULTRA THIN 8 LONG

A product of
H&P
Health and Hygiene products

ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”(دنیا میں) اپنے سے نیچے والے (کم مال) کو دیکھو، اپنے سے اوپر والے کو نہ دیکھو اس سے یہ ہوگا کہ تم اللہ کی نعمت کو حقیر نہ سمجھو گے۔“

عمل اور دل:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے عملوں اور دلوں کو دیکھتا ہے۔“

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا بستر: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔“

بیویوں کے حقوق:

آپ نے فرمایا۔ ”تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو اپنی بیویوں سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔“ ایک اور جگہ آپ نے فرمایا۔ ”ایک مسلمان اپنی بیوی کے حق میں جتنا رحم دل اور مہذب ہوگا اتنا ہی وہ اپنے ایمان میں کامل ہوگا۔“ خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔ ”اپنی بیویوں سے شفقت اور محبت کا سلوک کرو۔ تم نے اللہ کی ضمانت پر ان کو اپنے لیے حلال کیا ہے۔ ان کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو اور ان سے بہتر سلوک کرو۔“ بیٹیوں سے ترجیحی سلوک کی ہدایت فرمائی۔ ”جب تم اپنے بچوں میں تقسیم کرنے کے لیے کچھ لاؤ تو بیٹیوں سے شروع کرو کیونکہ بیٹیوں کے مقابلہ میں بیٹیاں اپنے والدین سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔“

☆.....

جس نے اونٹنی بھیجی تھی اس کے حق میں فرما: ”یا اللہ! اس کو روزگار رزق دے۔“

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہلاک ہو جائے (تباہ ہو جائے) دینار کا بندہ، درہم کا بندہ، کمل کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ اگر اسے دیا جائے تو خوش رہتا ہے، اگر نہ دیا جائے تو (بیعت والا) وعدہ پورا نہیں کرتا۔“

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہلاک ہو جائے دینار کا بندہ، درہم کا بندہ اور چادر کا بندہ۔ ہلاک ہو جائے اونداھا ہو جائے، اسے کاٹنا لگے تو نکالنا نہ جائے۔“

قناعت کا بیان:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”امارت سامان کی کثرت سے نہیں ہوتی بلکہ امیری تو دل کی امیری ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یا اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کو ضروری حاجات کے مطابق رزق عطا فرما۔“

پوری دنیا:

حضرت عبید اللہ بن حصن انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس کی صبح اس حال میں ہوگی کہ اسے بدن میں عافیت، اپنے بارے میں امن اور دن بھر کی خوراک حاصل ہو، اسے گویا پوری دنیا جمع کر کے دے دی گئی ہو۔“

اپنے سے کمتر:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت

صبر اللہ کا ایسا لکھنا میں ہاں

جو حالات ہو گئے تھے اس کی وجہ نے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بہت دور کر دیا تھا مگر یہ سب بھی اپنی تھا.... دیکھو آج میری محبت سرخرو ہو گئی ہے.... میرا پیار جیت گیا ہے.... میں نے اپنی غنمی کو جیت لیا ہے.... میری محبت کی بارش میں تم پور پور بھیگ گئی ہو۔“ اس نے ذرا سا جھک کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔
”میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتا ہوں، تمہارے ساتھ خوشی بھری آسودگی بھری زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی؟“

”میری یہاں موجودگی آپ کا جواب نہیں ہے؟“ انہاں نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔
”بھئی میں تو عمل کا قائل ہوں، وہ چاہے اظہارِ فکر ہو یا اظہارِ محبت یا اظہارِ والہانہ پیار.... اب تم عمل کرو، ثابت کرو کہ تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو۔ زبانی کھلم کھلا نہیں مان رہا۔“ شرارت سے دیکھتے ہوئے

(آخری قسط)

”جب مجھے آپ کی طبیعت کے بارے میں پتہ چلا تو جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو، ایسا محسوس ہوا جیسے میرا دل بند ہو رہا ہے، سانسیں رک رہی ہیں۔“
”میں جانتا تھا کہ تمہارے دل میں میرے لئے بہت محبت ہے۔ آج بھی تم میرے بغیر نہیں رہ سکتی ہو مگر



ماؤنظروں سے اس کا معصوم چہرہ دیکھا۔ غنوی کے ہتھے آنسوؤں کو اس نے اپنے ہونٹوں پر جذب کر لیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہ کی کدب رونا نہیں۔

اس کی آنکھوں میں چھپی بے باک شوخی و شرارت کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی... اور ایک مکا اس کے سینے پر جڑ بھی دیا۔

”اس کا اندازہ تو مجھے ہے کہ آپ انتہا سے زیادہ بے باک ہو گئے ہیں اور ہوں بھی کیوں نہیں، آج کل ماڈلنگ کے ساتھ ڈراموں میں بھی جوائیکنگ ہو رہی ہے۔ بہت مزہ آتا ہوگا ناں جب کسی اداکارہ کو گلے لگا کر تسلی دیتے ہوں گے، اس کا ہاتھ پکڑ کے پیار بھرے ڈائلاگز بولتے ہوں گے۔“ ان مغرور آنکھوں میں ایک جلیں، حسد جیج جیج کر بول رہا تھا، سبکدین حیدر ترمذی بہت زور سے ہنسا۔

”میں تو سمجھتا تھا تم میری ماڈلنگ، میرے ڈرامے نہیں دیکھتی ہو گی مگر آج تمہاری جلیسی دیکھ کر دل کو بہت سکون ملا ہے۔“

”مجھ سے بات بدلنے کی کوشش مت کریں.... دل کڑھتا تھا میرا... نفرت ہوتی تھی جو ماڈل یا جو اداکارہ آپ کے آس پاس شہر کی کھیلوں کی طرح منڈلاتی ہوئی نظر آتی تھیں.... اور آپ تو ایسے خوش باش نظر آتے تھے، دل چاہتا تھا آپ کا چہرہ لگا دوں۔“

”جو کہ ایک بار کوئی بھی لگی تھی اور دیکھ لو آج تک اس نشان کو مدہم ہونے نہیں دیا ہے کیونکہ یہ میرے پیار کی نشانی ہے۔“ سبکدین حیدر نے اپنا داماں گال دکھایا۔ صاف شفاف جلد پر ناخن کا کھرا کھرچ کا نشان ابھی بھی موجود تھا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ زیادہ دل کی تاک کوئی ڈائریکٹر، کروگر آپ کو کام نہ دے۔“ اس کے تپ کر جل کر بولنے پر وہ ایک ہلکا سا ہنسا تھا۔ اب تو اس کو چڑانے میں مزہ آنے لگا تھا۔ ”یار ایسے تو نہ کہو، ہمیں پتہ ہے ہالی وڈ سے بھی ایسا لکھا ہوا ہے کی آخر آئی ہے اور تمہیں پتہ ہے وہاں کی ایکٹر تو بہت ہی سبکی اور ہاٹ ہوتی ہیں۔“

”سبکدین، خبردار جو آپ نے اس آفر کو قبول بھی کیا ہو تو یقین جانیں اپنی ماؤں کی جان ایک کردوں گی.... آپ اس کو میری ایکسو جھ لیں یا سیلفش مگر جو چیز میری ہوتی ہے میں اس پر کبھی کو نظر بھی ڈالنے نہیں دیتی۔“

مگر سبکدین حیدر تو متواتر بنے ہی جا رہا تھا۔ غنوی کا اقرار محبت، اس کی دیوانگی، اس کا جھون آج اس کے سامنے آ گیا تھا، پھر اس کو اور کیا چاہیے۔

”غنوی، میرے بچے، آپ میرا بہت بھلا کریں گی، میرے بزنس کا جتنا خرچ اس نالائق کی وجہ سے ہوا ہے اچھا ہے کچھ سبق تو ملنا چاہیے نا۔“ یکدم سے جو سب اندر آئے تو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر بوکھلا کے رہ گئے۔ سبکدین نے اس کی کمر سے ہاتھ ہٹایا۔ وہ سیدھی ہوئی اور تیزی سے خاقان اور سرینہ کے درمیان آکھڑی ہوئی۔

”میں بھی اپنی بیٹی کی طرح سخت خلاف ہوں کہ تم اپنا پھیلا ہوا بزنس چھوڑ کے ٹی وی کی جانب بڑھو۔“ ”اگر آپ بھوادرسر کی یہی خواہش ہے تو آپ کا حکم سر آنکھوں پر.... ورنہ غنوی کے دل کا بھید کیسے کھلتا۔ مگر اب مجھے ٹی وی ماڈلنگ وغیرہ میں کوئی انٹرسٹ نہیں ہے۔“

سبکدین حیدر ترمذی نے بہت چاہت و محبت سے وہ معصوم چہرہ دیکھا تھا جو شرم سے سرخ ہو رہا تھا، اس کی گھنیری پلکیں عارض پر بھیجی کوئی پیام سنار ہی تھیں، جہاں وہ اپنا ایک آشیانہ بنانا چاہتا تھا، اپنے خوابوں کا سجانا چاہتا تھا۔

☆.....☆

”اجیارہ بی بی، آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔“ اللہ دین نے مہمانوں کا پیغام اجیارہ تک پہنچایا۔ اجیارہ، زائر چوہان کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی۔

”مجھ سے ملنے آیا ہے، کون؟“ اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا، کہیں ابراش تو نہیں آیا۔ اس کے دل و دماغ میں بس یہی ایک سوچ تھی ورنہ اب کون تھا اس کا اس دنیا میں جو اس کی خبر رکھتا۔

”آپ جا کر مل سکتے، مجھے نکلنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی ہے۔“

زائر چوہان نے اس کے پر سوچ چہرے کی جانب دیکھا تھا۔ اجیارہ نے ڈرتے ڈرتے نظر اٹھا کر مصروف سے زائر چوہان کو دیکھا جو بریف کیس میں کچھ فائلز سیٹ کر رہے تھے۔

”آپ جیسے ہیں آ رہی ہوں۔“

”جی بہتر۔“ اللہ دین واپس چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد اپنے دل کو سناتی وہ ڈرائنگ روم میں آئی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ وہاں ابراش عسکری بیٹھا ہوگا مگر جس کا گمان نہیں تھا وہ کھڑے وہاں شہیر اور دعائیتھے تھے۔

”شہیر بھایا!... پورے ایک سال سے وہاں آج اپنے ماں جابا کو دیکھ رہی تھی۔ دل تو جذبات شدت سے رو پڑا، دل چاہا کہ بھاگ کے جائے اور اس کے سینے سے لگ کر خوب روئے، شکوہ کرے مگر اماں کا سوچ کر قدم جیسے زمین میں ہی گڑ گئے تھے۔“

”اجیارہ، میری گڑیا، میری بہن۔“ شہیر کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لئے۔ اجیارہ کا وہ اکھوتا۔ گا بھائی تھا۔ اس بھری دنیا میں اس کا ایک ہی واحد سگا رشتہ۔ وہ خود کو بتا دینے پر روک سکی اور تیزی سے اس کے گلے سے لگی۔

”کہاں چھوڑ کے چلے گئے تھے شہیر بھایا آپ ہمیں۔“ وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ شہیر کا بھی دل بھر آیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔

”مجھے معاف کر دو، میں نے بہت دل دکھایا ہے تمہارا اور اماں کا۔“ اماں کا خیال آتے ہی وہ شہیر سے الگ ہوئی۔

”ہاں شہیر بھایا، آپ نے بہت غلط کیا ہے ہمارے ساتھ، خاص کر اماں کے ساتھ.... میں اتنی بے بس اور مجبور ہو گئی تھی کہ باہر نوکری کرنے نکل گئی۔ جوڑ کی گھر کے دروازے پر نہ کھڑی ہوئی ہو وہ باہر نوکری کرنے نکل گئی۔ جانتے ہیں در در کی ٹھوکریں کس کس کھا کر کیسے کیسے واہیات لوگوں کو فیس کرنا پڑا تھا۔ ایک بھائی کے ہوتے ہوئے ایک بہن نوکری کرنے نکلی.... میں تو چلیں ایک بہن تھی.... وہ جنہوں نے نو ماہ اپنے اندر آپ کو سینت سینت کے رکھا، آپ کو پڑھایا لکھایا، اس قابل بنایا کہ آپ نوکری کے اچھے عہدے پر فائز ہوئے۔ اماں نے نہ دن دیکھا نہ رات، اپنی بھوک مار کر آپ کو پروان چڑھایا.... اور جب ان کے آرام کرنے کے دن آئے، بیٹھ کر سکون کی دوروئی کھانے کے دن آئے تو آپ نے کیا کیا.... ان کو اکیلا روئے

سکنے کے لئے چھوڑ دیا..... بالکل تنہا کر دیا۔“

اجیارہ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے۔ شبیر سر کو جھکائے شرمندگی کی اتار گہرائیوں میں دھنسا جا رہا تھا۔ اس کے پہلو میں بیٹھی دعا کے ہاتھ بھی صرف پچھتاوے ہی پچھتاوے تھے۔ اس نے وہ سب گنوا دیا تھا جو اب کبھی اس کو نہیں ملے گا۔

”میں نے راتوں کو اماں کو آپ کے لئے تڑپتے، روتے، بلک بلک کر فریاد کرتے دیکھا ہے۔ جانتے ہیں انہوں نے کبھی آپ کو بد دعا نہیں دی۔ اپنے رب سے بھی کوئی شکوہ گلہ نہیں کیا مگر شبیر بھایا، آپ نے انہیں توڑ دیا..... میری سمجھ میں نہیں آتا..... کیا بیٹے کی شادی کرنا اتنا بڑا جرم ہوتا ہے۔ ماں جب نوالے بنا بنا کر اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہے تو یہ نہیں سوچتی کہ وہ کیا کھائے گی، کب کھائے گی.... مگر جب بیٹا کما کر دیتا ہے تو روپے روپے کا حساب کیوں مانگتا ہے۔ کیوں وہ اپنی ماں کے ہاتھ پیسے رکھ کے حساب مانگتا ہے۔ جواب دیجئے بھایا..... آپ نے کیوں کیا ایسا..... دعا بھائی تو غیر محسوس، انہوں نے جو غلط سلوک برابرتاؤ کیا وہ سب آپ کی شہمی۔ آپ نے شادی کے بعد نہ تو کبھی اماں کی عزت کی اور نہ ہی دعا بھائی سے کروائی... اس سے بد قسمتی کی، بد نصیبی کی آپ کے لئے اور کیا بات ہوگی کہ وہ چپ چاپ آپ کو معاف کئے، آپ سے ملے بنا اس دنیا سے چلی گئیں۔“

”میں نے اماں کا دل دھماکے کی بجائے بڑا گناہ کیا ہے۔ میں نے ناشکری کر کے غرور و تکبر میں آکر اماں کو اور تمہیں محسوس پہنچایا ہے... آج اس کا بہت بڑا غناہ ہے بھگت رہی ہوں میں..... اجیارہ مجھے معاف کر دو۔“ دعا سے اب مزید برداشت نہیں ہوا۔ بلکتی ہوئی اجیارہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

”اولاد کے کھونے کا ڈر کیا ہوتا ہے، اس کا اور اس کا آج ہوا ہے مجھے۔ میں نے آج اپنا سب کچھ کھو دیا اجیارہ، بیٹا ہوا وہ بھی مرا ہوا۔ میں مرتے مرتے پچی بول کر شبیر کی نوکری، وہ فلیٹ سب کچھ چھین گیا، ہم سے۔ آج میرا غرور میرا تکبر سب میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میرے اپنے ماں باپ جن کو میں نے ہر سہولت دی، جن کی جبینیں بھریں، آج میرے برے حالات پر انہوں نے کبھی میرا ہاتھ چھوڑ دیا، مجھ سے منہ موڑ لیا۔ مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس کے گھٹنے پر سر رکھے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”مجھ سے اب مزید بوجھ سہا نہیں جاتا۔“

”یہ بوجھ تو آپ کو زندگی پھر دھونسا ہے دعا بھائی، آپ لوگوں کے جانے کے بعد مل کر مرتے دیکھا ہے میں نے اماں کو۔ میں سوچتی تھی اللہ اس وقت کہاں ہے؟ اس کی لاشی کہاں ہے مگر ہم غلط سوچتے ہیں، ہم برداشت نہیں کرتے کیونکہ وہ ہستی تو بے نیاز، لاشریک ہے جس کی نگاہوں سے کوئی چھپا ہوا نہیں ہے۔“

اجیارہ کو دکھ ضرور تھا مگر اپنی اماں کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کا آج حساب پورا ہو گیا تھا۔

”اجیارہ چلیں، ٹائم ہو گیا ہے۔“ دروازے سے ہی زائر چوہان نے پکارا تھا۔

”جی۔“ وہ کھڑی ہوئی اور ایک نظر ان دونوں پر ڈالی۔

”میری کوئی اوقات نہیں کہ آپ لوگوں کو معاف کر سکوں، جن کا دل دکھایا، جن کا ساتھ اور ہاتھ چھوڑ دیا، بلک بلک کر رونے لڑنے کے لئے چھوڑ دیا وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں..... میں نہیں جانتی آپ کی سزا کب ختم ہوگی مگر ماں جیسی ہستی آپ گنوا بیٹھے ہیں شبیر بھایا۔“ اور پھر وہ وہاں مزید نہیں رکی، نکلتی چلی گئی تھی۔

☆.....☆

”رشنا بھابی، اجیارہ کا میکے میں تو کوئی نہیں ہے اور گھر پر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا ان کو۔ اس لئے جنت آپ لوگوں کا ہی خیال آیا۔ مجھے زیادہ ٹائم نہیں ملے گا۔ پانچ سے چھ دن کے اندر میرا کام ختم ہو جائے گا۔ اسلام آباد میں ڈاکٹر کے سیمینار کی یہ مینٹگ نہایت اہم ہے اس لئے کچھ کہ نہیں سکتا، ایک ہفتہ بھی لگ جائے گا، اس لئے میں آپ کے پاس ہی ان کو چھوڑ کے جا رہا ہوں۔“

”زار صاحب! آپ بالکل بے فکر ہو کر جائیں، اجیارہ کا میں بالکل زنیہ کی طرح ہی خیال رکھوں گی، رشنا نے خوش دلی سے کہا تھا۔“

”بھینکس رشنا بھابی۔ مجھے اب کوئی فکر نہیں۔ میں بے فکری سے اپنا کام نبٹا سکتا ہوں۔“ زائر چوہان مسکراتے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ کب سے خاموش چپ چاپ سی بیٹھی اجیارہ پر زائر چوہان کی نظر پڑی۔ پھر انہوں نے بلک بلک کر کٹ کی جیب سے ایک سفید کرا لفافہ نکالا اور اجیارہ کی جانب بڑھایا۔ اجیارہ نے جھکا سر اوپر اٹھایا۔ یہ لڑکھائی، ہو سکتا ہے آپ کو ضرورت پڑ جائے۔ اس میں پورے تیس ہزار ہیں۔ اگر کسی شے کی ضرورت ہو تو رشنا بھابی زانیہ کے ساتھ جا کر لے آئیے گا۔“

اب وہ کیا کہتی کہ اس کو کچھ بھی شے کی طلب نہیں ہے۔ مگر اس نے وہ سفید لفافہ زائر چوہان کے ہاتھ سے لے لیا اور ان کے جانے کے بعد وہ لفافہ میں ٹیبل پر رکھ دیا جیسے وہ کوئی بیکار ردی ہو۔

”زانیہ نے آپ کا روم سیٹ کروا دیا ہے۔ آپ یوں کرو جا کر تھوڑا آرام کر لو پھر رات کے ڈنر پر ملاقات ہوگی۔“ رشنا نے نرمی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”جی۔“ وہ تو مسکرا بھی نہیں سکی اور ہونٹوں سے کھرا بول ہی گیا آنکھوں سے سینے، دل سے خوشی، سانسوں کی وہ خوشبو سب ہی کچھ تو کسی گہری قبر میں دفن ہو چکی تھی۔ وہ تو بس بے نام، بے روئی کی زندگی گھسیٹ رہی تھی، روحی پیچیدگی کی زندہ لاش بن کر بلا وجہ ہی اس دنیا میں زندہ کی زندگی گزار رہی تھی۔

اجیارہ کے جانے کے آدھے ایک گھنٹے بعد ابراش عسکری چلا آیا۔ کچھ ماندے ملاوڑ دودھ پی صوفے پر گر دیا۔ رشنا نے اپنے اکلوتے تخت جگر کو چاہ سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کی نظر بھی اتار لی تھی۔

”کیسا رہا میرے بیٹے کا آفس میں پہلا دن۔“

”ٹھیک تھا..... ابھی بزنس کی پیچیدگیاں سمجھ میں نہیں آرہیں۔ مگر آہستہ آہستہ سب سمجھ آ جائے گا..... خیر..... مام میں بہت تھک گیا ہوں، پلیز ایک کپ گرم گرم چائے مل جائے گی۔“

”ہاں کیوں نہیں۔ میں انجی خود اپنے ہاتھوں سے بنا کے لاتی ہوں۔“ رشنا کھڑی ہو گئیں۔

”میں اپنے روم میں ہوں، وہاں جھجھکاؤ تبھیے گا... یہ کیا ہے؟“ وہ اٹھنے لگا، نظر سفید لفافے پر پڑی۔ اس نے وہ لفافہ کچھ کی ٹیبل پر سے اٹھا کر دیکھا۔ اس میں ہزار، پانچ ہزار کے بہت سے نوٹ تھے۔

”ارے، یہ اجیارہ کا لفافہ ہے، ڈاکٹر صاحب دے گئے تھے۔ اجیارہ ہمیں بھول کے چلی گئی ہیں۔“

”اجیارہ.....“ زائر بے نام دہرایا۔

”ہاں، ڈاکٹر صاحب کسی اہم کام کے سلسلے میں اسلام آباد آگئے ہیں۔ اجیارہ کو یہاں چھوڑ گئے ہیں ایک ہفتے کے لئے۔“ رشنا کہتی ہوئی پگن کی جانب چل دیں۔

ابراش عسکری کے چہرے پر غصے کی واضح لکیریں ابھرنے لگی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے کھینچنے لگے

”وہ اٹھا تھا اپنی جگہ سے۔“
اجیارہ اپنے روم میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ نہایت گہری سوچوں میں غلط تھی۔
”کیا ہے میری زندگی

شاید یونہی بے وجہ جیسے کا نام ہے زندگی....
ہنا کی مقصد کے سانس لینا ہے زندگی.... ادھوری سی.... نامکمل سی ہے میری زندگی....
جس میں نہ رنگ ہے نہ خوشبو اور نہ....
محبت....“

بادامی آنکھوں سے چند موتی ٹوٹ کر اپنا اصل کھوتے چلے گئے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب، آپ کو ایک ہی گھر ملا تھا مجھے یہاں چھوڑنے کے لئے.... دنیا اتنی تنگ ہے میرے لئے
آج... اس پل... اس لمحہ... احساس ہوا تھا....“

دھڑ سے دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز پر اس کی گہری سوچوں کا تسلسل ٹوٹا۔ اس نے بھیگی آنکھوں
سے دروازے کی جانب دیکھا، وہاں ابراش عسکری دروازے کو لا کڑ کر رہا تھا۔ اجیارہ کا دل عجیب انداز میں
دھڑکا تھا۔ وہ بیڈ سے کھڑی ہوئی۔ ابراش عسکری نہایت جارحانہ انداز میں اس کی طرف بڑھا۔ آنکھوں میں
غصہ لئے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک پر مرمیوں کی گولیوں میں دبوچی اور نہایت سختی سے اس کو اپنی
جانب کھینچا۔ وہ گہری نازک اور کمزور دہی، پھیکی اس پہاڑ جیسے وجود سے ٹکرانی۔

”کیوں.... کیوں.... کیا.... میرے ساتھ اس کے ج، مجھے میرے ہر سوال کا جواب چاہیے۔ کیوں دھوکا
دیا، کیوں بے وفائی کی مجھ سے.... بولو....“ ان گولی بادی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ آہستگی سے دھاڑا
تھا، ان آنکھوں میں اس قدر دکھنا ہوا تھا کہ وہ ان آنکھوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ گھنیری سیاہ پلکوں کی
باڈر خسار پر سجدہ ریز ہو گئیں۔

”ابراش پلیر، چھوڑیے مجھے درد ہو رہا ہے۔“ آنکھوں کے ساتھ ساتھ وہ بھیکا ہوا تھا۔ وہ مزاحمت
کر رہی تھی خود کو چھڑانے کی، جس کے لئے مقابل قطعی طور پر راضی نہیں تھا۔

”درد.... ہونہ۔“ اس نے اجیارہ پر گرفت مزید سخت کر دی تھی کہ وہ درد کی شدت سے راہ کے رہ گئی۔
”تم جانتی ہو درد کسے کہتے ہیں۔ میرے خوابوں میں، دل میں خوش فہمی کے جگنوؤں کو روک کر کے خود کسی
اور کا دل روشن کر دیا۔ مجھ سے محبت کے وعدے وعدہ پیمان کر کے کسی اور کا وعدہ نبھانے چلی ہو.... مجھے حسین
سننے دکھا کے کسی اور کی تعمیر مکمل کرنے چلی ہو.... تو.... بولو تو.... کیوں مجھے بچ مجھ ہار میں اکیلی و تنہا شقی
کا مسافر کر دیا.... بولو جواب دو مجھے۔“ وہ زور سے چیخا اور جتنی شدت سے اس کو اپنے مضبوط شکنجے میں جکڑ
رکھا تھا اس سے کہیں زیادہ نفرت سے اس کو خود سے پرے کیا جیسے وہ کوئی اچھوت ہو.... اجیارہ اس کے جھٹکے
کا وارہ نہیں کر سکی تھی.... وہ تو بے بسی اس کا یہ جاہ و جلال غیض و غضب دیکھ کر اندر ہی اندر تہم گئی تھی۔ ڈر
و خوف کے مارے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

پیچھے اگر جہازی ساز بیڈ نہ ہوتا تو وہ یقیناً بری طرح نیچے کارپٹ پر گر گئی اور یقینی تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی
ہڈی تو آج ٹوٹ ہی جاتی۔

”میں مجبور ہو گئی تھی۔“ نہایت ڈرتے ڈرتے اس کے حلق سے دلی دلی آواز نکلی۔

”ہاں، مجبور ہو گئی تھیں تم.... مگر اس کے لئے....“ ابراش عسکری نے وہی سفید لٹافہ نکالا اور اس پر الٹ
دیا۔ سارے نوٹ اس کے اوپر ادھر ادھر بکھرتے چلے گئے تھے.... اس کا مطلب اس کا اشارہ اور اس طرح
پیسوں کا اس پر پھینکا جانا.... اجیارہ کو ایسا لگا جیسے اس نے بہت زور سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو، اس کو
گالی دی ہو.... وہ جرح کرنا بھی چاہے تو بھی نہیں کر سکتی تھی۔
”ہے نا یہی مجبوری ہے نا....“ ابراش عسکری نے طنزیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کی تنقید کی۔
”خدا ارایسے واپیات التزام مت لگا لیں مجھ پر۔“ انتہائی نظروں سے دیکھتی وہ ٹھیک سے خود کا دفاع بھی
نہیں کر سکتی تھی۔

”تو تم ہی بتاؤ کیوں کیا میرے ساتھ اس طرح.... کیوں مجھے ایک بار پھر تنہائیوں کا، سناٹے کا مسافر
بنادیا.... اگر ایسا ہی کرنا تھا تو کیوں مجھے اندھیروں سے نکالا، کیوں میرے اندر محبتوں اور چاہتوں کے دیپ
جلائے.... میرے اندر احساسات و جذبات ابھرے کہ میں تمہیں دیوانگی کی حد تک چاہنے لگا.... تمہارے
بغیر ایک لمحہ چینلا ہوا ہے۔“ ابراش عسکری نے اس کو ایک بار پھر نرمی سے تھام کر خود سے قریب تر کیا اس
نے ساری ہمتیں جمع کر کے اس کے مرجھائے چہرے کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں کس قدر اداس ہو گئی
تھیں۔

”ابراش پلیر مجھے بھول جائے۔“ لب و لہجے میں التجا تھی، فریاد تھی، گزارش تھی یا درخواست کہ ابراش
عسکری نے اس پر اپنی گرفت کمزور کر دی۔
”جس دن میری سانسیں رکنے کی خبر مل جائے تو مجھ کو لینا اس دل نے تمہیں خود سے آزاد کر دیا۔“
اور پھر وہ مزید وہاں رک کر اپنا صبر اور نہیں آؤ مارا لگا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ایک بار پھر وہ بیڈ پر
بیٹھتی چلی گئی۔ یہ گرم سیال تو اب اس کا مقدر بن گئے تھے۔

☆.....☆
اس شہر کے سب سے اعلیٰ و عمدہ مہنگے ترین ہوٹل میں رجاء صدیقی اور بلوچ کی معاشی کی تقریب رکھی گئی
تھی اور اس شاندار تقریب میں نامور اور مشہور ترین مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ نامور بلیو انترجائیکون، مشہور ٹی
وی ایکٹر اینڈ ایکٹر سر کو مدعو کیا گیا تھا جو اس شاندار تقریب کو رونق بخش رہے تھے۔
”شکر ہے ورنہ میں تو سمجھا تھا تمہیں رجاء کے لئے اپنے اور جوئے گھسنے پڑیں گے۔“ بلیو انترجائیکون حیدر نے
ندیم بلوچ کو پچھڑا۔

”وہ کہتے ہیں ناصر کا پھل بہت میٹھا ہوتا ہے۔ مجھے میری محبت اور صبر کا پھل رجاء کی صورت میں مل گیا
ہے۔“ آنکھوں میں جگنوؤں کو روشن کئے اس نے سیانے دیکھا۔ گرے اینڈ بلیو انترجائیکون کی انارکلی فراک
میں رجاء صدیقی سیدھا اس کے دل میں اتاری جا رہی تھی۔ بس نہیں چل رہا تھا کہ سب سے نظر بچا کے، سب
سے چھپا کے دور کہیں آشیانے میں لے جائے۔

”بس کرے، کیا آنکھوں ہی آنکھوں میں ثابت و سالم ہی نگل جائے گا۔“ سید اذکار علوی نے اس کی
نظروں کے ارتکاز میں دیکھا۔

رجاء صدیقی، غنوی اور سبرینہ کے ساتھ مسکرا مسکرا کے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی دیکھنے
سے تعلق رکھتی تھی۔

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رجاؤ کو منانا ایسا تھا جیسے میں نے لوہے کے چنے چائے ہوں۔ تم دونوں کو تو میں نے دیکھ لیا، مجال ہے جو میری کسی نے مہلپ کی ہو۔“ ندیم بلوچ نے باری باری دونوں کو گھورا۔

”واہ، سارا کرڈٹ خود ہی لے لو، یہ کافی نہیں کہ ملاویا کس نے تھا۔“ سبکگلین حیدر ترمذی نے مزید چھیڑا۔ ”کرم، نوازش، شکر یہ۔ یہ احسان تو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا آپ کا۔“ ندیم بلوچ نے مصافحہ کے لئے ہاتھ ملا یا۔

”کوئی بات نہیں، میں ایسے احسان اکثر کرتا رہتا ہوں۔“ سبکگلین حیدر نے فرضی کارل جھاڑے۔ ”اگر میری منگنی کی تقریب نہ ہوتی تو پھر تمہارے احسان کا جواب دیتا۔“ اس نے سلگ کر ہاتھ چھڑایا۔ سبکگلین حیدر ہولے سے ہنس دیا اور اس کا ساتھ سید اذکار علوی اور ذاکر حیات نے بھی دیا۔ ”بیسے ندیم صاحب، آج آپ واقعی بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“ ذاکر حیات نے مسکرا کے کہا۔ ”دھیٹلس یار، کسی نے تو میری تعریف کی، ورنہ یہ دوست تو غدار ہیں۔“

”اب روز بروز کی وی پر دیکھی وہی میک اپ سے تھوپی شکل کی کیا تعریف کریں۔“ سید اذکار علوی کی بات پر اور ندیم بلوچ کے ہنسنے سے وہ لوگ ہنس دیئے۔

”سید وڑائچ... یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“ سبکگلین حیدر ترمذی کی ہنسی کو بریک لگے تھے۔ اس نے بہت دھیس سے کہا سید اذکار علوی اور ذاکر حیات کے کان کھڑے ہو گئے۔ وہ دونوں چوکنے سے ہو گئے۔ ندیم بلوچ تو اپنے کسی ماڈل ساتھی کے بلانے پر چلا گیا۔ ”ایکسیکو نرمی... ابھی کیا کہا تم نے؟“

”وہ... سید وڑائچ ہے۔“ سبکگلین حیدر کے اشارے پر دونوں نے اس جانب دیکھا۔ چوہدری قیصر عسکری اور خاقان ترمذی کے ساتھ وہ شخص کھڑا تھا۔ ”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کیونکہ کچھ ہی دیر پہلے چوہدری قیصر صاحب کو حضورف سنگھانیہ کے نام سے متعارف کراتے دیکھا تھا میں نے۔“

ذاکر حیات نے سبکگلین حیدر کو دیکھنے کے بعد سید اذکار علوی کو دیکھا۔ سید اذکار علوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا، ذاکر حیات تیزی سے کھڑا ہوا۔

”حیدر تمہارا پورا نام کیا ہے؟“

”سبکگلین حیدر ترمذی۔“

بس پھر اس سے آگے اس کو نہ کچھ کہنا تھا اور نہ کچھ پوچھنا۔ اس نے جلدی سے ندیم بلوچ کو آواز دی۔

”ندیم تم نے مجھے بتایا نہیں حیدر کا نام سبکگلین بھی ہے۔“

”کبھی ایسی ضرورت ہی نہیں پڑی اور پھر ہم تو سب حیدر کے نام سے جانتے پہچانتے ہیں۔ کیوں کوئی بات ہوئی ہے؟“ ندیم بلوچ کو اس کا گفتیشی انداز سمجھ میں نہیں آیا۔

”تم سب یہ چھوڑو، جتنی جلدی ہو سکے حیدر کو یہاں سے لے کر جاؤ، گوفاسٹ۔“

”ندیم ابھی نام نہیں ہے، جاؤ جلدی۔“

”اوکے، اوکے بابا... ایک تو تم فوج والے بھی نہ جانے کب کیا سوچتے ہو، کیا کرتے ہو۔“

”سبکگلین، سبکگلین، بات سنو۔“ کوئی لڑکی سبکگلین کو آواز پکار رہی تھی۔ خاقان ترمذی سے بات کرتے ہوئے حضورف سنگھانیہ چوک کر پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی باہر کی جانب جا رہی تھی۔

”سبکگلین رک جاؤ!“

وہ کوئی تین سال کا چھوٹا سا بچہ تھا، حضورف سنگھانیہ رک کر دیکھنے لگا۔ وہ لڑکی اس بچے کو لے کر جانے لگی۔

حضورف سنگھانیہ نے سر جھٹکا اور واپسی کے لئے پیچھے پلٹا تو اپنے بالکل سامنے سید اذکار علوی اور ذاکر حیات کو سامنے پایا۔

”وہ کون سا بچہ ہے؟“ سید اذکار نے مسکرا کے کہتے ہوئے ایک زوردار مکا اس کے دماغ پر مارا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

☆.....☆

تیل کی آواز پر اندرونی دروازے کی جانب سید اذکار علوی بڑھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ وہاں جو چہرہ موجود تھا، سید اذکار علوی نے مسکراتے ہوئے اس وجود کو ویکم کہا تھا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ مقابل نے اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔

”کیا آپ کو لگتا ہے کہ آپ کو اندر آنے کی اجازت کی بھی ضرورت ہے۔“

”جی نہیں، آپ بلا اجازت اندر آ سکتے ہیں۔ آپ کو کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔“ سید اذکار علوی نے سائینڈ میں ہو کر زائر چوہان کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

”یہ پھر آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ آپ اس ناچیز کو نہ صرف عزت و قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں بلکہ اپنے دل میں بھی جگہ دیتے ہیں۔“

زائر چوہان اندر آ چکے تھے، سید اذکار علوی ان کے ہم قدم چلنے لگا۔

”کون ہے، بتانا؟“ ٹی وی پر نیوز دیکھتے سید آغا شہباز علوی نے رخ موڑ کے دیکھا۔ وہاں زائر چوہان کو دیکھ کر ان کو دلی خوشی ہوئی۔

”ارے زائر، کیسے ہو؟“ وہ بھی کھڑے ہو گئے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”فائن۔“ زائر چوہان نے فوراً ان کا ہاتھ تھاما۔

”آپ سنائیے، آپ کیسے ہیں۔“

”بیٹھے۔“ سید اذکار علوی نے بیٹھنے کا کہا۔ وہ ایک سنگل صوفے پر براجمان ہو گئے۔

”خوش باش، پرسکون اور مطمئن۔“ انہوں نے اطمینان سے کہتے ہوئے مسکرا کے زائر چوہان کو دیکھا۔

”تم سناؤ... تم کیسے ہو...؟“

”آپ کی طرح اتنا پرسکون اور مطمئن نہیں ہوں۔“

”ارے وہ کیوں؟“

”ڈاکٹر کی زندگی بہت ٹھنک رہی ہے، آغا صاحب۔“

”وہ تو ہے... زائر آپ جیسے لوگ اس دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ہمت، برداشت، صبر، یقین، مضبوط ارادے والا انسان اللہ نے اس دنیا میں بھیجا ہے۔“

”بالکل درست کہا آپ نے دادو۔ زائر صاحب کی تو میں بھی تہہ دل سے عزت و احترام کرتا ہوں۔ بے شک آپ تعریف کے لائق ہیں، خراج تحسین کے قابل اور حق دار!“

”اب بس کر دیں، بہت میری تعریفیں ہو گئی ہیں اور سچ کہوں تو آپ لوگوں کہ یہی تعریفی کلمات نے کبھی میرا حوصلہ ڈمکا نہ تھا۔ ابھی میرے قدم پست نہیں پڑے، میرے مضبوط ارادے کمزور نہیں پڑے۔“

شدت جذبات سے زائر چوہان کی آنکھوں میں ایک معمولی سی نمی کی لکیر بھر گئی۔

”اچھا یہ بتائیں کیا کھائیں گے، آج کا بچہ ہمارے ساتھ۔“ اذکار علوی نے کہا۔

”نہیں بالکل بھی نہیں۔ آپ کے اللہ کے فضل و کرم سے سارے کام پایہ تکمیل تک پہنچ گئے مگر ہم تو مسافر ہیں ڈاکٹر مسافر۔ اگر غور کیا جائے تو ہماری لائف آپ ہی کی طرح کھٹ جاب ہے۔“

”مگر میرا خیال ہے آپ کی جاب مجھ سے زیادہ کھٹ ہے اور شاید رکنی۔ ہم میں اور آپ میں کوئی فرق نہیں ہے، آپ ہی کی طرح زندگی ہے ہماری بھی۔“ سید آغا شہباز علوی نے فرط مسرت سے دیکھا۔

”خدا نہ کرے آغا صاحب جو کوئی میری جیسی زندگی گزارے۔“ زائر چوہان نے تیزی سے بات کاٹی۔

ان کے چہرے پر درد کی پرچھائیاں تھیں، آنکھوں میں تکلیف دہ ایک کہانی رقم تھی۔ سید اذکار علوی کو بہت دکھ ہوا تھا۔ بے شک وہ جیسے بھی تھے مگر اس شخص کی بھی منہ نہیں موڑا جاسکتا کہ وہ انسانی وجود کی خدمت کے علمبردار تھے، اپنی ساری زندگی انہوں نے انسانی وجود کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔

”آگے کیا پلان ہے آپ کا؟“

”کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی بہت اہم ہے۔ کسی گواہ کی امانت لوٹانی ہے۔ کسی کا وعدہ نبھا کر اس کی خوشیاں دینی ہیں۔“ ان کی آنکھوں کی اسکرین پر اچھا رہ کی مصدوم کی تصویر اچھلائی گئی۔

”چلیں ٹھیک ہے، یہ کام بھی بہت ضروری ہے۔“

”میں اذکار اور بریزے کے ویسے کی دھوم دھام سے تقریب رکھ رہا ہوں۔“

”آغا صاحب، بہت مشکل ہے مگر میری دعا میں اذکار اور بریزے کے ساتھ ہیں۔ اس بچی نے بھی بہت عرصہ تنہائی کا غم سہا ہے۔ اذکار اس لئے میری طرف سے آپ کے اور بریزے کے لئے مورے شمر کے دوغنی مون کے ٹکس ہیں۔ جائے اور خوب کھمائیے، لائف انجوائے کریں۔“ زائر چوہان نے اپنے بلیک کلر کے کوٹ کی جیب سے دو ٹکٹ نکال کے اذکار علوی کی جانب بڑھائے۔

”اگر یہ آپ کی طرف سے گفٹ ہے تو میں ضرور رکھوں گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے وہ دونوں ٹکٹس تھام لئے۔

”اب مجھے اجازت دیجئے، دیر ہو رہی ہے۔ شاید آج رات کی فلائٹ سے جانا پڑ جائے۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔ سید آغا شہباز سے الوداعی ہاتھ ملایا۔

”چلیں میں آپ کو باہر تک چھوڑ دوں۔“

”اذکار جلدی آئیں، مجھے آپ کو کچھ دکھانا ہے۔“

”بریزے بھاگتی ہوئی وہاں آئی مگر زائر چوہان کو دیکھ کر رک گئی۔ اذکار علوی نے اس کو دیکھا۔“

”وعلیکم السلام، جیتی رہیے، خوش رہیے۔“ زائر چوہان نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھ کے ڈھیروں دعائیں دیں۔ بریزے نے بغور ان کو دیکھا۔ یہ چہرہ اس نے کبھی دیکھا ہے۔ وہ ذہن پر زور ڈالنے لگی مگر کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

”اچھا، اب اجازت دیجئے، بریزے بیٹی آپ کو بلانے آئی ہیں، آپ پہلے ان کی بات سنیں۔“ وہ الوداعی نظر ڈالتے آگے بڑھ گئے۔

”اذکار میں نے ان کو نہیں دیکھا ہے۔“ وہ اذکار علوی کی طرف مڑی۔

”ہاں میں جانتا ہوں مگر تم کچھ کہنے آئی تھیں؟“ اذکار علوی نے چاہ سے اس کا سندر چہرہ دیکھا۔

”یارتہم دن بدن اتنی خوبصورت کیوں ہوتی جا رہی ہو۔“ اس نے پر شوق نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

بریزے جھینپ سی گئی۔

”ارے آپ نے تو مجھے بھلا دیا۔“ وہ جھنجھلائی۔

”آں ہاں کچھ نہیں۔ ہاں بالکل بیڈروم میں۔“

”اذکار.....“

مگر اذکار علوی نے ایک نئی اور نئے چٹک کر اس کا نازک اندام اپراؤں جیسا وجود اپنی بانہوں میں بھر لیا اور بیڈروم کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

”سرکار، ابراش صاحب آگئے ہیں۔“ سر کو جھکائے اندر دیکھنے لگا۔

”تم ان کو بچنے کے پیچھے والے کمرے میں لے جاؤ میں باجی منٹ میں آ رہا ہوں۔“

”جی بہتر سرکار۔“ اللہ دین اپنے بے آواز آنسو صاف کرتا کمرے کے بل گیا۔

زائر چوہان نے شیشے میں خود کو ایک بار پھر دیکھا اور ایک گہرا سانس لینا دیا۔

”ابراش عسکری کو دس منٹ ہو گئے تھے یہاں بیٹھے، انتظار کرتے کرتے...“

”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”کیوں باجی! میں جہاں رہتا ہوں وہیں رہوں گا نا۔“ سحر بانو نے پھکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”کیا یہ سب سیدھا سیدھا ہی کہوں گا۔“ اور پھر سحر بانو نے دھیرے دھیرے اپنا آرٹیفیشل زیور،

بڑی بڑی سستی سی گولڈن چوڑیاں اتاریں، کانوں سے بڑے بڑے سلور جھمکے اتارے، گلے سے بڑے بڑے ہار اتارے اور سر سے بھڑکتا اور جگمگاؤں والا ڈیو پٹہ اتار کے سب کچھ سائیڈ میں رکھا۔ سر سے بالوں کی

وگ اتاری، ٹشو سے اپنا چہرہ رگڑا اور جو چہرہ سامنے تھا، ابراش عسکری کو ایسا محسوس ہوا کہ پوری جان سے اس بچھلکی ایک ایک اینٹ اس کے وجود پر اس طرح گری ہے جیسے کہ وہ سات زمین کے نیچے دھنستا چلا گیا ہو۔

”ڈاکٹر زائر!“ صدے کی کیفیت تھی، وجود پتھر ایا ہوا تھا، قدم ڈمگے رہ گئے تھے۔

”ہاں، ڈاکٹر زائر چوہان عرف سحر بانو.... جس کی اصل پہچان یہی ہے۔“ کتنی ہی دیر تک وہ خاموش تماشا بنی بٹا بس دیکھتا ہی چلا گیا۔

”میری پیدائش پر میری مٹی نے کسی کو نہیں بتایا کہ میری اصل شناخت کیا ہے۔ ہم بس اپنے مٹی ڈیڑی کے دو ہی بچے تھے۔ مجھ سے سات سال بڑی بہن حمیرا آ، ان کو میرے بارے میں بہت بعد میں ان کی شادی کے بعد پتہ چلا تو انہوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا۔ مجھے چھوڑ کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ابر ڈجائیں۔ وہ بہن جو مجھ پر جان چھڑکتی تھی میرے بارے میں جان کر اپنی فیملی سمیت مجھے چھوڑ کے، ہر رشتہ، ہر ناپہ توڑ لیا۔ وہ جھٹی ہیں سوسائٹی میں کوئی عزت نہیں رہے گی۔ ان سے میرا رشتہ جان کر یہ معاشرہ ان کا ان کی فیملی کا مذاق اڑایا جائے گا مگر کہتے ہیں نا کہ دنیا میں اگر کوئی رشتہ سچا اور مضبوط ہے تو وہ صرف ایک رشتہ ہے، ماں کا رشتہ، خالص اور پائیدار.... انہوں نے مجھے کبھی نہیں چھوڑا، ہر قدم پر میرا ساتھ دیا، میرا ہاتھ تھام.... مجھے اس قابل بنایا کہ میں اسی معاشرے میں ایک نامور فیس ڈاکٹر اسپیشلسٹ اسکن سرجن ہوں۔ جس کی پہنچ، جس کی عزت، جس کی ڈیمانڈ ہر ملک میں بھی ہے۔ جس کو فون کر کے اپنا منہ لیا جاتا ہے مگر جب اس سوسائٹی، اسی معاشرے کو جب یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم ایک خواہ سہرا ہیں تو وہ ہم کو بہت گری ہوئی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہم کو اچھوت سمجھ کر ہم سے ہٹا گئے ہیں۔ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، ہٹ کتے ہیں۔ ہمیں ایسے ایسے شرمناک اور واپسات ناموں سے القابات سے نوازتے ہیں جیسے ہم کوئی انسان نہیں فقیر ہیں، حقیر ہیں، اس سر زمین پر رہنے والے کیڑے مکوڑے ہیں یا جھانڈیاں۔“ سحر بانو کی آنکھ سے آنسو ٹپکا جسے اس نے اپنی دو انگلیوں سے ہوا میں اڑا دیا اور طریقہ ہی ہنستا ہوا آگے بڑھا۔

”میری ماں نے بھلے ہی مجھے بہت اونچائی پر نشاوار دیا۔ لوگ بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ امیر سے امیر عزت دار گھرانے والے اپنا علاج کرانے آتے ہیں۔ مجھے اپنی شناخت، اپنی پہچان بھولی نہیں ہے۔ میں دنیا کو تو دھوکا دے سکتا ہوں مگر خود کو نہ ہی دھوکا دے سکتا ہوں اور نہ ہی نظر پراسکتا ہوں۔ اس لئے خود کو زندہ رکھنے کے لئے اپنی پہچان اپنی شناخت کو زندہ رکھنے کے لئے رات کی تاریکی، رات کے گھپ اندھیرے، گہری خاموشی میں خود کو بھلاتا ہوں۔“

”آپ کی مٹی کو علم تھا آپ کے اس روپ کے بارے میں۔“ بہت ہولے سے پوچھا۔

”نہیں وہ نہیں جانتی تھیں اور نہ ہی میں نے کبھی انہیں بتایا۔ انہوں نے میرے لئے ہاتھ کچھ کیا۔ رشتے داروں کو چھوڑ دیا تو میں انہیں کیسے دکھ دے سکتا تھا مگر اب حمیرا آپا کے فون پر فون آرہے تھے۔ ان کو ضرورت تھی مٹی کی۔ ان کے بچوں کی شادیاں تھیں، وہ سب ان کو بلارہے تھے، سوائے میرے.....!“

ابراش عسکری کی آنکھیں بھر آئیں۔ سحر بانو نے ایک سر دسائیں کھینچا۔

”مٹی کو جانا تھا مگر وہ مجھے اکلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھیں، جس طرح انہوں نے میرا خیال رکھا وہ چاہتی تھیں ان کے جانے کے بعد کوئی انہی کی طرح میرا خیال رکھے اور میرے بہت منع کرنے، انکار کرنے کے باوجود انہوں نے میری شادی کر دی میں کیا دے سکتا ہوں اس معصوم لڑکی کو جس نے صرف اپنی ماں کی بڑھتی ہوئی بیماری کے سبب مجھ سے شادی کے لئے حامی بھر لی مگر اجیارہ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بہت معصوم، پاکیزہ اور مقدس ہے اور تمہاری محبت.....“ سحر بانو نے مسکراتے ہوئے ابراش عسکری کو دیکھا، ابراش عسکری نے بھی

حیران ہو کر دیکھا۔

”پتہ نہیں کیوں تم مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ میں تمہارا برا نہیں چاہتا تھا۔ راتوں کو میں تمہارے پیچھے اس لئے لگا رہتا کہ کہیں کسی بے باک عریاں لڑکی کے بہکانے میں آ کر تم کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لو کہ زندگی پر پھینکاؤ تمہارے مقدر پر ہیں۔ تمہارا غرور، تمہارا تکبر دیکھ کر میں اللہ سے تمہارے لئے دعا کرتا تھا کہ تم شیخ راستے پر آ جاؤ مگر دیکھو تمہارا غرور اللہ کو اس طرح توڑنا تھا۔ تکلیف تو بہت ہوئی مجھے مگر تمہارے بھلے کے لئے یہی تھک تھا۔ تمہیں یاد بھی ہوگا میں تمہیں دیکھنے تمہارے گھر بھی آیا تھا۔“

ابراش عسکری کو وہ دن یاد آ گیا۔ ”وہ ہیں میں نے اجیارہ کو دیکھا اور جب دلہن بنے اجیارہ کو یہاں دیکھا تو جیسے میرے بہروں تلے سے زمین نکل گئی ہو مگر دیکھو نا اس میں بھی اللہ ہی کی مصلحت تھی۔ اگر خدا نخواستہ اجیارہ کی شادی اسی اور سے ہو جاتی تو زندگی بھر نارسائی اور جدائی کا دکھ نہیں اٹھانا پڑتا مگر میں جانتا ہوں کہ تم اجیارہ سے دیوانگی کی حد تک محبت کرتے ہو۔ اس سے عشق کرتے ہو اور کسی کی محبت میں خیانت کرنا بری بات ہے۔ بڑی نظر بھی ڈالنا یہ میری عزت کے خلاف ہے۔“ سحر بانو نے وہاں ڈیرنگ ٹیبل سے کچھ کاغذات اٹھائے اور ابراش عسکری کی طرف بڑھائے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس میں طلاق کے پیر اور میری سادہ پر اپرٹی کے کاغذات ہیں جو میں نے اجیارہ کے نام کر دیے ہیں.... پکڑو انہیں۔“

ابراش عسکری نے بشکل وہ کاغذات اٹھائے۔

”مجھے نہیں معلوم میری زندگی اور کتنی سے مگر میں اپنی زندگی سے بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میں نے اپنی زندگی بے مقصد نہیں گزارا۔ اب میں بہت تھک گیا ہوں۔ بہت آرام کرنا چاہتا ہوں اور خانہ کعبہ، مدینہ منورہ جیسی کوئی بر سکون جگہ نہیں، میں وہاں بجا ہاں ہوں، وہاں رہوں گا، پھر پتہ نہیں کہاں یہ مہمان گھر ہے اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو مجھے معاف کرنا۔ خدا اور اپنی محبت اور امانت لے جاؤ جو میرے پاس کسی قیمتی شے کی طرح محفوظ تھی۔ مجھے اب جانا ہوگا، بہت دور، بہت دور۔“

زائر چوہان نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے ابراش عسکری کا شانہ تھپتھپایا اور واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے، اس میں تو اتنی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ روک سکتا، اپنے نادانستگی میں کئے گئے جملوں کی معافی مانگ سکتا۔ ذہن کی اسکرین پر ایک ایک منظر جو سحر بانو کے ساتھ تھا وہ سب کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ چکے تھے۔

”آپ جا رہے ہیں سرکار!...“ اللہ دین بہت غمزہ تھا، بہت رورہا تھا۔

”ہاں اللہ دین، اتنا ہی دانا پانا تھا اس شہر میں.... اللہ حافظ....“ زائر چوہان نے نظر اٹھا کے اوپر دیکھا جہاں کھڑکی میں پرشمرہ سی اداس سی اجیارہ کھڑی بس خاموشی سے دیکھ رہی تھی اور پھر وہ نظروں سے چند پل میں ہی اوجھل ہوتا چلا گیا۔

”اجیارہ....“

اجیارہ نے پیچھے پلٹ کر دیکھا جہاں اس کی زندگی، اس کی محبت کھڑی تھی۔ ابراش عسکری آگے بڑھا اور اجیارہ کو دیکھنے لگا۔ اس گلابی چہرے پر بہت اداسی تھی، مایوسی تھی جسے ابراش عسکری کو دور کرنی تھی۔ اپنی

محبت کے روشن دیپ ان بادامی آنکھوں میں جلانے تھے۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھاکے اس کو خود سے لگا لیا۔ اجیارہ نے آسودہ ہو کر اس کے وسیع و عریض سینے پر اپنا سر رکھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مگر دونوں کے دلوں میں زائر چوہاں عرف سحر بانو ہمیشہ زندہ رہے گا۔

☆.....☆

سید اذکار علوی اور اذکار حیات نے اسی بوسیدہ پرانے کمرے میں قدم رکھا۔ ذاکر حیات نے پرانے سے بٹن پر ہاتھ مارا تو کمرے میں پہلی کھڑکی روشنی سی جل اٹھی۔ اسی پرانی کھڑکی کی کرسی پر آج سہد وڑائچ مضبوط موٹی رسیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ ان چند دنوں میں اس کا اصلی ٹکڑہ چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ اس کی ساری خوبصورتی ایک بد صورت روپ میں بدل چکی تھی۔ اس کے دل کی خباثت اس کے اندر کی گندگی سب کچھ اس کے چہرے پر بہت نمایاں تھی۔ وہ اس قدر مکروہ اور بھیانک زدہ لگ رہا تھا کہ دیکھنے والا نہ صرف ڈر جائے بلکہ اس سہد وڑائچ کے وجود سے اس کے مکروہ چہرے سے گھن آئے، کراہیت محسوس کرے۔ اس کے مساموں سے ایک سب سا لیکوئیڈ سائلز نکلتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں کے ناخن اس قدر غلاظت زدہ تھے کہ محسوس تک نہیں ہوتا تھا۔ وہی خوبصورت چمکدار ناخن ہیں جن کو اس نے بہت فرصت میں چمکا ہوا اور ناخن ہی کیا، اس نے تو خود کو ان قدر میٹھیں کر کے رکھا تھا۔ پتہ نہیں لگتی ہی بات تو سرجری کروانی ہوتی تھی، جو خوراک، جو میڈیسن وہ لیتا تھا وہ یہاں ہونے کی وجہ سے جب نہیں ملی یہی حال ہوتا تھا۔

ذاکر حیات نے اپنے ہاتھ میں ہلی ہولی کھولتے ہوئے پانی کی پوری بوتل اس کے سر پر انڈیل دی۔ سہد وڑائچ ٹپ کے ہڑبڑاکے جاگا تھا۔ اپنے سامنے ان دونوں کو دیکھا تو جیسے خون میں ابال اٹھا تھا۔ ”یو باسٹرڈ! یو....“ اور اس سے پہلے کہ وہ دوسری موٹی گالی دیتا، سید اذکار علوی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گن کا بٹ اس کے سر پر مارا کہ خون کا فوارا پھوٹا تھا۔ ”دل تو شدت سے چاہ رہا ہے کہ تجھے چیر پھاڑ کے رکھ دوں۔ تیرا وہ حال کروں کہ موت کو بھی تجھ پر رحم نہ آئے مگر نہیں، میں تجھے اتنی آسان موت کیسے دے سکتا ہوں۔ میں تو تجھے اپنے ٹپ ٹپ کے مرنے کے لئے چھوڑوں گا کہ تو خود اپنی موت اپنی آنکھوں سے دیکھے گا اور لمحہ لمحہ ان محسوس نوعیت کی بھائی سی لڑکیوں کو یاد کرنا جنہیں تو نے میرے وطن سے جگہ جگہ سے اٹھایا ہے، ان کا بچپن ختم کر کے ان کو بھائی بنانے کے لئے چھوڑ دیا کہ وہ بے چاریاں تیرے جیسے درندے حیوانوں کا شکار بنی ہیں۔“ سید اذکار علوی نے نہایت غصے سے اس کو گھورا تھا۔

”دیکھ تو مجھے جانے دے۔ آج تک مجھے کسی نے نہیں پہچانا۔ مگر تیری عقل اور تیری ہمت کی داد دیتا ہوں کہ تو نے مجھے پکڑ لیا ورنہ کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت بھی نہیں کہ وہ میرا نام بھی لے سکے۔“ ”رسی جل گئی، بل نہیں گئے۔“ ذاکر حیات نے نفرت سے اس کو گھورا۔ ”فکر مت کریں ذاکر، ابھی کچھ ہی گھنٹوں میں سارے کس بل نکل جائیں گے۔“ ”تم لوگ بہت غلط کر رہے ہو۔ تم لوگ جاننے نہیں ہو کس سے ابھر رہے ہو، خان زئی تم کو چھوڑے گا نہیں۔“ دھمکی آمیز لہجہ تھا۔

”ایسا ہی کچھ اس عابد جوفا نے اس کرسی پر بیٹھ کے کہا۔ دیکھ لے وہ تو جنہم واصل ہو گیا، اب تیری باری ہے۔“

سہد وڑائچ نے چونک کر دیکھا تھا۔

”اس کا مطلب عابد جوفا کو تم لوگوں نے مارا ہے۔“ اس نے دونوں کو باری باری غصے سے گھورا۔

”یہ نیک کام ہمارے علاوہ اور کر ہی کون سکتا ہے۔“

”تو پھر یقیناً بریزے بھی تیرے ہی پاس ہوگی۔“ سہد وڑائچ نے سید اذکار علوی کو خون آشام نظروں سے دیکھا۔

”اپنی گندی اور ناپاک زبان سے میری بیوی کا نام بھی مت لینا۔“ اذکار علوی نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا کہ منہ اور ناک سے خون کی لکیر بہہ نکلی۔

”بیوی! یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف میری ہے۔ اس پر میرا حق ہے۔“ وہ کسی بھوکے شیر کی طرح جھڑکا جیسے شیر کے منہ سے اس کا شکار چھین لیا ہو۔

”وہ ایک سید زادی ہے اور سید زادی کا خون اتنا سستا نہیں کہ تو اس تک رسائی بھی حاصل کر سکے۔“

”یہ نہیں ہو سکتا، بیس سال تک میں نے اس کو سنبھال کر سات پردے میں چھپا کر رکھا۔ اس کے جسم پر ہوا تک لگنے نہیں دینی بیس سال کی عمر میں اس کو میرے پاس آنا تھا۔ وہ میرے پاس بھی رہتی تو سات پردوں میں چھپا کر رکھتا۔ میں اس کو.... تیرے بچانے اس کی ماں رطابہ کو مجھ سے چھینا تھا تو میں نے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آج تو نے بھی وہی کیا ہے مگر میں بریزے کو حاصل کر کے رہوں گا۔“

”جسٹ شٹ اپ... کہنا تیری مقدس اور پاک بیوی کا نام اپنی زبان سے مت لینا۔“ سید اذکار علوی نے ایک اور تھپڑ اس کے منہ پر جڑا۔

”تجھے ڈیفیکلٹ چیزیں پسند نہیں ہیں نا، چاہے وہ اڑی شے ہوں یا کوئی انسان۔ جیسی تو نے میرے پاک ملک سے ان معصوم چھوٹی چھوٹی بچیوں کی بیوپاری شروع کی مگر پھول گیا پر شے پر زوال ہے اور آج تجھ پر زوال ہے۔ ارے ذاکر، ذرا اس کو آئینہ دکھاؤ تاکہ پتہ چلے کہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اگر دل کمزور ہوگا تو یقیناً آپ ہی مر جائے گا۔“ ذاکر حیات نے اس کو آئینہ دکھایا۔

ہوش ہی ہو جاتا۔ یہ وہی سہد وڑائچ تھا جس کے چہرے پر معمولی سی رگہ داغ نہیں تھا۔ یہ وہ سہد وڑائچ تو نہیں جو حسن اور خوبصورتی میں یکتا تھا، جو دیکھنے میں بچپن میں کی طرح لگتا تھا مگر ان کچھ ہی دنوں میں اس کی صحیح عمر اس کے چہرے پر آگئی تھی۔ چہرے پر جھریاں، آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، جیسی جیسی آنکھیں، سوکھے ہونٹ، پہلی سی رنگت۔

”نہیں.... یم تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا کیا.... اور.... اور یہ میرے ہاتھوں سے کیا نکل رہا ہے۔“

سہد وڑائچ نے اور غور کیا تو اس کو اپنے پورے جسم سے کوئی کیوئیڈ سا وائٹ پانی جیسی چیز نکلتی محسوس ہوئی تھی۔

”تو جو دو انیاں کھاتا تھا، اپنی ہر چھ ماہ سال میں سرجری کراتا تھا نا، یہ سب اسی کا نتیجہ ہے۔ اب میں تجھ کو کیا سزا دوں۔ میرا اللہ ہی کا فی ہے تیرے لئے... وہ دیکھ جیسے جیسے شام کے سائے گھرے ہوتے چلے جائیں گے اس دروازے سے موڈی کیڑے کوڑے، چوہے تیری بدبو سونگھتے ہوئے آئیں گے اور دھیرے دھیرے تجھے نوچیں کھوٹیں گے.... تو روئے گا، نرپے گا، چٹے چلائے گا مگر کوئی تیری آواز سننے والا نہیں ہوگا۔ اپنی عبرت ناک دردناک موت تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ، جو جو گناہ تو نے کئے ہیں وہ سب

اب ہر دن خوبصورت

مکمل تحفظ مکمل تازگی



Butterfly
BREATHABLES

GIRL
TALK

f facebook.com/GirlTalkByButterfly

اس بند کمرے میں تجھے یاد آئیں گے۔ وہ ان معصوم بے بس لاچار لڑکیوں کی چیخیں، ان کا سسکنا، رونا، بڑبڑانا تیرے کان پھاڑیں گے.... وہ دیکھ....“ سید اذکار علوی کے اشارے پر سہد وڑائچ نے کونے میں ایک ڈھانچہ دیکھا جس پر کیڑے کوڑوں نے اپنا گھر بنالیا تھا۔
”وہ ازابیلا ہے۔“ سہد وڑائچ کی آنکھیں حیرت سے باہر آ گئیں۔
”سرجلیں رات ڈھلنے والی ہے۔“ ذاکر حیات نے کہا۔
”ہاں کیوں نہیں۔“

”نہیں، تم لوگ ایسے نہیں جاسکتے مجھے چھوڑ کے، کھولو مجھے۔“ سہد وڑائچ اندر تک کانپ کر رہ گیا۔ اس کا رواں رواں سنسناتا ہوا تھا مگر وہ دونوں بے حس بنے باہر نکل گئے اور وہ پیچھے سے چلاتا ہی رہ گیا۔ کچھ آوازیں آنے لگیں، سہد وڑائچ نے اس آواز کی جانب دیکھا تو اسی کھلے دروازے سے عجیب سے زہریلے کیڑے کوڑے ریگلتے اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ ہر طور کوشش کرنے لگا رسیاں کھولنے کی مگر نا کام.... خوف، ڈر سب اس کے اندر آجاتا تھا۔ اس کی نظر ازابیلا کے ڈھانچے پر پڑی تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ڈھانچہ اس کو گھور رہا ہے۔ ابھی پائیں آئے گا اور اپنی ہڈیوں میں اس کو جکڑ لے گا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔
”نہیں.... نہیں....“ اس کی چیخیں پورے صحرائیں گونج رہی تھیں۔
”آگے کیا پلان ہے؟“

”اذکار سر، میں تھک گیا ہوں، آزادہ مجھے شہنشاہ سے شادی کر کے اس کو باہر لے جاؤں گا کچھ عرصے۔“
ذاکر حیات نے جیب اشارت کر لی تھی۔
”یہ تو بہت نیکی کا کام کریں گے آپ۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔“ سید اذکار علوی اس کے فیصلے سے بہت خوش ہوا۔

”جی۔“ وہ ہولے سے مسکرایا۔
”اذکار سر، ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ خان زئی کون ہے؟“
”وہ بھی ان سب کا باپ ہی ہوگا مگر خیر بہارا ملک فی الحال کچھ سالوں تک یہ پرانے رپ، کڑیپ، انسانی اعضا کی فروخت، ڈرگزر اسمگلنگ یہ سب سے محفوظ رہے گا۔ مگر جب پھر بڑھا تو ہم پر کسے ایکشن لے لیں گے۔ اپنے ملک پر کسی کی گندی نظر نہیں پڑنے دیں گے۔“
”بالکل سزا کار۔“ اس نے اسٹیننگ گھمایا۔
”آپ بتا رہے تھے کوئی شیخ انوار اپنی بیٹی کے لئے خوب ہلا چارہا ہے۔“
”طلسم ناز اس کا کچھ اتنا پتا نہیں ہے۔“

”تو اس کا مطلب ہے جہاں طلسم ناز، وہیں خان زئی.... چہ.... دیکھتے ہیں مگر ابھی تو میں خود بھی بہت تھک گیا ہوں، آرام کرنے کی غرض سے بریزے کو لے کر باہر جاؤں گا۔“ اس کی آنکھوں میں بریزے کا خوبصورت چہرہ ابھرا۔

دونوں ہولے سے مسکرا دیئے۔ جیب صبح ہونے سے پہلے اپنی منزل تک کی جانب رواں دواں تھی۔ ذاکر حیات بہت فاسٹ ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ٹائز پیچھے سے مٹی دھول اڑاتے جا رہے تھے۔

.....☆ ختم شد ☆.....



”آپا جانی! میں بازار جا رہی ہوں اگر کوئی کام ہے تو بتا دیجیے۔“ تہینہ بیگم نے اپنی بڑی بہن اور رشتے میں لگنے والی جھانی رو بینہ بیگم سے کہا۔
 ”کام..... ہاں یاد آیا، تمہارے بھائی صاحب کے سوٹ ڈرائی کلین ہونے گئے تھے وہ لیتی آنا۔“ رو بینہ بیگم نے کہا اور اٹھ کر دروازے سے سید نکال تہینہ کو تھما دی۔

محمود حسن، ریاض حسن اور احمد حسن تینوں بھائی تھے اور ان تینوں سے بڑی ان کی بہن تھیں، جنہیں سب منیبہ آپا کہتے تھے۔ بھائیوں میں سب سے بڑے محمود حسن، پختلے ریاض حسن اور سب سے چھوٹے احمد حسن تھے۔ محمود حسن اور ریاض کی شادیاں خالیزاد اور پچازاد بہنوں رو بینہ اور تہینہ سے ہوئی تھیں جب کہ احمد حسن نے اپنی مرضی سے شادی خاندان سے باہر کی تھی۔ ان کی بیگم نورین بھی کافی سنبھلی ہوئی خاتون تھیں۔ تینوں بھائی ایک ساتھ ہزار گزرتے پر محیط جنگل میں رہائش پذیر تھے۔ محمود حسن کے دو بچے تھے۔ شاہ زیب اور بیٹی شہلا، پختلے بھائی ریاض حسن کے تین بچے تھے۔ اقرار، احمر اور ارسل جب کہ احمد حسن کی صرف ایک ہی اولاد تھی ان کی لاڈلی عنادل۔ شہلا کی شادی اس کے چچا ریاض حسن کے بیٹے اقرار سے ہو چکی تھی۔ جب کہ شاہ زیب سی ایس ایس کر کے سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ جو ان کرتے ہی اس کی پوسٹنگ اسلام آباد ہو گئی تھی۔ عنادل، احمر اور ارسل

عنادل تہار کی سوتیلی والدہ

مکمل ناول

ایس حبیب خان

اے لیونز کے اسٹوڈنٹس تھے۔ جب کہ منیبہ آپا راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے بھائی کے گھر آنے کے بجائے شوہر کے گھر رہنے کو ترجیح دی، کیونکہ اس گھر میں ان کے شوہر کی قبر بھی تھی۔

تہینہ بازار سے آکر منیبہ پر دم دراز ہو گئیں۔

”کیا ہوا بھائی؟“ نورین بیگم نے انہیں اس طرح دیکھ کر سوال کیا۔

”بھئی! خدا کی بناء اتنی گرمی تھی کہ میں نے کپڑے بدلے اور دھوئے لگا۔“

”اچھا آپ اپنے کمرے میں جائیں میں آپ کے لیے جوس بھجواتی ہوں۔“ نورین نے کہا۔

”اچھا آپ جاتے ہوئے ذرا یہ آپا کو دے دیں گی۔“ انہوں نے پینگ ہوئے سوٹ نورین کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں بھائی!“ نورین بیگم نے سوٹ لیتے ہوئے کہا۔ پھر ان بیگم نے رو بینہ آپا کے کپڑے ان کے حوالے کر دیئے۔

”نورین! یہ عنادل کہاں ہے؟ نظر نہیں آئی کافی دیر سے؟“ رو بینہ بیگم نے سوال کیا۔

”بھابی! ہوئی کہاں، کہیں بندر بنی دھا چو کڑی پچا رہی ہوگی۔“ نورین بیگم بولیں۔ ”نورین بیگم مسکرائیں۔“

”اے بھائی کونون کرنے میں تو تمہارے ہاتھوں میں مہندی لگ جاتی ہے، دوستوں سے گئیں مارتے نہیں تھکتیں۔ سچی کہوں گھر کا اتنا لمبا ل کیوں آتا ہے؟ تو وہ تم ہو۔“ شاہ زیب نے اس کے بال بھی بچھپے۔

”نانی امی! دیکھیں ناں بھائی کو۔“ ارسلہ کا بس نہ چلا تو اس نے روبینہ بیگم کی حمایت سیٹی۔

”شاہ زیب بیٹا! بری بات ہے کیوں ستار ہے ہو بہن کو۔“ انہوں نے مصنوعی غصے سے مکرراتے ہوئے کہا تو شاہ زیب نے سچ کر ارسلہ کو گلے سے لگالیا۔

”میری پیاری گڑیا! اور ارسلہ نے بھی اس کے گرد بانہیں لپیٹ لیں سب کو شاہ زیب کے اچانک آ جانے کی خبر ملی تو سب آگے مکر عنادل اپنے کمرے میں ہی رہی۔ کھانا لگ گیا ان کی ملازمہ انابی بلائے آئیں تو عنادل نے آنے سے صاف منع کر دیا اور بولی۔

”اس وقت اگر زلزلہ بھی آجائے تو میں یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔ آپ ایسا کریں میرا کھانا یہیں لے آئیے۔“ سب کھانے کی طرز پر بیٹھے تھے مگر شاہ زیب کی نگاہیں اس حسین پیکر کی متلاشی تھیں مگر انابی نے آ کر اس کے ارمانوں پر اس ڈال دی۔

”عنادل بیٹا نے کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوایا ہے۔“

”اوہ شٹ! احمر نے زور سے کہا۔

”احمر! محمود حسن نے اسے تنبیہ کی۔

”سوری! بڑے ابو آج فٹ بال ورلڈ کپ فائنل ہے۔“

”تو بیٹھے کیوں ہو یہاں جاؤ۔“ ارسلہ نے جل کر کہا۔

”اف یو گائز ڈونٹ مائنڈ میں عنادل کے ساتھ کھانا کھا لوں؟“ احمر نے بڑوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کوئی بات نہیں بیٹا جاؤ۔“ احمد حسن نے بولا۔ تو احمر جلدی سے اٹھ گیا۔

”انابی میرا کھانا بھی وہیں لے آئیے گا پلیز۔“ اور عنادل کے روم کی طرف چلا گیا۔

”عنادل! کیسی“ کا بیچ چھوڑ دے امپائل۔“ ارسلہ نے کہا اور نوالہ منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔ شاہ زیب کا موڈ آف ہو گیا۔

”اتنے سالوں بعد آیا ہوں اور محترمہ کو ملنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔“ وہ سوچتے ہوئے چچھے سے چاولوں کو پلیٹ میں ادھر ادھر کر رہا تھا۔

”بیٹا کھانا پسند نہیں آیا؟“ رباح حسن نے پوچھا۔

”نہیں چچا جان۔ وہ بس بھوک نہیں ہے جھکن ہو رہی ہے۔“ شاہ زیب نے کہا اور دو چار لقمے لے کر اپنے کمرے میں لائٹ آف کر کے سو گیا۔

☆.....☆

ناشتے کی میز پر سب آگئے تھے۔ سب سے آخر میں وہ آئی۔ ٹائٹ ٹراؤز اور ٹی شرٹ میں وہ بھی بغیر دوپٹے کے چھوٹے چھوٹے بال وہ میز پر آ کر دھپ سر رکھ کر اونگھنے لگی۔ شاہ زیب دھک سے رہ گیا۔ اس نے جو تصور میں اپنی محبت کے سر پرے کو تراشا تھا وہ کاغذ پر لگنے والی کاری ضرب کی مانند چھنا کے سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔

”یہ عنادل ہے؟ وہ ہی جس سے میں نے پیار کیا تھا؟“

”کب سوئے تم دونوں؟“ تبینہ تانی نے پوچھا۔

”ساڑھے چار بج گئے تھے۔ منچ کے بعد ایوارڈ سیر منی بھی تھی نا۔“ عنادل نے جو جھل انداز سے کہا۔ شاہ زیب کی نگاہیں اسی کا طواف کر رہی تھیں۔

”لگتا ہے اس منچ میں سیسی کوئی گول نہ کر سکا۔ کیوں عنادل؟“ محمود حسن نے عنادل کی نیند بھگانے کے لیے کہا۔

”بڑے ابو! اس امپاسیل۔“ عنادل کو ایک دم کرنٹ لگا ہوا نو۔

”اب ہوئی ہے میرے بیٹے کی مارنگ۔“ محمود حسن نے عنادل کو چھیڑا تو وہ مسکرانے لگی اور اس کے سبب جیسے گالوں میں ہنصور پڑ گئے۔ شاہ زیب لہجہ بھر کو اس کی مسکراہٹ میں کھو گیا۔

”بیٹا شاہ زیب! تم ناشتہ شروع کرو، رات بھی تم نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔“ روبینہ بیگم نے اس کی پلیٹ میں پراٹھا رکھتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز پر بھی عنادل شاہ زیب کو ٹوٹی انگور کر کے اپنی پلیٹ میں سے آلیٹ کاٹنے سے اٹھا کر منہ میں رکھنے لگی۔

شاہ زیب سب کے لیے اس کا اٹھا کر اس نے عنادل کو کچھ نہ دیا۔

”بھائی آپ عنادل کے لیے کچھ لائے؟“ ارسلہ نے پوچھا۔

”سوری ڈیر! مجھے اندازہ نہیں تھا اس کی کیوں والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس لیے ان کو میرا گفٹ بیکار لگے گا سو میں نے نہیں دیا۔“ شاہ زیب نے سچ کہا۔

”تو ٹھیکس! میں ہر کسی سے چیز لینا پسند نہیں کرتی۔“

عنادل نے منہ تو ذکر شاہ زیب کو جواب دیا اتنے میں عنادل کا موبائل بجایا۔

”ہاں! حارث شام کو چل رہے ہوں نا۔“ عنادل بات کرتی رہا۔

تاثرات دیکھنے کی بھی زحمت نہ کی۔

”ارسلہ! یہ حارث کون ہے؟“ شاہ زیب نے پوچھا۔

”بھائی! عنادل کا کلاس فیلو ہے۔“ ارسلہ نے کہا اور چلی گئی شاہ زیب غصے سے انکھال بچھنے لگا۔

”عنادل! لوائی نے بھیجے ہیں۔“ ارسلہ نے فرنیچ فرائز اور سوفٹ ڈرنک میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

کرسی پر نیچی ہو کر بیٹھی ہوئی تھی اور اس نے اپنی دونوں ٹانگیں میز پر رکھیں ہوئی تھیں۔ ٹائٹ جینز میں اس کے وائر نما بیاں ہو رہے تھے۔ سامنے سے آتی شہلا کو عنادل کا انداز بالکل اچھا نہیں لگا۔ وہ ارسلہ اور عنادل کے پاس آگئی۔

عنادل نے وہیں سے جھک کر پلیٹ اٹھائی اور گود میں رکھ کر فرنیچ فرائز کھانے لگی۔

”بھئی بچن کی شکل بھی دیکھ لیا کرو عنادل۔“ شہلانے کہا۔

”مجھ سے نہیں ہوتے یہ لڑکیوں والے کام۔“ عنادل نے گلاس میں سے سپ لیتے ہوئے کہا۔

”شادی کے بعد اگر میاں کے ساتھ اکیلے گھر میں رہنا پڑ گیا تو کیا کھلاؤ گی اے آپ کو اور اپنے میاں کو؟“

شہلانے یہ بات کچھ اس انداز سے کہی کہ عنادل کو ابھن ہونے لگی اس نے گردن جھٹکی اور پینڈ فری لگا کر موبائل میں گم ہو گئی۔

☆.....☆

”عنادل! بٹھو!“ نورین بیگم نے اس کے کمرے میں آ کر کہا جہاں عنادل کھڑی اسکرین پر چینل چینج کر رہی تھی۔

”جی کہیں امی! میں سن رہی ہوں۔“ عنادل کی نگاہیں اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جہاں اب میوزک چینل پر راک شوا گلیا تھا۔ نورین بیگم نے اٹھ کر اسے آف کر دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لے آئیں۔

”عنادل! اپنے جینے کے ڈھنگ بدلو اور لڑکیوں والا انداز طور طریقے اپناؤ۔“ نورین بیگم بولیں۔

”بس امی! کیا پھر کوئی شادی کی تقریب آ رہی ہے؟“ عنادل نے لا پرواہی سے کہا۔

”بھائی! شاہ زیب کی آنکھ کھلی تو شہلا چونک گئی۔ اس کی آنکھیں انکارے کی طرح دھک رہی تھیں۔

”بھائی آپ نے کھانا نہیں کھایا یہ دودھ پی لیں۔“ اس نے کہا۔

”رکھ دو! ابھی میرا دل نہیں چاہ رہا ہے۔“ شاہ زیب بولا۔

”اجی ٹینشن؟“ شہلا نے پوچھا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اچھا ایک بات بتاؤ شہلا! عنادل کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟“

عنادل نے کوریڈور سے گزرتے ہوئے شاہ زیب کے منہ سے اپنا نام سنا تو اس کے قدم رک گئے۔

”کیا مطلب بھائی! اچھی ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”میرا مطلب اس کی حرکتوں سے ہے۔ اٹھنے بیٹھنے، سینے اوڑھنے کی تمیز، گھر میں اتنے بڑے اور لڑکے موجود ہیں میڈم کو اتنی شرم نہیں کہ دوپٹہ ہی لے لیں، لڑکوں سے دوستی اور ہاتھ پائی، شاید اسے کسی نے احساس نہیں دلایا کہ وہ لڑکی ہے اور ان کی کچھ لمٹ ہوتی ہیں۔“ شاہ زیب کے الفاظ اسے تیر کی طرح چھلنی کر رہے تھے۔

”بھائی عنادل، بچپن سے ہی ایسی ہی زندگی گزار رہی ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”تو گھر کے بڑوں نے کیا آنکھیں بند کر لیں ہیں؟ صحیح غلط کی تفریق کو بھول گئے ہیں؟“ اس کے سوالوں کا شہلا کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ یہ واقعی ان لوگوں کی لا پرواہی بلکہ غلطی کہا جائے تو بجا نہ ہوگا، جی۔

”گھر کے بڑوں نے تو اہم ہے اسے میرے پلے باندھنے کا فیصلہ کر لیا مگر میرے بارے میں سوچا۔ امی بابا کو میری زندگی کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میں لوگوں میں اپنی بیوی کو کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ جب میری بیوی روڈ پر لڑکوں کی طرح دوستوں سے جھگڑنے سے بچنے والی کرے گی، بغیر دوپٹے کے پھرے گی۔“ شاہ زیب لاوے کی طرح اہل پڑا۔

”بھائی! میری بات تو سنیں۔“ شہلا بولی۔

”تم میری بات سنو معاف کرنا شہلا مگر عنادل میں لڑکیوں والی باتیں کوئی بات نہیں جس کی بنا پر میں اس سے شادی کروں۔ نہ شرم و حیا، نہ سلیقہ اور نہ رک رکھاؤ۔ کچھ بھی تو نہیں ہے جس سے امی بابا سے ابھی بات کر کے میں ان کا دل نہیں توڑنا چاہتا مگر تم تو میری بہن ہو ناں اس لیے تمہیں اپنے آپ کو اس سے آزاد نہ لے۔“

”شہلا! مجھے عنادل سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”انفیکٹ! مجھے تو کیا کسی بھی ذی ہوش مرد کو اس سے شادی کرنے میں کوئی چارم نہیں ہوگا۔ تم ابھی امی بابا سے کچھ مت کہنا۔ مجھے اور ان کو وقت چاہیے۔

”میں اپنی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ ایسے نہیں کر سکتا۔“ شاہ زیب نے سنجیدگی سے کہا۔ عنادل فوراً تیز قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آگئی اور وہم سے بستر پر چرت گرتی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ شاہ زیب کا منہ نوج لے۔

”ابھی انسٹ..... مسٹر شاہ زیب تم کیا منع کرو گے۔ میں تمہیں رنجش کرتی ہوں تم سے شادی کرتی ہے میری جوتی۔“ عنادل نے غصے سے کہا اور ہیڈ فونز لگا کر میوزک کا والیوم فل کر لیا۔ شہلا کے جانے کے بعد شاہ زیب سیدھا لیٹ کر چھت کو گھورنے لگا۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

”عنادل! تمہیں اپنی زندگی میں شامل نہ کرنے کا فیصلہ میرے لیے کیا ہے یہ صرف اور صرف میرا دل جانتا

ہاں! اور اس بار تقریب ہوگی تمہاری شادی کی۔“

نورین بیگم نے کہا تو عنادل اچھل پڑی۔

”آریوان پور سنیں؟“ وہ بے اختیار بولی۔

”عنادل! اپنی حد میں رہو۔“ نورین بیگم بھڑک گئیں۔

”نہیں! مجھے آپ سے بتائیں کہ جب آپ کو معلوم ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی تو پھر آپ یہ بات کیوں کر رہی ہیں؟“ عنادل نے دونوں الفاظ میں کہا۔

”یہ فیصلہ آج نہیں برسوں پہلے ہو چکا ہے۔ ہم بڑوں نے بچپن میں ہی تمہارا اور شاہ زیب کا رشتہ طے کر دیا تھا۔“ نورین بیگم نے بتایا۔

”اوہ کم آن امی! پہلی بات کہ میں شادی نہیں کروں گی اور دوسری اس سٹرل شاہ زیب سے تو کسی صورت نہیں۔“ عنادل نے صاف کہا۔

”بس بہت ہوگی تمہاری من مانی! بلو اپنے انداز کو۔“ نورین بیگم نے کہا اور روم سے چلی گئیں۔ عنادل نے زور سے ریوٹ کو صوفے پر چھینک دیا اس کا پارہ ہانکی ہو گیا تھا۔

”شاہ زیب! تم ہوتے کون ہو میری زندگی کے مالک بننے والے؟ یہ میری زندگی ہے صرف میری۔“ عنادل غصے سے بڑبڑائی۔

”مجھے عنادل سے بات کرنی چاہیے۔ آخر کو وہ میری محبت ہے۔“ شاہ زیب نے سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں سیڑھیاں اتر کر اس سے بات کرنے آئے لگا مگر سیڑھیاں اترتے اس کے قدم اچانک رک گئے۔ سیڑھیوں سے نیچے زمین پر اصر گر اہوا تھا اور عنادل اس کے سینے پر چڑھ کر کھڑی ہوئی۔ اس پر اسے برسا رہی تھی۔ اس نے جینز اور واٹس ہاف سلیوڈ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور کالر کے مٹن کھلے ہوئے تھے اور اصر اپنے بچاؤ میں اس کے ہاتھ پکڑ رہا تھا۔ شاہ زیب کا پر یہ منظر دیکھ کر کھول اٹھا وہ زور سے دھاڑا۔

”احمر! یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”بھائی وہ.....“ احمر نے بولنا چاہا۔

”یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ آپ کو مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

عنادل نے ہانپتے ہوئے کہا اس کے گال دھک رہے تھے۔ شاہ زیب بے چارہ بیٹھا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آیا اور دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔

”جب اسے مجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے تو پھر میں کیوں پائل ہو جا جا رہا ہوں اس کے پیچھے۔ ضرور اسے کوئی اور پسند ہے جیسی تو وہ اس لیے مجھے نظر انداز کر رہی ہے۔“ شاہ زیب نے خود سے کہا۔ شاہ زیب نے سر درد کا بہانہ کر کے کھانے سے منع کر دیا وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد شہلا دودھ کا گلاس لے کر آگئی۔ اس نے شاہ زیب کو آواز لگائی۔

ہے۔ تم نے میرے لیے کوئی آپشن ہی کب چھوڑا ہے۔ میں نے تمہارے بارے میں کیا کچھ نہیں سوچا تھا اور تم کیا نکلیں۔“ آنسوؤں کے قطرے شاہ زیب کی آنکھوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہو گئے اور اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔

☆.....☆

”یار پکنک کا پروگرام بنا تو لیا ہے مگر اجازت کون لے گا۔ پتا ہے ناں تھوڑے دن میں ایگزامز شروع ہو رہے ہیں۔“ احمر نے پاستہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا جو اس نے تھوڑی ہی دیر پہلے آرڈر کیا تھا۔

”اپنا کینیڈن لے گا اور کون لے گا؟“ ارسلہ نے عنادل کی کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا جو کہ پاستہ کھانے میں مصروف تھی۔

”ارے یہ بھی کوئی ٹینشن کی بات ہے جو مزہ کر کر کر رہے ہو مم۔ مم مم مم می۔“ عنادل نے ڈرنک کاسپ لیا اور دوبارہ پاستہ سے انصاف کرتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے۔“ احمر نے کہا۔

”منظور ہے تم کون سی ٹائم دیکھو میں دس منٹ میں اجازت لے کر آتی ہوں۔“ عنادل نے احمر سے کہا تو اس نے گھڑی کی طرف لگا ہوا کچن ٹیمپلر میں بندھے ہوئے تھوڑے منٹ تھے۔ عنادل محمود حسن کے کمرے میں گئی اور بولی۔

”جی میرا بچہ۔“ بڑے ابو نے کتاب کا غلاف اٹھاتے ہوئے کہا وہ ایزی چیئر پر بیٹھے مطالعے میں مصروف تھے۔

”بڑے ابو مجھے بہت بوریت ہو رہی ہے تو میں نے سوچا کیوں ناں ہم سب پکنک پر چلیں۔“ اس نے نیچے جھک کر لاڈ سے انہیں محمود حسن کے گلے میں ڈال کر لپکا۔

”مگر بیٹا کچھ دن میں تو ایگزامز شروع ہو رہے ہیں ناں تم لوگوں کے؟“ انہوں نے کہا۔

”ہم پڑھ پڑھ کر تھک گئے ہیں۔ بڑے ابو تھوڑا فریش ہو جائیں گے۔“ عنادل نے کہا۔

”ٹھیک بابا، جیسے میری گڑیا کی خوشی۔“ انہوں نے پیار سے عنادل کے ماتھے پر ہاتھ پڑھتے ہوئے کہا۔

”دھیانکس بڑے ابو! پورا روری بیٹ۔“ عنادل نے اچھلتے ہوئے کہا اور کمرے سے دوڑ لگا دی۔

”ارے بیٹا! ایسی بھی کیا جلدی ہے آرام سے۔“ محمود حسن نے جانی ہوئی عنادل سے کہا۔

”اس اے چیخ بڑے ابو۔“ اس نے جاتے ہوئے زور سے کہا اور دوڑ کر بیڑھیاں اترنے لگی۔ محمود حسن اس کے جانے کے بعد مسکرانے لگے۔ وہ عنادل کو بے حد جانتے تھے۔ شاید اپنی بیٹی شہلا سے بھی زیادہ بیڑھیاں اترتی عنادل زور سے کسی سے ٹکرائی اور اس سے پہلے لڑکھاتی تو اسے کسی نے تھام لیا عنادل نے جو نظریں اٹھا میں تو وہ شاہ زیب تھا۔ چند لمحے تو وہ ساکت رہی پھر منہ جھل کر غصے سے بولی۔

”کیا نظر کمزور ہے جو دکھائی نہیں دے رہا۔“

”آنکھوں کے علاج کی ضرورت تو تمہیں ہے جو سامنے سے میں نہیں تو اتنا بڑا باکس بھی نظر نہیں آیا۔“ شاہ زیب کے ہاتھوں میں بڑا سا بکس تھا جو وہ اسٹور روم سے لا رہا تھا۔

”میں تو جلدی میں ہوں آپ ہی دیکھنے کی زحمت کر لیتے۔“ عنادل نے غراتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا آپ کی فلائٹ کس ہو رہی ہے جو جلدی میں تھیں آپ؟“ شاہ زیب نے فٹ سے کہا۔ عنادل چاہتی تو تھنوں کیا دنوں کے حساب سے بحث کر سکتی تھی مگر فی الحال اسے جلدی تھی اس نے شاہ زیب کو ایک

طرف دھکیلا اور نیچے دوڑ لگا دی۔ جب وہ احمر کے پاس پہنچی تو گھڑی میں ڈیڑھ منٹ باقی تھا۔

”مان گئے پاس۔“ احمر نے کہا تو عنادل کل کھلا ٹرینس دی اور اس کے گالوں میں حسین بھنور پڑ گئے۔

☆.....☆

پکنک پر جانے کے لیے سب گاڑی میں بیٹھے عنادل کا انتظار کر رہے تھے۔ عنادل باہر آئی تو شاہ زیب چونک گیا ریڈی ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں ملیوس اس نے سنہری بالوں کو بالکل سمیٹ لیا تھا اور سن گلاسز لگائے وہ دھوپ میں الگ ہی چمک رہی تھی۔ عنادل گاڑی میں آنے کے بجائے روڈ پر کھڑی ہوئی تھی۔ اتنے میں سامنے سے ایک سفید کار آگئی اور اس میں سے دوڑ کے اور ایک لڑکی اتری۔ ان لوگوں کو دیکھ کر عنادل مسکرائی۔

”اتنی دیر لگا دی یار!“ وہ لہراتے ہوئے بولی۔

”آجاؤ بچو! دیر ہو رہی ہے۔“ ریاض حسن نے آواز لگائی تو وہ سب گاڑی میں چڑھ گئے۔ شاہ زیب کے برابر والی سیٹ خالی تھی عنادل کے دوست سہیل اور سارہ بیٹھ گئے اور حادثہ احمر کے ساتھ بیٹھ گیا۔ عنادل نے شاہ زیب کے پاس جا کر بیٹھ لیا۔

”احمر اٹھو! حادثہ کے ساتھ میں بیٹھوں گی۔“ احمر، شاہ زیب کے برابر آکر بیٹھ گیا اور عنادل حادثہ کے برابر میں جا کر بیٹھ گئی۔ شاہ زیب کا موڈ آف ہو گیا۔ اس نے محمود حسن سے کہا جو کہ اس کے آگے بیٹھے ہوئے تھے۔

”بابا! یہ فیملی پکنک ہے یا کالج پکنک۔“ تو انہوں نے جانتے ہوئے کہا۔

”ارے یہ تو اپنے ہی بچے ہیں۔“ گاڑی میں میوزک چل رہا تھا اور پیچھے سے چاروں کے تھقبے سنائی دے رہے تھے۔ عنادل جان بوجھ کر شاہ زیب کو تیار رہی تھی اور وہ سب بیٹھے ہوئی تھی کیوں کہ شاہ زیب کو عنادل کا اس طرح کا طرز عمل ہرٹ کر رہا تھا۔ گاڑی رکی اور سب اتر گئے۔ محمود حسن نے ہٹ تھا جہاں انہوں نے سارا سامان رکھ دیا تھا۔ خواتین نے جاتے ہی نوڈ کارز سنبھال لیا تھا۔ محمود حسن کے کپ شپ شروع کر دی جب کہ نو جوان پانی میں چلے گئے۔ شاہ زیب حسن ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس کا پیٹ مندر میں اٹھتی لہروں میں گم تھیں جو چمکتی ہوئی آکر ساحل کو چھو لیتیں پھر مانو انہیں نے فراری میں قرار دیا۔ ان کے اندر جو طوفان برپا تھا وہ کیسے قابو آتا ایسا کون سا بند تھا جو ان طوفانی لہروں کو باندھ دیتا اس کا جواب وہ خود شاہ زیب کے پاس بھی نہ تھا۔ دوپہر ہو گئی تھینہ بیگم نے آواز لگائی مگر سب پانی میں مستیوں میں لگے ہوئے تھے۔ پھر انہیں شاہ زیب نظر آیا۔

”شاہ زیب!“

”جی چھوٹی امی۔“ شاہ زیب انہیں بچپن سے ہی چچی کے بجائے چھوٹی امی کہتا تھا۔

”بیٹا! میں نے کھانا لگا دیا ہے سب کو لے آؤ۔“ انہوں نے کہا تو شاہ زیب وہاں سے اٹھ کر سب کی طرف چل دیا جہاں وہ سب مستیاں کر رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک دم شاہ زیب کے قدم رک گئے سامنے کا منظر دیکھ کر اس کے جسم میں خون کی رفتار گنا بڑھ گئی۔ وہ ایک دم غصے میں آ گیا۔

عنادل جھکی ہوئی تھی اور جب کہ حادثہ نے اسے پیچھے سے جکڑا ہوا تھا۔ عنادل تھقبے لگا رہی تھی۔ شاہ زیب نے ایک دم پیٹھ موڑ لی۔

”شاہ زیب بھائی آئیے نا آپ بھی۔“ اسے اپنے دائیں طرف سے احمر کی آواز آئی۔

”نہیں مجھے بھیگنا پسند نہیں ہے۔ اپنی ویز، چھوٹی امی نے کھانا لگا دیا ہے تم سب کو لے کر آ جاؤ۔“ شاہ زیب اتنا کہہ کر وہاں سے چلا گیا اور دسترخوان پر آ گیا پیچھے ہی سب شور مچاتے آ گئے۔

”امی میں بس دس منٹ میں آئی۔“ عنادل نے کہا اور چلی گئی۔ سب بیٹھ گئے اور کھانا نکالنے لگے۔ عنادل اندر سے آئی تو اس نے کپڑے چھینچ کر لیے تھے۔ بے بی پنک کلر کی شرٹ پہنے دھوپ میں تھے اس کے رخسار دھک رہے تھے جب کہ ہونٹ سرخ گلاب کی پنکویوں کی مانند ہو گئے تھے۔ شاہ زیب کی نگاہیں عنادل پر آ کر واپسی کا راستہ بھول گئی تھیں۔

”امی! میرا بیڑا؟“ عنادل نے بے تابی سے پوچھا۔

”ارے بھئی یہ لو، یہ رہا تمہارا بیڑا۔“ نورین بیگم نے اسے پیزا دیتے ہوئے کہا۔ شہلا کی نگاہوں نے شاہ زیب کے جذبات کو بھانپ لیا۔ کھانے کے بعد نوجوان گیسر کھیلنے لگے۔ شاہ زیب چائے کا گپ لیے چیئر پر بیٹھ گیا۔ شہلا اس کے پاس آئی۔

”بھائی!“

”ہوں۔“ شاہ زیب کی نگاہیں دلدار کی دلدل سے باہر آ گیا۔

”آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟“ شہلا نے سوال کیا۔

”ارے بھئی چائے پی رہا ہوں اور کھانا کھا رہا ہوں؟“ شاہ زیب نے کہا۔

”میں عنادل کی بات کر رہی ہوں۔ کیوں کہ عنادل اپنے آپ سے دور کر رہے ہیں۔ جب کہ میں جانتی ہوں کہ آپ اسے کتنا چاہتے ہیں۔“ شہلا بولی۔

شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

”کوئی جانے یا نہ جانے مگر مجھے معلوم ہے کہ عنادل آپ کی پیچھے کی بات ہے۔“ شہلا نے کہا تو شاہ زیب نے نہ ایک گہری سانس لی پھر بولا۔

”محبت..... یکطرفہ محبت کچھ نہیں ہوتی۔ عنادل کے دل میں میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں اس کے معیار کا نہیں ہوں اور نہ ہی وہ میرے معیار پر اترتی ہے، میری پیچن کی محبت کا سراپا جو میرے سر پر لٹک رہا تھا اسے عنادل نے چکنا چور کر دیا ہے۔“

”وہ دیکھو سائے۔“ شاہ زیب نے ہاتھ سمندر کی طرف کرتے ہوئے کہا جہاں عنادل کی کیلی حارث کے ساتھ پانی میں چل رہی تھی۔ شہلا بھیپ کر شرمندہ ہو گئی۔

”شہلا! مجھے تو حیرت ہے کہ سب گھر والوں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ میری بات تو ہٹا دو، لاڈ پیا راہی جگہ مگر عنادل نے ساری مٹس کراس کر لی ہیں۔“

”آئی ایم سوری ٹو سے ایسی بے ہودگی کی میری زندگی میں کوئی گھٹنا نہیں ہے۔“ شاہ زیب نے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔ شہلا چپ کی چپ رہ گئی۔ پھر سب لوگ گھر لوٹ گئے رات گئے شاہ زیب نے اپنے والدین سے کہا۔

”امی، بابا! مجھے صبح ہی نکلنا ہوگا۔“ شاہ زیب نے محمود حسن اور روبینہ بیگم سے کہا۔

”ہوں بیٹا ابھی تو آئے ہو۔“ محمود حسن بولے۔

”بابا! اس راتیں ارجنٹ۔“ شاہ زیب نے کہا اور اگلی صبح کی فلائٹ سے چلا گیا۔ شہلا حقیقت سے واقف تھی

مگر شاہ زیب نے اسے منع کیا تھا اس لیے وہ وقتی طور پر تو خاموش ہو گئی مگر اس کے اندر لاوا پک رہا تھا۔

☆.....☆

شہلا چائے کی ٹرے لے کر امی بابا کے کمرے میں لے کر گئی تو دونوں بیڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ شہلا نے سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھی اور بولی۔

”چائے نور اناؤں یا تھوڑی دیر میں پیئیں گے؟“

”بیٹا نادو۔“ روبینہ بیگم نے کہا تو شہلا نے پاٹ سے چائے کپ میں نکالنے لگی۔

”بیگم! اگر شاہ زیب کو جانا نہیں ہوتا تو میں نے ایک تقریب میں ان دونوں کے رشتے کے بارے میں سب خاندان والوں کو بتانے کا پروگرام بنایا تھا۔“ شہلا نے چائے کے کپ دونوں کی طرف بڑھائے۔

”میں تو جلد عنادل کو بہو بنانے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“ روبینہ بیگم نے کہا۔ شہلا نے موقع بہتر جان کر شاہ زیب کے دل کی آواز ماں باپ تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا۔

”امی، بابا! مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ شہلا نے کہا۔

”ہاں بولو بیٹا!“ محمود حسن، شہلا کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”مجھے عنادل اور شاہ زیب بھائی کے رشتے کے بارے میں بات کرنی ہے۔ بابا آپ لوگوں نے عنادل کو بھائی کی زندگی کا حصہ بنانے کا فیصلہ تو کر لیا ہے مگر آپ نے بھائی کے بارے میں سوچا ہے کہ ان کی کیا مرضی ہے؟“ شہلا نے بات شروع کی۔

”کیا مطلب ہے تمہارے؟“ شاہ زیب نے بات کر چکے ہیں۔ انھیں ایک اگر اسے جلدی نہ جانا پڑتا تو ہم رسم کر لیتے۔“ روبینہ بیگم بولیں۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ میں آپ لوگوں سے کیا کہوں۔“ شہلا جھنجھلا کر بولی۔

”بیٹا! کھل کر کہو، ہم سن رہے ہیں۔“ محمود حسن نے چپ بازو میں رکھتے ہوئے کہا۔

”بابا! شاہ زیب بھائی نے رضا مندی جب ظاہر کی تو میں نے اس کا اشارہ لے لیا۔“ شہلا نے کہا۔

”بعد تو وہ سکتے میں آ گئے تھے۔“ روبینہ بیگم نے کچھ کہنا چاہا تو محمود حسن نے اسے روک دیا۔

”بابا! آپ لوگوں نے تو اپنی آنکھیں بند کر لیں ہیں۔ حرکتیں دیکھی ہیں۔“ شہلا نے عنادل کی؟ اور پلیز اب مجھے اس کے پیچھے کی دہائی میت دیجئے گا۔ کیونکہ جس لڑکی کی شادی کی عمر ہو وہ بچہ کی عمر سے بہت آگے جا چکی ہوتی ہے۔ صرف بیٹی کی محبت میں آپ اپنے بیٹے کی زندگی برباد کر سکتے ہیں۔“ شہلا بولی۔

”بیٹا! شاہ زیب نے کچھ کہا؟“ روبینہ بیگم نے سوال کیا۔

”جی مگر انہوں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا۔ آپ لوگوں کو کچھ بتانے سے۔“ انہیں عنادل کو دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کیا سب گھر والوں نے جان بوجھ کر نظریں چرائی ہیں۔ عنادل پر بھی غور کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کسی نے اسے تو دوپٹہ اوڑھنے کا ہوش تک نہیں ہے اب تک، پرسوں پنک پر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ انتہائی چپ حرکتیں کر رہی تھی شاہ زیب بھائی نے سب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ شریف گھر کی جوان بیٹیوں کو یہ حرکتیں زیب نہیں دیتیں اگر بھائی بڑوں کا ادب کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ بڑوں کی وجہ سے ان کی زندگی برباد ہو جائے۔“ شہلا پھٹ پڑی۔

”شادی کے بعد بدل جائے گی عنادل۔“ روبینہ بیگم بولیں۔
 ”اوہ کم آن امی! اپنا بیٹا ہی ملا ہے آپ کو عنادل کے بدلنے کے لیے اور کبھی عنادل سے سوال کیا ہے کہ وہ خود کو بدلنا بھی چاہتی ہے یا نہیں مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے بھائی سے شادی کرنے میں کوئی دلچسپی بھی ہے، دن رات لڑکوں میں گھسے رہنا، چٹیل شاہ زیب بھائی سے شادی ایک طرف کر دیں۔ کیا بڑوں کو عنادل کی حرکتیں بالکل نظر نہیں آتیں۔ اس کے ماں باپ، چچا چچی کسی نے کو بھی اسے سمجھا منع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ بابا! لڑکی لگتی لاڈلی ہو مگر اس کی کچھ حدیں ہوتی ہیں۔ یہ معاشرتی ضرورت بھی ہوتی ہے اور دین کا حکم بھی اور اس سے منہ موڑنا انسان کو نقصان کی طرف لے جاتا ہے۔ مجھے جو غلط لگا وہ میں نے کہہ دیا باقی آپ بڑے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔“ شہلا وہاں سے چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں موجودی کو محمود حسن اور روبینہ بیگم دیکھ چکے تھے۔
 ”شہلا بالکل سچ کہہ رہی ہے ہم سے واقعی کوتاہی ہوئی ہے۔“ روبینہ بیگم بولیں۔
 ”اور رہی شاہ زیب سے شادی کی بات تو کل میں عنادل سے خود بات کروں گا۔“ محمود حسن نے فکر مندی سے کہا۔

”اس میں بدتمیزی کی کیا بات ہے۔ صحیح تو کہہ رہی ہوں۔ میری لائف ہے اسے مجھے کس کے ساتھ گزارنی ہے وہ میرا ذاتی فیصلہ ہے تو آپ لوگ اپنی مرضی سے کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ وہ بھی وداؤٹ مائی پریشن۔“ عنادل، احمد حسن غصے کے مارے کھڑے ہو گئے۔
 ”احمد حسن بیٹھ جاؤ۔“ محمود حسن نے انہیں بیٹھنے کا کہا۔
 ”بڑے ابو! آپ بتائیں کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ عنادل نے ان سے کہا۔
 ”بیٹا آپ کو یہاں بلانے کا یہی مقصد ہے کہ آپ کا فیصلہ جان لیا جائے مگر بڑوں سے یوں بات کرتے ہیں؟“ انہوں نے عنادل سے کہا۔
 ”میں نے کسی سے کوئی بدتمیزی نہیں کی اور جہاں تک بات ہے میرے فیصلے کی تو صاف سن لیں۔ مجھے شاہ زیب سے شادی نہیں کرنی اینڈ دیش فائل آئندہ مجھے اس طرح کی کوئی تقریر نہیں کرنی۔“ عنادل نے انتہائی روڈ طریقے سے اپنا فیصلہ سنایا اور وہاں سے چلی گئی۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا احمد حسن کا چہرہ شرمندگی کے مارے سرخ ہو رہا تھا۔

”بھائی صاحب! اس بہت شرمندہ ہوں۔“ انہوں نے ہمت جمع کر کے کہا۔
 ”نہیں، احمد حسن! اسے فائل نہیں ہم سب شرمندہ ہیں۔ عنادل کی اس طرح پرورش ہم سب نے کی ہے لاڈ پیار میں ہم اتنا آگے نکل گئے ہیں کہ اسے غلط سب کا فرق فراموش کر بیٹھے۔“ محمود حسن نے کہا تو سب کے سر جھک گئے۔ محمود حسن نے سب کو تھکادیا کہ وہ خود اندر سے بالکل ٹوٹ گئے تھے۔ بچپن سے لے کر آج تک انہوں نے بھی عنادل کو روئے نہیں دیا مگر عنادل نے ان کے دل کو رلا دیا تھا۔

☆.....☆
 عنادل اور اس کی فرینڈ سارہ بوتیک سے نکل کر چلی رہے تھے کہ سامنے سے ایک لینڈ کروزر ہالک ان کے قریب آ کر رکی جس سے عنادل کی ٹکر ہو گئی تھی۔ عنادل کا پارہ ایک سیم آئی ہو گیا اس نے شاپنگ بیس سارہ کو پکڑا لیا اور گاڑی پر زور سے ہاتھ مارا۔

”سڑک کیا باپ نے خرید کر دی ہے۔“ اور پھر زور سے دوبارہ ہاتھ مارا کہ سارہ نے عنادل کو متح بھی کیا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اتنے میں گاڑی کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک لینڈ کروزر اتر کر ان نکلا سانولی رنگت، ہلکی شیو، کلف دار کرتے شلوار میں ملبوس وہ چلتا ہوا قریب آیا تو فضا بے حد قریبی کی طرح سے رچ گئی۔ اس نے سن گلز سڑاکر عنادل کو دیکھا تو بے خوف و ہڈر عنادل لہجہ بھر کو ڈر گئی۔ اس کی محسوس آئی برو کے نیچے موجود براؤن آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ عنادل نے گھبرا کر گاڑی کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

”گاڑی کے ساتھ کیا سڑک بھی آپ کی ملکیت ہے؟“ عنادل غصے سے بولی مگر وہ خاموشی سے عنادل کو دیکھتا رہا اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بلیک فطر کے کرتے اور جینز میں عنادل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

”لگتا ہے کان بھی خراب ہیں۔“ عنادل نے اپنا خوب صورت ہاتھ اس کے آگے ہلایا مگر وہ عنادل کے سر پرے میں کھویا ہوا تھا۔ عنادل نے گردن ہلائی اور وہاں سے چلی گئی۔

”سائیں کہیں تو.....“ ملازم نے کہنا چاہا مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ عنادل کی بد قسمتی نے اس کا سامنا رسل سے کروا دیا تھا اور اس میں سب سے بڑا قصور تھا عنادل کی خوب صورتی کا جس نے پہلی ہی

☆.....☆
 کمرے میں تینوں بھائی اپنی اہلیت کے ساتھ موجود تھے۔
 ”بھائی! ہم نے آپس میں رضامندی سے فیصلہ کر لیا تھا مگر کیا ہمارے بچے اس فیصلے کو دل سے مانتے بھی ہیں؟“ محمود حسن نے نورین بیگم کو طلب کر کے کہا۔
 ”بھائی صاحب! میں نے عنادل سے ڈر کر اسے بلایا ہے میں۔“ وہ بولیں۔
 ”ہمارے بچے اب جوان ہو گئے ہیں اور ان کی مرضی سے فیصلہ کیا جانی چاہیے۔“
 ”کیوں احمد حسن؟“ محمود حسن نے کہا۔
 ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی صاحب! مگر بیٹے لیں گے کہ عنادل ہمارے فیصلے کو رد نہیں کرے گی۔“ احمد حسن نے کہا۔
 ”تو پھر بلائیے عنادل کو۔“ روبینہ بیگم بولیں۔ تھوڑی دیر میں عنادل اپنی سادہ روات میں مطابقت جینز اور ٹی شرٹ میں چیونٹم چٹائی ہوئی آئی اور دم سے صوفے پر گر گئی۔
 ”واؤ لگتا ہے کوئی گول میز کانفرنس ہو رہی ہے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”بالکل ٹھیک کہا اور اس کانفرنس کا ایجنڈا ہے ”مس عنادل حسن“۔ ریاض حسن بولے۔
 ”کیا مطلب؟“ عنادل نے چیونٹم کو چپا ناروگ دیا۔
 ”عنادل! تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے بیٹا۔“ احمد حسن نے بیٹی سے کہا۔
 ”اوکے کہیے۔“ اس نے کہا۔

”بیٹا! تمہارے بڑے ابو اور میں نے تمہارا اور شاہ زیب کا رشتہ بچپن میں طے کر دیا تھا اور اب ہم اس وعدے کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ رہے ہیں تم کیا کہتی ہو اس بارے میں؟“ احمد حسن نے عنادل سے کہا۔ عنادل رک کر بولی۔
 ”واہ..... زندگی میری اور فیصلہ دوسرے کریں۔ سوری مگر مجھے نہیں لگتا کہ میں نے آپ لوگوں کو یہ فیصلہ کرنے کا حق دیا ہے۔“ عنادل نے جلدی سے کہا۔
 ”عنادل! یہ کیا بدتمیزی ہے؟“ نورین بیگم زور سے بولیں۔

نظر میں ارسل کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ارسل گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا مگر اس کی نگاہوں میں عنادل کا سراپا گردش کر رہا تھا۔
 ”بابا مٹھن!“ ارسل نے ملازم کو پکارا۔
 ”دھکم سائیں۔“ مٹھن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔
 ”بابا! ایک ضروری کام ہے وہ کرنا ہے تمہیں۔“

☆.....☆

”عنادل ڈنر کا دینوکافی دور ہے۔ لیٹ ہو جائیں گے واپسی پر۔“ حارث نے کہا۔
 ”ہاں تو چچ کون بتائے گا؟ کبائسٹڈ اسٹڈیز کا کہہ دوں گی۔“ عنادل نے لاپرواہی سے کہا۔ عنادل نے فرینڈ سارہ کے گھر ٹیمٹ کی تیاری کا کہہ کر اجازت لے لی۔ سارہ کے گھر حارث اور سہیل گاڑی لے آئے اور وہ لوگ ڈنر پر نکل گئے۔ حارث ڈرائیو کر رہا تھا۔ سہیل اس کے برابر میں بیٹھا ہوا تھا جب کہ عنادل اور سارہ پیچھے بیٹھی تھیں۔

”یار! عام لوگ میوزک تو لگاؤ۔“ عنادل بولی تو سہیل نے پلیئر آن کر دیا اس میں سیڈ ساٹنگ لگا ہوا تھا۔

”کم آن یار! میرا مود صاف مت کرو۔ نکالو یہ جھٹو نما ساٹنگ حارث! بیک اسٹریٹ بوائز لگا دو۔“ عنادل نے کہا تو حارث نے سہیل کوئی ٹیڈ ٹیکال ٹیڈ لگانے کو دے دی۔ ابھی ساٹنگ پلے ہی ہوا تھا ایک لینڈ کروزر تیزی سے ان کی گاڑی کے برابر سے زور سے گزری ان کی گاڑی لڑکھڑا گئی۔ پھر وہ لینڈ کروزر ان کے آگے راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اس لینڈ کروزر سے بیٹھے تھے۔ حارث نے گاڑی کے بائیں آئے۔ ایک نے آگے ڈرائیو کرتے حارث کے سر پر گن رکھ دی اور دوسری نے پیچھے گاٹ کھول کر عنادل کو باہر نکلنے کا کہا۔ مگر عنادل نے صاف انکار کر دیا۔

”بی بی باہر آئیں۔“

”نہیں۔“ عنادل بولی۔

”بی بی! آجائیں ورنہ ہمیں زبردستی کرنا پڑے گی۔“ ایک نقاب پوش بولا۔
 ”آپ کیش لے لیجیے میرے پاس جیولری نہیں ہے۔“ عنادل نے اپنا والٹ دیتے ہوئے کہا۔
 ”بی بی باہر آئیں ورنہ اس لڑکے کو مار دیں گے۔“ حارث کے سر پر گن رکھے نقاب پوش نے کہا تو عنادل ڈرتی ہوئی گاڑی سے اتر آئی۔ اسے اپنے گھر والے یاد آ رہے تھے جنہیں خبر بھی نہ تھی کہ عنادل کہاں ہے۔
 ”چلیں۔“ نقاب پوش نے لینڈ کروزر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ عنادل لینڈ کروزر کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

”میٹھی بی بی!“ عنادل نے نہ میں گردن ہلائی تو حارث کے پاس موجود نقاب پوش نے چلا کر کہا۔
 ”ایک لمحہ اور لگا تو اس کی کھوپڑی میں سوراخ ہو جائے گا۔“ عنادل مجبوراً گاڑی میں بیٹھ گئی اس کے بیٹھے ہی سارے نقاب پوش دوڑ کر لینڈ کروزر میں سوار ہو گئے اور اس میں موجود ڈرائیور نے گیس لگایا اور لینڈ کروزر فرار لے بھرتی وہاں سے ہوا ہو گئی۔ گاڑی میں سوار عنادل کی ناک پر ایک رومال رکھ دیا وہ زور سے کسماسکی پھر آہستہ آہستہ اس کی کوشش ختم ہو گئی اور وہ ہوش سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ حارث سہیل اور سارہ مٹی کے بت بنے رہ گئے۔

گئے۔ ان کی عقل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر یہ سب کیا ہوا تھا۔ ان کی کچھ سمجھ نہ آیا کافی دیر بعد وہ ہوش میں آئے تو گھبرا گئے۔

”یار! ہم تو بری طرح پھنس گئے۔ عنادل کے گھر والوں کو تو علم ہی نہیں ہے ہمارے ڈنر پر جانے کا؟“ سہیل بولا۔

”ارے وہ بول کر تو میرے گھر کا گئی تھی۔“ سارہ نے روتے ہوئے کہا۔

”گائز! یہ سب باتیں تو معمولی ہیں اصل مسئلہ ہے عنادل کے کڈ نیپ ہونے کا، ہمیں پہلی فرصت میں عنادل کے گھر والوں کو انفارم کرنا ہوگا۔“ حارث نے کہا اور گاڑی موڑ کر عنادل کے گھر کی طرف چل دیے۔ جب وہ لوگ عنادل کے گھر پہنچے اور ساری بات بتائی تو عنادل کے گھر میں ہلچل مچ گئی۔ نورین بیگم نے دھاڑیں ماری شروع کر دیں۔

”آئی پلیر! امت روئیں، یہ غلطی عنادل نے ضروری مگر ہم بھی بغیر بتائے جانے کے لیے اس کو نہ روک کر آپ کے مجرم ہیں۔“ سہیل بولی۔

”نہیں بیٹا! غلطی کسی کی نہیں ہے یہ تو کوئی اور ہی معاملہ ہے ورنہ عنادل کو صرف گاڑی سے نکال کر لے جانا سمجھ میں نہ آنے والی بات ہے۔“ محسن بولے۔ اتنے میں سامنے سے ڈی ایس پی تیمور نیازی آ گئے۔ وہ محمود حسن کے بچپن کے دوست تھے اور محمود حسن کے کال کرنے پر آئے تھے۔ ڈی ایس پی تیمور نیازی ان کے ساتھ بیٹھ گئے اور بولے۔

”بھو! شروع سے ساری بات بتاؤ آخر ہوا کیا تھا؟“ عنادل کے فرینڈ ز انہیں پورا واقعہ بتانے لگے۔
 ”انگل! میں نے خاموشی سے اس لینڈ کروزر کا ممبرس سہیل نے اپنا موبائل محمود حسن کو دیتے ہوئے کہا۔ محمود حسن نے وہ نمبر اپنے پاس لکھ کر ڈی ایس پی تیمور نیازی کو ایم ایس کر دیا۔

”ویسے اگر عنادل کو کسی نے پیسوں کے لیے کڈ نیپ کیا ہے تو اسے جیل کی ڈیمانڈ آ جانی چاہیے تھی۔ دوسرے پہلو کو دیکھا جائے تو عنادل کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں ہے۔ سہیل بولا۔
 ”غیرہ.....“ تیمور نیازی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نیازی!.....“ محمود حسن نے پرہی سے کہا۔

”نوسر! عنادل کا لڑکوں سے کوئی تعلق نہیں ہے ہم جانتے ہیں اسے۔“ حارث بولا۔

”ارے بھئی! میرا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو میں اپنی عنادل بیٹا کو جانتا ہوں مگر کالج، یونیورسٹی میں اکثر لڑکے لڑکیاں ایڈوچر کے لیے ایسے بے ہودہ مذاق کر لیتے ہیں۔“ نیازی نے کہا۔

”ایک منٹ۔“ سارہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”ہاں یاد آتا تین یا چار روز پہلے میں اور عنادل بوتیک سے نکل رہے تھے تو عنادل کی ٹکرائیک لینڈ کروزر سے ہو گئی تھی۔ اس میں سے کوئی نوجوان نکلا تھا۔ عنادل نے اسے خوب سانس نہیں دیں۔ میں نے منع بھی کیا تھا مگر وہ باز نہ آئی۔“ سارہ نے یاد کر کے بتایا۔

”انٹرسٹنگ! عنادل کی کڈ نیپنگ میں بھی لینڈ کروزر استعمال ہوئی ہے۔“ تیمور نیازی نے مشترکہ پوائنٹ نوٹ کیا۔

”کون ہو سکتا ہے نیازی؟“ احمد حسن بولے۔

”اس کا پتا ہم لگالیں گے۔ آپ فکر مت کریں عنادل بیٹی کو ہم بہت جلد بحفاظت لے آئیں گے۔“ تیمور نیازی نے تسلی دی۔

☆.....☆

عنادل کی آنکھ کھلی تو اس کا سر زور سے گھوم گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اسے ابکا کی بھی آ رہی تھی یہ سب بے ہوشی کی دوا کا اثر تھا۔ وہ کافی دیر بیٹی رہی پھر اس کی طبیعت کچھ کنٹرول ہوئی تو اسے یاد آیا کہ اسے تو نقاب پوشوں نے کن پوائنٹ پر ایک لینڈ کروزر میں بٹھایا تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کیا ہوا یہ عنادل کو یاد نہیں آ رہا تھا۔ عنادل نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ وہ ایک بے حد اعلیٰ اور شاندار انداز میں بے کمرے میں موجود تھی۔ کمرہ خواب ناک حد تک شاندار تھا۔ ایک ایک چیز سے اس کی مالیت جھلک رہی تھی۔ کمرے میں فل اے سی آن تھا مگر پھر بھی عنادل کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موجود تھے۔ کمرے کا لاک حرکت میں آیا اور دروازہ کھل گیا۔ اس میں سے ایک نوجوان شان سے چلتا ہوا اندر آ گیا۔ عنادل کو اس کا چہرہ مانوس سا لگا اس نے ذہن پر زور دیا مگر اسے یاد نہیں آیا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

”آپ کو اس رات یہاں لانے کے لیے شرمندہ ہیں ہم مگر کیا کریں آپ ہماری دعوت پر آئیں ہی کہاں، جان لیا ہے ہم نے آپ کا نام آج ہی کچھ لگ ہے۔“ اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کون ہو؟ اور کیوں آپ کو مجھے یہاں؟ میں تو نہیں جانتی تھیں۔“ عنادل نے سختی سے کہا۔

”قربان جانے کو دل چاہتا ہے تم کو اور تمہاری بے نیازی پر۔ ہم ہیں کہ بے قراری کا عالم ہے اور آپ کو ہم یاد تک نہیں خیر آپ کی آسانی کے لیے ہم نے کچھ روز پہلے آپ سے ملیں اور اپنے ساتھ ہمارا دل لے کر چلی گئی تھیں۔ کافی باتیں بھی سنائی تھیں آپ کے بارے میں۔“ اس نے کہا۔ عنادل نے ذہن پر پھر زور دیا تو اسے اس روز کی جھڑپ یاد آ گئی۔ عنادل کا پارہ پھر پائی ہوئی لگا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ اس نے غصے سے کہا۔

”ہائے..... اسی غصے پر تو ہم مرے ہیں آپ کو کیا معلوم کیا۔“ غصے میں اور بھی حسین ہو جاتی ہیں۔ وہ عنادل کے قریب آ کر بولا۔

”دیکھو! مجھے اس طرح کی بے ہودگی بالکل پسند نہیں ہے۔ مجھے میرے دل کا افسوس ہوا۔“ عنادل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی اطلاع کے لیے عرض کر دوں کہ اب یہی آپ کا گھر ہے۔“ اس نے آرام سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”اوہ شٹ اپ! بکواس مت کرو۔“ عنادل نے غصے سے کہا۔ اسل صوفے سے اٹھ کر عنادل کے قریب آیا اور بولا۔

”بی بی! جتنی جلدی ہو اس حقیقت کو تسلیم کر لو، ورنہ پریشانی آپ کو ہی ہوگی۔“ اس نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا تو عنادل ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔

”مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”ہمیں تم سے محبت ہوگئی ہے اور ہم آپ کو چاہتے ہیں۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”واٹ نان سنس! مجھے اس طرح کی بکواس سننے کی عادت نہیں ہے، مجھے ابھی میرے گھر چھوڑ کر آؤ۔“

عنادل نے خود پر کنٹرول کیا اور زور سے بولی۔ اسل مسکرا کر اسے گھورنے لگا۔

”تمہاری بیٹی ادا تو مجھے بھاگئی اور تم نے اسل شاہ کے دل کو چھو لیا ورنہ کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرے سامنے اونچی آواز میں بات کر سکے۔ بی بی میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کرنا چاہتا ورنہ کون روکے گا مجھے چاہوں تو اس لمحے اپنا ہنسکتا ہوں تمہیں۔“ اسل نے عنادل کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ عنادل لرز کر کئی قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اسل اس کا انداز دیکھ کر زور سے ہنسنے لگا۔

”آرام کرو پرسوں ہمارا نکاح ہے اگر ہمیں جانا نہ ہوتا تو ابھی نکاح ہو جاتا۔“ اسل نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ عنادل کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دروازہ پھر کھلا تو عنادل نے چونک کر دیکھا تو ملازمہ ٹرائی لے کر اندر آئی تھی۔ ”بی بی کھانا کھالیں۔“ اس نے عنادل سے کہا۔ ٹرائی دنیا بھر کے لوازمات سے آراستہ تھی مگر عنادل نے کچھ نہیں کہا ملازمہ دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

”محمود حسن گاڑی ٹرائی ہو گئی ہے۔“ اسل شاہ کے نام پر رجسٹرڈ ہے بہت بڑے باپ کی اولاد ہے۔ گاڑی سے سلائی نکال کر اسل نے کہا۔ ”ڈی ایس پی نیازی نے کہا۔“

”نیازی کچھ کی کچھ نہیں عنادل کو خراش تک نہیں آئی چاہیے۔“ محمود حسن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”اللہ سے دعا کرو محمود حسن! پوشش ہماری ہوگی اور حکم اللہ کا انشاء اللہ ہم بہت جلد عنادل تک پہنچ جائیں گے۔“ تیمور نیازی نے کہا۔

☆.....☆

ملازمہ دوبارہ آئی تو کھانا جوں کا توں رکھا۔ اسل نے ٹرائی کو خاموشی سے دھکیلا اور کمرے سے نکل گئی اور اسل کو جا کر بتادیا۔ اسل نے پھر کھانا لانا کہا اور کمرے میں گیا۔ ملازمہ نے دوسری ٹرائی لا کر دی اور چلی گئی۔ عنادل نے اسل کو دیکھ کر نفرت سے منہ دھری ہوئی نظر ڈالی۔

”عنادل بی بی! کھانا کھالیں۔“ اسل نے اسے پیار سے مخاطب کیا۔

”نام مت لینا میرا اپنی گندی ناپاک زبان سے۔“ عنادل نے کہا۔

”ہا ہا ہا! مگر اب تو میرا نام ہمیشہ کے لیے تمہارے نام سے جڑ جائے گا اور تمہاری زندگی بھر کے لیے میری قید میں آ جائے گی۔“ اسل نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”میں مر جاؤں گی مگر تم سے شادی نہیں کروں گی۔“ عنادل نے روتے ہوئے کہا۔ اسل نے پلیٹ میں کھانا نکالا اور اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا۔

”میری اجازت کے بغیر تو تم مر بھی نہ سکو گی جو چیز اسل شاہ کی جان بن جائے، اس کی جان اسل شاہ کے حکم کے بغیر نہیں لی جاسکتی۔“ اسل نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”چلو! غصہ چھوڑو اور کھانا کھا لو۔“ اسل شاہ نے نوالہ اس کے منہ کے قریب کیا تو عنادل نے ہونٹ سختی سے بند کر لیے۔

”دیکھو! مجھے زبردستی پر مجبور مت کرو، ورنہ پھر جو کچھ ہوگا تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتیں۔“ اسل نے دھمکی آمیز انداز سے کہا تو عنادل لرز گئی اسل نے ہاتھ بڑھایا تو عنادل نے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔

”خوش قسمت ہو تم جو میرے دل میں اتر گئیں اور میں تمہیں اپنی زندگی کا حصہ بنا رہا ہوں، ورنہ ان گنت لڑکیاں یہاں آئیں اور کہاں کہیں کسی کو آج تک خبر نہ ہو سکی۔“ اسل کی چمکتی آنکھیں عنادل کو اپنے وجود کے آ

بار ہوتیں محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے جھینپ کر نظریں نیچی کر لیں۔ اس کی اس حرکت پر ارسل بے اختیار ہنسنے لگا۔

☆.....☆

”سراجن ہندوں کو نگرانی پر معذور کیا ہے۔ انہوں نے خبر دی ہے کہ لینڈ کروزر کچھ دیر قبل شہر سے دور ایک فارم ہاؤس پر کھڑی ہے اور فارم ہاؤس ارسل شاہ کے باپ کا ہے۔“ آفسر نے تیور نیازی کو رپورٹ کی۔

”فورا ریڈ کرو، ہاں مگر اس کی اطلاع کسی کو نہیں ہونی چاہیے۔“ تیور نیازی نے آرڈر دیا۔

”اوکے سراج“ آفسر نے سیلوٹ کیا اور چلا گیا مگر ارسل بھی کوئی معمولی شخصیت کی نہ تھی۔ ارسل کو چند منٹ پہلے ہی اطلاع مل گئی تھی اور وہ فوراً غائب ہو گیا اگر اسے تھوڑا تاخیر مل جاتا تو وہ عنادل کو اپنے ساتھ لے جاتا۔

پولیس نے فلاح آباد میں ہر ریڈ کر کے عنادل کو بازیاب کروالیا۔ پولیس نے کافی جگہ چھاپے مارے مگر ارسل شاہ ان کے ہاتھ نہ آیا۔

”معا لے کو پھیلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ بدنامی صرف لڑکی کی ہوتی ہے تو اگر تم ارسل کو جانے دو تو میں زبان دیتا ہوں کہ آئندہ تمہاری بیٹی کو پریشان نہیں کرے گا۔“ محمود حسن نے مجھداری کا مظاہرہ کیا اور عزت کی وجہ سے ارسل شاہ کو معاف کر دیا۔

”ابپا“ وہ جانتے تھے کسی نہ کسی طرح اس نے فوج ہی جانا تھا مگر اب اس کا باپ ضمانت دے رہا ہے کہ وہ عنادل کو اب رہنما نہیں کرے گا، کیونکہ کیا بھروسہ وہ پھر عنادل کو تنگ کرنے آجاتا۔ ارسل شاہ کو اس کے باپ نے بیرونی ملک بھیج دیا۔

وقت پر نہ آئی اور ارسل اس سے نکاح کر لیتا تو زندگی گھروں میں سے پیچھا نہ چھڑا پانی۔ عنادل کو اس واقعے نے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

☆.....☆

”السلام علیکم بھچھو۔“ منیبہ آپا نے جوشاہ زیب کی آواز سنی تو نہال ہو گئیں۔

”ارے میرے بچے! علیکم السلام تین سال بعد پھوپھو یاد آگئیں؟“ انہوں نے پہلے ہی عنادل سے شادی نہ ہونے کے بعد شاہ زیب دوبارہ انگلیٹنڈ چلا گیا تھا۔ اسے گئے تین سال ہو گئے تھے۔

”کیا کسی گوری سے شادی کر لی ہے جو آنے کا دل نہیں چاہتا۔“ انہوں نے شاہ زیب کو پچھڑا۔

”بھچھو! میں ابھی پاکستان آیا ہوں اور سب سے پہلے آپ کو فون کیا ہے۔“ شاہ زیب نے ہنسنے ہوئے کہا۔ شاہ زیب چونکہ اسلام آباد میں رہتا تھا تو منیبہ بھچھو سے ملنے راولپنڈی آتا رہتا تھا۔ وہ بھی شاہ زیب کو اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں۔

”کب آرہے ہو پھر؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بھچھو! بس آفس رپورٹ کروں پھر آتا ہوں۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”اوکے بیٹا! اپنا خیال رکھنا، اللہ حافظ۔“ انہوں نے کہا۔

”اللہ حافظ بھچھو۔“ شاہ زیب نے کہا۔

☆.....☆

گاڑی دروازے پر رکھی اور گاڑی سے شاہ زیب اتر کر باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھوں میں سرخ گلابوں کا بگے تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ بگے سے بگے گٹھ سے زیادہ منیبہ بھچھو کو سرخ گلاب پسند آتے، انہیں سرخ گلابوں سے

عشق تھا۔ ان کا گھر لان کے علاوہ بھی گلاب کے پودوں سے مزین تھا۔ شاہ زیب نے دروازے کے برابر دیوار پر لگی ڈور بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد خان بابا نے دروازہ کھول دیا۔

”السلام علیکم خان بابا۔“ شاہ زیب نے گرم جوشی سے کہا۔

”علیکم السلام جیتے رہو۔“ خان بابا نے دعا دی۔ لان میں قدم رکھتے ہی شاہ زیب چونک کر رک گیا۔ وہاں موجود ایک وجود نے اس پر سحر طاری کر دیا تھا مہندی لکھ کے شیٹون کے سوٹ میں لمبوں وہ اپنی گوری کلاکیوں میں بھی میروں لکھ کر چوڑیاں پہنے پودوں کو پانی دے رہی تھی۔ سر پر موجود دو بگے کو ہوا بار بار اڑا رہی تھی۔

دو بگے کے آپرل سے بھی دھستی بھی پچھتی اس کی جھلک شاہ زیب کو بے قرار کرنے لگی۔ حالانکہ شاہ زیب اس ٹائپ کا نہیں تھا جو لڑکیوں کو دیکھتے ہوں مگر جانے اس وجود میں کیسی مقناطیسی کشش تھی جو اس کو اپنی طرف کھینچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”آخروہ کون ہے؟“ شاہ زیب کا تجسس مزید بڑھنے لگا۔ اس نے غور سے دیکھنا چاہا تو قدرت نے اس کا کام آسان کر دیا۔ تین سال کے ایک شریر جھونکے نے اس کے سر سے آپرل کو اڑا دیا اور اس کے کمر پر پھیلے ہوئے بال ہوا میں بکھر کر اسے پریشان کرنے لگے۔ اس حسین پیکر نے پانی روک کر ہاتھوں سے بالوں کو سینا اور دوبارہ دوپٹہ سر پر لے لیا پھر وہ مڑی مگر آپرل اس کے چہرے کو چھپائے جا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ شاہ زیب اسے دیکھ پاتا وہ سر جھکا کر اندر چلی گئی۔

ہوش آیا تو وہ جھینپ گیا۔

”یہ میں کیا کر رہا تھا کسی کو اس طرح دیکھنا بالکل غیر انسانی ہے۔“ اس نے خود کو برا کہا۔

”ارے بیٹا! شاہ زیب تم کب آئے؟“ منیبہ بھچھو نے اسے دیکھ کر خوش ہو کر کہا۔

”بس ابھی آیا ہوں۔ یہ میری سویت بھچھو کے لیے ہیں۔“ شاہ زیب نے سرخ گلابوں کا بگے منیبہ بیگم کو دیتے ہوئے کہا۔

”تھینک یو سوچ بیٹا۔“ منیبہ بیگم نے شاہ زیب کے ماتھے پر بوسہ لیتے ہوئے کہا۔

”بھچھو! یہ کون محترمہ تھیں جو اندر گئی ہیں؟“ شاہ زیب نے سوال کیا۔

”وہ! ارے وہ تو اپنی عنادل ہے۔“ منیبہ بیگم نے ہنسنے ہوئے کہا شاہ زیب ان کی بات پر چونک گیا۔

”کہیں یہ کوئی خواب تو نہیں ہے، نہیں یہ عنادل نہیں ہو سکتی وہ تو.....“

”چلو بیٹا اندر کیا نہیں رہنے کا ارادہ ہے؟“ تو شاہ زیب خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عنادل سارا دن اپنے کمرے میں ہی تھی منیبہ بیگم نے شاہ زیب کو ساری بات بتائی کہ کس طرح عنادل کی زندگی میں اتنا بڑا پہنچ آیا انہوں نے ارسل شاہ سے لے کر عنادل کے بیٹی آنے تک کی ساری بات بتائی کہ کس طرح عنادل ٹوٹ گئی تھی اور اس کی ذہنی کیفیت بالکل بچوں کی طرح ہو گئی تھی۔ محمود حسن نے فوراً عنادل کو ان کے پاس بھیج دیا۔ پہلے تو عنادل نے اپنے آپ کو ایک کمرے تک محدود رکھا۔ میں نے کچھ وقت تو اسے من مانی کرنے دی۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے اس کی نئے سرے سے تربیت کرنی شروع کر دی۔ وہ نارمل زندگی کی طرف آنے لگی تو میں نے اسے دین کے بارے میں پڑھایا، نماز کی طرف راغب کیا۔ اسے اس کی اقدار سمجھائیں کہ کس طرح ایک لڑکی کو شرم و حیا کے زیور سے آراستہ ہونا چاہیے اور اس طرح رہنے سے انسان بہت ہی برائیوں سے بچ سکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ میرے سائے میں میرے بتائے انداز میں ڈھلتی چلی گئی۔ اب وہ پہلے والی عنادل نہیں

”اتنا سب ہو گیا پھپھو! اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”ارے بیٹا! یہ سب ہمارے لیے ایک خوفناک حادثہ تھا۔ جس سے ہم سب ٹکنا چاہتے تھے خاص طور سے عنادل اور محمود حسن کا حکم تھا اس بارے میں کوئی بات نہ کی جائے اور اللہ بھلا کرے محمود حسن کے دوست ڈی ایس پی تیمور نیازی کا جس نے اس بات کی بھنک بھی نہ ہونے دی تھی کسی کو اور بحفاظت ہماری بچی ہم تک پہنچادی اور ویسے بھی تم اتنی دور پردیس میں بیٹھے تھے تمہیں پریشان کر کے کیا فائدہ ہوتا۔“ منیبہ پھپھو نے اسے سمجھایا۔ شاہ زیب بے تاب ہو رہا تھا کہ کب عنادل باہر آئے اور وہ اس کا دیدار کر سکے۔ شام ہوئی شاہ زیب اور منیبہ پھپھو بیٹھے تھے کہ عنادل وہاں آگئی۔

”پھپھو! کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ اس نے سر جھکا کر کہا۔ شاہ زیب کو اپنی ساعت پر شبہ ہوا تو اس نے چونک کر سر اٹھایا اور عنادل کو دیکھا اور پھر نظریں ہٹانا بھول گیا۔ سی گرین نیٹ کے سوٹ میں وہ بے حد خوب صورت لگ رہی تھی۔ منیبہ کی رنگت دیکھتے گال، گلابی ہونٹ شاہ زیب کی نظر میں اپنے خیل میں موجود عنادل گھوم گئی جو کہ اب حقیقتاً اس کے لیے مڑی تھی۔

”بیٹا! آج تو شاہ زیب کی پسند کا کھانا بنا لو، پلاؤ تو بنالیا ہے میں نے تم شامی کباب اور کھیر بنالو۔“ منیبہ پھپھو نے عنادل کو کہا۔

”پھپھو! مجھے لگتا ہے کھانے سے پہلے اسے صبر کرنا سیکھنا چاہیے۔“ شاہ زیب نے کہتے ہوئے عنادل کی طرف دیکھا تو عنادل دھیرے سے سر جھکا کر اس کی طرف سے گلابی ہونٹوں پر موجود قتل نے شاہ زیب کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔ شاہ زیب کی محبت کا حسین جھانک میں اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ شاہ زیب رات کے کھانے پر میز پر آیا تو میز سلیقے سے سجی ہوئی تھی۔ عنادل کا موش سے پھپھو کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔

”بیٹا! کھانا دو شاہ زیب کو۔“ پھپھو نے عنادل سے کہا تو عنادل نے ملے سے کھانا پلیٹ میں نکال کر شاہ زیب کو سروس کیا۔

”بیٹا! اپنی انگلیاں بچا کر کھانا کھانا، میری گڑیا بہت لذیذ کھانا بناتی ہے۔“ منیبہ پھپھو نے بولیں۔

”دیکھتے ہیں بھئی۔“ شاہ زیب نے کہا اور نوالہ منہ میں ڈال کر ٹیسٹ کرنے لگا۔

”مان گئے پھپھو! کھانا واقعی بے حد لذیذ ہے۔“ شاہ زیب نے دل کھول کر عنادل کی تعریف کی۔

☆.....☆

دوپہر سے پھوار پڑ رہی تھی مگر رات ہوئے ہی بادل گھر کر آئے گئے۔

”لگتا ہے بارش زوروں سے برسے گی آج۔“ منیبہ پھپھو نے کہا۔

”جی پھپھو! آپ یہ دودھ پی لیجیے۔“ عنادل نے کہا اور دودھ کا گلاس رکھ کر چلی گئی۔ عنادل منیبہ پھپھو کے کمرے سے باہر آئی وہ چلتی ہوئی کوریڈور سے گزرتی اپنے کمرے میں جا رہی تھی کہ ایک دم زور سے بارش شروع ہوئی عنادل چلتی ہوئی گیلری میں آکر کھڑی ہو گئی۔ شروع سے ہی اسے بارش پسند تھی بچپن میں تو باقاعدہ کھنٹوں بارش میں تمام کمرز کے ساتھ فٹ بال کھیتی تھی۔ عنادل نے ہاتھ باہر نکالا اور اپنے ہاتھوں کو بھگونے لگی اور آہستہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ شاہ زیب کب آکر پیچھے کھڑا ہوا اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا وہ مسلسل اسے دیکھتے جا رہا تھا پھر ایک دم عنادل کو کسی کی نظر کو دیکھ کر اس کا احساس ہوا تو اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں تو اس کے سامنے

شاہ زیب کھڑا تھا۔ عنادل اسے دیکھ کر جھپٹ گئی اور شرما کر سر جھکا لیا اور پلٹ کر جانے کے لیے مڑی تو شاہ زیب نے ایک دم اس کی کلائی تھام لی۔

”کہاں جا رہی ہو مجھے یوں تنہا چھوڑ کر؟“ شاہ زیب نے اس سے کہا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ چھوڑیں میرا ہاتھ۔“ عنادل نے گھبرا کر کہا۔

”یہ ہاتھ میں نے زندگی بھر تھامنے کا ارادہ تو جانے کب سے کر رکھا تھا مگر تم.....“ شاہ زیب کہتے کہتے رک گیا۔ عنادل نے ہاتھ چھڑا کر جاننا چاہا مگر شاہ زیب کی گرفت اس کے جذبات کی طرح مضبوط اور شدید تھی۔

”کہاں تھیں تم عنادل اب تک؟ تمہیں نہیں معلوم کہ تم نے مجھے کس قدر مایوس کیا ہے۔“ شاہ زیب نے جذباتی انداز سے کہا۔

”میں نے تو کبھی کو مایوس کیا ہے۔ سب کی امیدوں کو توڑا ہے۔ بڑوں کے دل دکھائے ہیں اور اس کی سزا قدرت نے مجھے دی تھی۔ مگر میں اب بھی میرے اپنوں کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا جن کو میں نے مایوس کیا تھا۔ بہت بری ہوں میں۔“ عنادل نے سر جھکا کر کہا۔

”اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا وہ حادثہ ایک الگ چیز ہے جو کسی کے بھی ساتھ پیش آ سکتا تھا۔“ شاہ زیب نے اسے سمجھایا۔

”ہاں مگر جانتی ہو؟ تم نے جو مجھ سے شکایت کرنے سے انکار کر دیا تھا اس نے میرا دل چکنا چور کر دیا تھا۔“

شاہ زیب نے شکوہ کیا۔

دل چکنا چور کر دیا تھا مگر آپ کو میرے انکار سے کیا لگتا ہے؟ آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔

”مجھے عنادل سے شادی کرنے میں کوئی دیشپی نہیں ہے اللہ نے مجھے یہ نصیب کیا کسی بھی ذی ہوش مرد کو مجھ سے شادی کرنے میں کوئی چارم نہ ہوگا۔“ عنادل نے شاہ زیب کے شہلا سے کہہ کر دھڑک دیا۔

وہ تو میرے اندر کی فرسٹریشن تھی جب میری محبت غیر لڑکوں کے ساتھ ہونے لگی تھی کہ ساتھ ساتھ باقائمی کے مذاق کرنے کی تو کیا میری غیرت یہ سب گوارا کرتی میرے تصور میں جو سالوں سے میری محبت کا عکس بسا ہوا تھا۔ جیسا کہ آج تمہارا وجود ہے پائیزہ، معطر، شرم و حیا سے آراستہ میرے اس تراغے ہوئے خاکے کے تم بالکل برعکس نکلیں تو کیا میرا رد عمل غلط تھا؟ تم خود بتاؤ۔“ شاہ زیب نے الٹا اسے ہی گواہ کر لیا۔

”بولو عنادل۔“

”آپ کا رد عمل بالکل نیچرل تھا۔“ عنادل نے دھیرے سے کہا۔

”عنادل مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے تمہیں دل سے نکال دیا یا اب مجھے تم سے محبت نہیں رہی بلکہ تمہارے شادی سے انکار پر میں نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ زندگی بھر شادی نہ کرنے کا۔“ شاہ زیب نے کہا تو

عنادل چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگی۔

”مگر کیوں؟“ عنادل نے حیرانی سے سوال کیا۔

”وہ اس لیے کہ میں آج بھی تمہیں اتنی ہی شدتوں سے چاہتا ہوں عنادل! میرے دل پر دستک دینے والی پہلی اور آخری لڑکی صرف تم ہی ہو۔“ شاہ زیب نے کہا۔

”مگر میں.....“ عنادل نے کچھ کہنا چاہا تو شاہ زیب نے اپنی انگلی اس کے ہونٹوں پر رکھ کر اسے خاموش کر

دیا۔

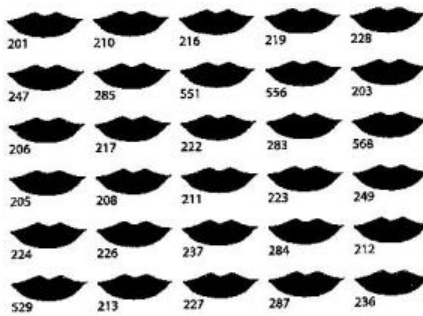
Medora

Matte Lipsticks with matching Nail Enamel

"MATTE LOOK with LASTING COMFORT"



AVAILABLE IN 100 SHADES,
30 Selected Shades are shown here



'Matte' never goes out of trend. Beautiful, Bold, Smooth, Vibrant and classy lip colours. The perfect long wearing matte Formula.

MEDORA OF LONDON for a more beautiful you

"اب تو مجھے میری محبت پالینے دو، کیا تم زندگی کے اس سفر میں میری ہمسفر بنو گی؟" شاہ زیب نے عنادل کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو عنادل نے شرم سے سر جھکا دیا۔
"پچھو! آپ بابا سے بات کریں میرے اور عنادل کے رشتے کی۔" شاہ زیب نے منیبہ بیگم سے کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

"شاہ زیب! تم نے میرے دل کی بات کہہ کر مجھے خوش کر دیا۔ ارے ہم بڑوں نے سالوں پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا مگر تم بچوں نے ہی منع کر دیا تھا خیر دیر آئے درست آئے۔" پھر منیبہ بیگم نے محمود حسن کو کال کی اور بات کی محمود حسن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی تھا مگر وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔
"آپ! پہلے دہلی کو کراچی لے آئیے پھر بات کرتے ہیں۔" منیبہ آپادونوں کو لے کر کراچی پہنچ گئیں جہاں سب گھر والے ان کا بے چین سے انتظار کر رہے تھے۔

☆.....☆

"شاہ زیب! پہلے بھی یہ فیصلہ ہوا تھا کہ تمہارے اور عنادل کے نصیب کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا جائے مگر شہلا کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ مجھے بچوں کے پہلے معلوم کرنا چاہیے تھا۔ اب جب دوبارہ منیبہ آپا نے یہ ذکر چھیڑا ہے تو تم بتاؤ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟" عنادل نے شادی کرنے میں؟ محمود حسن نے پوچھا۔
"نہیں بابا! مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" شاہ زیب نے سر جھکا کر کہا۔

"ٹھیک ہے تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے مگر فیصلہ عنادل کے ماتے پر منحصر ہے۔" انہوں نے شاہ زیب سے کہا۔ پھر وہ عنادل کے پاس گئے اور بولے۔
"عنادل بیٹا! میں تمہاری مرضی پوچھنے آیا ہوں کسی بھی دباؤ میں اسے مجبور نہ کرنا۔" محمود حسن کے کہنے پر عنادل دوڑ کر آئی اور ان سے لپٹ گئی۔
"آئی! ام ریکی سوری بڑے ابو۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔
"مگر کس لیے بیٹا؟" محمود حسن نے کہا۔

"فارمانی بی بیویہیز۔ میں نے اس دن بہت روڈ انڈاز میں بات کی تھی جو کہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی۔" عنادل نے کہا۔

"جو گزر گیا اسے بھول جاؤ اور یہ بتاؤ کہ اپنے بڑے ابو کی بہو بنو گی؟" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا تو عنادل نے سر جھکا کر ان کے سینے سے ٹکا دیا۔ محمود حسن نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور بولے۔
"وجہی رہو۔"

شاہ زیب اور عنادل کی شادی بے حد دھوم دھام سے ہوئی محمود حسن کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ ان کی برسوں کی خواہش آج پوری ہوئی تھی۔ احمد حسن اور نورین بیگم بھی بھائی بھائی سے کیے وعدے کو پورا کر کے بہت خوش تھے۔ شہلا اب مطمئن تھی کہ اس کے بھائی کو اس کی محبت اس کی چاہ کے مطابق مل گئی تھی۔ ارسلہ اور احمر نے خوب اوشم منجایا ہوا تھا۔ شادی کے روز عنادل اور شاہ زیب اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے، جب کہ عنادل کے فرینڈز حارث، سہیل اور سارہ ارسلہ اور احمر کے ساتھ ڈانس کر رہے تھے۔ شاہ زیب نے عنادل کو کچھٹرا۔
"عنادل! تم بھی چیز شرت پہن کر ان کا ساتھ نہیں دو گی؟" تو عنادل نے شرما کر ناں میں گردن ہلا دی۔

☆.....☆

ایسا کی قسمت

شہر کے عین وسط میں بے حد مصروف شاہراہ پر واقع ریستورانٹ کے فرسٹ فلور پر بے نیلی کیبن میں اس وقت وہ دونوں بھی موجود تھے اور پچھلے چند لمحوں سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بالکل ساکت بیٹھے تھے پھر تبسم نے اس خاموشی کے قفل کو توڑا اور نظریں کافی کے کپ پر مرکوز کرتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولی۔
”تمہاری زندگی کا کیا مقصد ہے؟“ انداز

سوالیہ تھا جو ہارون کو حیرت زدہ کر گیا۔
”میری زندگی کا مقصد..... اپنی ماں کے خواب کو پورا کرنا ہے۔“ ہارون نے کافی کا کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
”تو کیا تمہاری اپنی کوئی سوچ نہیں ہے جو تم

اپنی ماں کے خواب کو پورا کرنے کے لیے اتنی محنت کر رہے ہو۔“ وہ حیرت سے دیکھتی جس پر وہ دھیسے سے مسکرا نے لگا۔
”ہاں! میری والدہ بہت اچھی تھیں۔ اب ہارون نے ہمیشہ میری ہر خواہش کو پورا کیا ہے۔ اب تبسم نے

فرض بنتا ہے کہ میں بھی اپنی والدہ کی اس خواہش کو اس خواب کو پورا کروں اور ایک کامیاب ڈاکٹر بن کر اپنے ماں باپ کا نام روشن کروں۔“ وہ پر عزم انداز میں بول رہا تھا۔ جس پر وہ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔
”ہر انسان کی اپنی لائف ہے.....! اپنی خواہشات اور اپنے مقاصد.....! تو کیا تمہاری اپنی کوئی خواہش نہیں ہے؟“ تبسم نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔
”ایسا نہیں ہے کہ ڈاکٹر بننا صرف میری ماں کا



خواب ہے بلکہ یہ میری بھی خواہش ہے اور میں اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔“ ہارون نے وضاحت سے جواب دیتے ہوئے بنیدہ لب و لہجے میں کہا تو تبسم جھٹ سے بولی۔

”میں کبھی بھی اپنے ماں باپ کی کسی بھی خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنی قربانی نہ دوں۔ ڈاکٹر بنامیری اپنی خواہش ہے اور یہ فیصلہ میں نے خود لیا ہے۔“ وہ اہل لہجے میں خود غرضانہ انداز سے بولی۔ جس پر وہ جھٹ زدہ رہ گیا۔

”تو کیا تمہارے والدین کل کو آسانی کے ساتھ تمہاری شادی میرے ساتھ کرنے پر رضامند ہو جائیں گے؟“ ہارون نے روتے بنیدگی سے پوچھا۔ جس پر وہ زوردار قہقہہ لگا کر ہنسی دہشتہ ہوئے بولی۔

”یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے۔ تمہارا پیئرٹس راضی ہو جائیں گے..... می ڈیڈی بچہ تم ہو میں نہیں ہوں۔“ تبسم نے مسکراتے ہوئے بنیدہ لب و لہجے میں کہا۔

”یہ سچ ہے میری زندگی میں میرے ماں باپ کی بہت اہمیت ہے۔ میری مدر ہمیشہ سے بہت کیرنگ رہی ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا بہت خیال رکھا ہے مگر اب جس ماحول میں میں رہ رہا ہوں میں اس کا بھی عادی ہو رہا ہوں۔ سو میرا خیال ہے کہ مجھے خود پر بھروسہ کرنا چاہیے اور اپنے فیصلے خود لینے چاہیں۔“ وہ کافی کا ایک سپ لیتے ہوئے مسکراتے ہوئے پراعتد لہجے میں بولا۔

”خود اعتمادی واقعی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ میرے پیئرٹس نے ہمیشہ مجھے ایک رویوت کی طرح استعمال کیا۔ مجھے رائٹس تو دیے مگر فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ میں ایک رویوت کی طرح سروائیو کر رہی تھی مگر میرا پورا کنٹرول ان

دونوں کے ہاتھ میں تھا۔ یہ کرو، وہ کرو، یہ سچ ہے، یہ غلط ہے اف مائی گاڈ! ایک عرصہ تو مجھے کچھ سمجھ ہی نہ آیا کہ سچ کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ پھر جب میرے اندر خواہشات نے پچپنا شروع کیا تو مجھ پر میری زندگی کے مقاصد عیاں ہوئے۔ ان سب نے مجھے سچ اور غلط کے چکر سے تو نکال دیا لیکن پھر مجھے ایک سبق بھی سکھا دیا کہ انسان کی زندگی میں سب سے اہم چیز اس کی خواہشات اور اغراض ہوتی ہیں۔ اور ان کو پورا کرنے کے لیے اسے ہر حد کو پار کر جانا چاہیے.....!“ ہارون نے تبسم کی کہی ہوئی باتوں سے متفق ہوتے ہوئے ایک بات بھی اور اپنی بات مکمل ہونے پر متخرا نہ ہوا تو تبسم بھی اس کی بات سن کر مسکرائے گی۔

”آج ہر انسان روپے پیسے کی دوڑ میں شامل ہو کر جہاں اخلاقیات سے گر جاتا ہے وہیں وہ جیتتا ہے بے بہرہ ہو جاتا ہے وہ روپے پیسے کی دوڑ کو مجھے کے لیے اپنے قدموں تلے اپنے ہی رشتوں کو روند ڈالتا ہے۔ اور اسے اس کی پروا بھی نہیں ہوتی۔“ ہارون نے تاسف سے کہا۔ بنیدگی اس کے چہرے سے مائل ہوئی۔

”تو اس میں ہرج مہرج کیا ہے؟ آج کے دور میں جو جیتتا ہے وہی سکندر کہلاتا ہے اور ہیر شتے جن کی تم دہائی دے رہے ہو یہ ہمیشہ اس بھنورے کی مانند چراغ کے گرد منڈلاتے ہیں جو جل رہا ہوتا ہے کبھی بجھتے چراغوں کے گرد تم نے بھنورے دیکھے ہیں.....؟ یقیناً تمہارا جواب نہیں ہوگا۔ بالکل اسی طرح یہ رشتے ہمیشہ چڑھتے سورج کو سلام کرتے ہیں۔ ہارنے والے آسمان سے زمین پر گرنے والے ہمیشہ خالی ہاتھ رہتے ہیں۔ تو پھر عظمتی اسی میں ہے کہ ریس کو جیتنے کی کوشش کی جائے کسی بھی نقصان کی پروا کیے بغیر.....!“ وہ بے اعتنائی برتتے ہوئے مادہ پرست معاشرے کی ایک تلخ حقیقت کو

بیان کر رہی تھی جو یا تو صرف اس کی اپنی سوچ تھی یا پھر معاشرے کا وہ آئینہ جس کا زیادہ تر حصہ اسی سوچ کی عکاسی کر رہا تھا۔ جس کا وہ اس وقت ہارون سے پرچار کر رہی تھی۔

”ہاں.....! تم ٹھیک ہی کہہ رہی ہو..... میں نے بھی اپنی زندگی میں بہت سے رشتوں کو محض دولت، روپیہ، پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم سے منہ موڑتے دیکھا ہے۔ ہماری زندگیوں میں اخلاقیات اور تہذیب کے بجائے صرف روپیہ پیسہ اور اٹینٹس معنی رکھتا ہے۔ جس کے پاس روپیہ پیسہ ہے صرف وہی انسان محبوب ہے اور اخلاقی طور پر میل ملاقات کا جواز رکھتا ہے۔“

ہارون نے استہزائیہ لہجے میں جواب دیا تو تبسم بھی اس بات پر مسکرائے گی۔ دراصل وہ دونوں ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سب سے زیادہ معاشرہ شناس ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

دراصل تبسم اور ہارون نے جس معاشرے میں تربیت حاصل کی تھی وہاں ہر انسان اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوشاں تھا اور اس کے لیے وہ ہر حد کو پار کر جانا چاہتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ جو وہ دونوں مادیت پرستی کا سبق سیکھتے سیکھتے کب مادہ پرست ذہنیت کے مالک ہو گئے۔ اس کا اندازہ انہیں خود بھی نہیں ہوا۔ اسی لیے ایک دوسرے کی قربت ان کے لیے باعث مسرت ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا ہی نہیں چاہتے جو ان کی کم مائیگی کا اعلیٰ ثبوت تھا۔

☆.....☆

تعلیم مکمل ہونے اور ملازمت مل جانے کے بعد دونوں نے شادی کا فیصلہ کیا۔ ذات پات تبسم کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس لحاظ سے وہ خود کو برائڈ مائنڈ سمجھتے تھے۔ لہذا تبسم اور ہارون کے

پیئرٹس نے باہمی رضامندی سے ان کی شادی کروادی۔ شادی کے بعد وہ دونوں ایک خوش حال زندگی گزارنے لگے۔ وہ دونوں الگ الگ جگہوں پر ملازمت کر رہے تھے لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ خوش اور مطمئن تھے۔

وقت گزرتا گیا اور بہت ہی جلد ان کی زندگی نے ایک حسین موڑ لیا اور اب کوئی اور بھی تھا جو ان کی زندگی میں شامل ہونے والا تھا۔

”ہمیں اب الگ گھر میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔“ تبسم نے اچانک ہارون سے کہا۔ یہ بات سن کر پہلے تو وہ چونک گیا پھر مسکراتے ہوئے تبسم کی طرف دیکھتے ہوئے بنیدگی سے بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہاری بات کا.....؟“ ہارون کا انداز سوالیہ تھا اور چہرے پر بنیدگی نمایاں تھی۔

”ہماری فیملی بڑھ رہی ہے اور یقیناً اخراجات میں اضافہ ہو جائے گا۔ سو میں سوچ رہی ہوں کہ ہم اپنے گھر میں شفٹ ہو جائیں جس کے نیچے والے پورشن کو طبیعتاً استعمال کر سکیں کیونکہ صرف ملازمت پر تو اس کے بجٹے جانا کوئی عظمتی نہیں ہے۔“ تبسم نے اپنی بات کو ختم کیا۔ ہارون نے دھیمے سے مسکراتے لگا اور چند ثانیے بعد گویا ہوا۔

”تمہاری بات میں وزن ہے تم ٹھیک کہہ رہی ہو میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔ لیکن ذرا تمہارے بی بی سے فراغت پاؤ تو پھر اس بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔“ ہارون نے تبسم کی بات سے متفق ہوتے ہوئے ایک معقول مشورہ دیا جس پر وہ جھٹ سے بولی۔

”ہمارے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری کوئی گھریلو مسئلہ نہیں ان کا گھر مین سڑک پر ہے۔ انہیں فوری پیسوں کی

ضرورت ہے۔ اس لیے وہ گھر بیچ رہی ہیں۔ دو پورشن بنے ہیں۔ نیچے والے پورشن میں دو کمرے ہیں اور ایک بڑا برآمدہ ہے۔ جب کہ اوپر والے پورشن میں چار کمرے ہیں اور ایک باورچی خانہ ہے۔ گھر کی مالیت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ تبسم نے سنجیدگی سے تفصیل بتائی تو ہارون نے ایک نظر تبسم کی طرف دیکھا اور پھر قدرے سنجیدگی سے پوچھا۔

”کل کتنی مالیت ہے اس گھر کی؟“ انداز سوالیہ تھا۔ جس پر تبسم اس وقت صوفے پر بیٹھی تھی اور قریب ہی بیٹھے ہارون کا ہاتھ تھامتے ہوئے قدرے التجازیہ انداز میں جواب دی۔

”گھر کی مالیت چاہے کتنی کم ہی ہو ہمیں ہر حال میں وہ گھر خریدنا ہے۔ تبسم نے ہارون کے انداز میں ضد کرتے ہوئے کہا تو ہارون نے مسکراتے ہوئے بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے اب فوراً بتاؤ کتنی مالیت ہے؟“ ہارون نے سوالیہ نظروں سے تبسم کی طرف دیکھا۔

”تقریباً پچیس لاکھ مالیت کا گھر ہے۔ میں نے کچھ سیونگ کی ہیں اور کچھ تو تم نے بھی سیونگ ہوگا۔ اور کچھ ہم بینک سے قرض لے لیں گے۔ ان سب کو ملا کر اتنے پیسے تو ہوجائیں گے کہ ہم وہ گھر خرید سکیں۔“ تبسم نے مسکراتے ہوئے تفصیل بتائی۔

”تو ٹھیک ہے ہم وہ گھر لے لیتے ہیں۔ ویسے بھی ابھی فی الحال ہمیں دو کمرے کافی ہیں۔ ایک مردانہ مریضوں کے لیے اور ایک زنانہ مریضوں کے لیے۔ باقی رہا برآمدہ تو اس میں دیوار کھڑی کر کے اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔ اور اسے وینٹگ ایریا بنالیں گے۔ کمرے کے ایک طرف ایک بیڈرہیں گے ڈریس وغیرہ لگانے کے لیے اور

اگر بعد میں آمدنی بڑھ گئی تو ہم کسی اور جگہ شفٹ ہو جائیں گے اور اس بلاڈنگ کو ہسپتال بنالیں گے۔ ویسے بھی یہ جگہ مین سڑک پر ہے جو ہمارے لیے بہت سودمند ہے۔“ ہارون کو سب کچھ معقول لگا تو وہ اگلا لائحہ عمل بنانے لگا۔ وہ دونوں پر جوش انداز میں مستقبل کی پلاننگ کرنے لگے اور یوں چند ہی دنوں میں وہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے۔

نیچے والے پورشن میں انہوں نے اپنا کلینک کھول لیا۔ شروع شروع میں یوں ڈرائنگ کی تھی تبسم کے حوصلے نے ہارون کو ثابت قدم رکھا اور بہت ہی جلد میڈیکل ریپ مختلف کمپنیوں کی آفرز لانے لگے۔ تبسم اور ہارون کا مشترکہ خیال تھا کہ مہنگی ادویات جتنی زیادہ فروخت ہوں گی۔ کمیشن بھی اتنا ہی زیادہ ملے گا اور یقیناً ایسا ہی ہوا۔ بہت ہی جلد دولت کی ریل پیل ہو گئی۔ پھر بینک سے لیا ہوا قرض بھی ادا کر دیا گیا۔ امریکہ میں ٹریڈنگ، گاڑی، بنگلہ سب کچھ دھیرے دھیرے مل گیا۔ تبسم اور ہارون نے جیسے بچا ہوا انہیں اس سے بھی زیادہ مل گیا تھا۔ وہ دونوں کے ہونے اور مطمئن تھے۔

زندگی بہت جلد ان کے لیے آسان کو اس زندگی میں جو پل نصیب ہوتے ہیں انہیں بھرپور انداز میں جینا اصل زندگی ہے لیکن تبسم اور ہارون شادی کے پانچ سال گزرنے کے بعد ایک بیٹا اور ایک بیٹی کی رحمت سے سرفراز ہونے کے باوجود بھی زندگی کی ان خوب صورتیوں کو جینے کی بجائے اپنی الگ دنیا بنانے میں مگن تھے۔ تبسم نے ہارون کے والدین کی سرپرستی میں دونوں بچوں کو دے دیا کیونکہ تبسم کے لیے ابھی بچے پالنے سے زیادہ اپنے کیریئر پر فوکس کرنا ضروری تھا۔ ہارون کے والدین بوڑھے ہو چکے تھے اور ہر وقت بچوں کا خیال رکھنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ لہذا انہوں نے بچوں کی دیکھ بھال

کے لیے ایک بوہ خاتون کو گھر پر رکھ لیا۔ جو ہر وقت بچوں کے ساتھ رہتی۔ مہینے میں دو بار تبسم اور ہارون گھر آتے اور بچوں سے مل کر چلے جاتے۔ آج بھی ہارون اور تبسم گھر آئے۔ کھانا کھانے کے بعد سب ٹی وی لاؤنج میں چائے پی رہے تھے۔ جب ہارون کی والدہ پر شکوہ انداز میں گویا ہوئیں۔

”ہارون! ہم تمہارے ماں باپ ہیں اور یہ دونوں بچے تمہارے جگر گوشے ہیں۔ تم دونوں ہر وقت اپنے ہسپتال کو پروان چڑھانے میں اس قدر مصروف رہتے ہو کہ تمہارے پاس ہمارے لیے اور اپنے بچوں کے لیے کچھ اسامی بھی وقت نہیں ہے۔“ والدہ نے زنجبیل لپ لپ لہجہ سے شکوہ کیا۔ یہ بات سن کر تبسم آگ بھڑکی اور چائے کی پیالی زور سے ٹیبل پر رکھتے ہوئے کمرے سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئی۔ تبسم کی یہ حرکت والدین کے پیرئس کو بہت ناگوار گزری جب کہ ہارون اس سے باز و پھیلا کر انگڑائی لی اور مسکراتے ہوئے بے سانداز انداز میں بولا۔

”ابھی وقت نہیں ہے ہمارے پاس! میں نے اور تبسم نے اپنے ہسپتال کو لے کر کچھ خواب دیکھے ہیں۔ پہلے وہ خواب پورے ہو جائیں پھر تو ہمارے پاس وقت ہی وقت ہوگا اور ویسے بھی ہم یہ سب کچھ اپنے بچوں کے لیے ہی تو کر رہے ہیں۔“ ہارون نے ایک معقول سی دلیل دی۔ جس پر ہارون کے والد خنکی سے اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جب کہ والدہ بیٹے کو سمجھاتے ہوئے پیار سے بولیں۔

”زندگی میں صرف پیسہ کمانا ہی تو اہمیت نہیں رکھتا بیٹا! ضروری ہے تو صرف تمہارے بچے اور ان بچوں کو صرف تمہارا اور تبسم کا پیار چاہیے۔ تم دونوں کی توجہ اور محبت ہی صرف انہیں بہترین انسان بنا سکتی ہے۔ انہیں اپنی محبت کا احساس دلاؤ ورنہ یہ

جذباتی طور پر تم دونوں سے بہت دور ہو جائیں گے۔“ ماں نے محبت بھری نظروں سے ہارون کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی پشت تھپتھپائی اور اسے حقیقت کا دوسرا رخ دکھانا چاہا۔ جسے وہ یکسر انداز کر رہا تھا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اور تبسم کوشش کریں گے اور ویسے بھی آپ اور ابا ہیں نا ان بچوں سے پیار کرنے والے۔ مجھے یقین ہے آپ دونوں سے زیادہ کوئی بھی بچوں سے اس قدر محبت نہیں کر سکتا۔ ہمارے بچے تو خوش نصیب ہیں جو آپ جیسے دادا دادی موجود ہیں انہیں محبت دینے کے لیے۔“ ہارون نے ماں کا ہاتھ جو ماں اور اپنی کچھ دار باتوں سے بات کا رخ کسی دوسری جانب کر دیا اور اپنے ہسپتال کی تعمیرات کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ اور ہارون کی والدہ بھی مکمل توجہ سے بیٹے کی باتیں سننے میں مشغول ہو گئیں۔

☆.....☆

یہ شیراز صاحب؟ کیا آپ کو اتنی فیس اس لیے مل رہی ہے کہ بچوں کا زلٹ یوں آئے۔“ ہارون نے جیجی پر ہاتھ۔ جب کہ شیراز صاحب جو بچوں کے بڑے سر جھکائے خاموشی سے بیٹھے تھے پھر انہوں نے اپنا سر اٹھایا اور وضاحت دیتے ہوئے بولے۔

”سر میں معذرت کرتا ہوں۔ آج کل میرے گھر کا بڑا مسئلہ چل رہا ہے۔ میں اور میری فیملی کرائے کے مکان میں رہتے ہیں اور مکان مالک مکان خالی کروانے پر بضد ہے جب کہ ہمارے پاس کوئی دوسرا متبادل گھر نہیں ہے۔ بس اسی پریشانی میں، میں بچوں پر زیادہ دھیان نہیں دے سکا۔“ شرمندگی شیراز صاحب کے لب و لہجہ سے بھی عیاں ہو رہی تھی۔ جس پر ہارون اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے نہایت گل سے بولا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں آپ کا یہ مسئلہ حل کر دیتا ہوں! آپ کے لیے ایک مستقل گھر کا بندوبست ہو جائے گا مگر میرے بچوں پر آپ کو پورا دھیان دینا ہوگا اور جس دن میرے دونوں بچوں کا ایڈمشن میڈیکل کالج میں ہو جائے گا میں بذات خود آپ کو ڈیپنس میں گھر خرید کر بطور انعام دوں گا۔“ ہارون نے مسکراتے ہوئے شیراز صاحب کو ایک معقول پیشکش کی اور شیراز صاحب ہارون کو اس بات کی یقین دہانی کروانے لگے کہ آج سے وہ بچوں پر بھرپور توجہ دیں گے۔ دوسری جانب الشبہ اور حارث اخلاقی اور جذباتی طور پر بے حد گزور ہو گئے تھے۔ وہ جو دیکھ رہے تھے وہ سنا سکیں گے تھے۔

☆.....☆
”الشبہ ماما بابا ہم سے محبت نہیں کرتے؟“ حارث غصیلے انداز میں حسرت سے بولا۔
”ہاں! انہیں تو صرف اپنے اس ہسپتال سے محبت ہے ہم تو کو جیسے ان کے لیے کوئی غیر ضروری چیزیں ہیں۔“ وہ غصہ سے غصہ آمیز انداز میں بولی۔
”نہیں دادا کی جان! ماما بابا آپ دونوں سے بے حد محبت کرتے ہی وہ سب کچھ آپ کے بہتر مستقبل کے لیے کر رہے ہیں۔“ دادا نے ان دونوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انہیں سمجھانا چاہا۔
”نہیں وہ بالکل بھی ہم سے محبت نہیں کرتے۔ آپ کو پتہ ہے آج انہوں نے ٹیوٹر انکل کو بھی خرید لیا ہے۔ جیسے پہلے انہوں نے گل آیا کو خریدا تھا اور ڈرائیور انکل کو خریدا تھا ہمارے لیے۔ کیوں انہیں احساس نہیں ہوتا کہ ہمیں بس ان دونوں کی ضرورت ہے۔“ حارث کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ آئے جس پر دادی نے اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ جب کہ الشبہ کے پوچھے گئے سوال نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔
”کیا آپ دونوں ہمارے بابا کو وقت دیتے

تھے؟ ان سے محبت کرتے تھے؟“ معصومانہ انداز میں پوچھے گئے سوال نے جہاں ان دونوں کو حیرت میں مبتلا کر دیا وہیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا کہ بچوں کے معصوم ذہنوں میں کیسے کیسے سوال پروان چڑھ رہے ہیں۔ بے شک بچے جو دیکھتے ہیں۔ ان کی سوچ کے زینے ویسے ہی پروان چڑھتے جاتے ہیں۔ جس میں وہ آگے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ پھر وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے۔ یہ ہی وقت کا قانون ہے اور یہ ہی زندگی کی حقیقت.....!

”ہمارا تو سارا وقت تمہارے بابا ہارون کے لیے ہی تھا۔ بلکہ ہماری زندگی تو صرف ہارون کے گرد ہی گھومتی تھی۔“ نہ جانے کب ہنسنے لگے دادی کی آنکھوں میں سے آنسو چھلکنے لگے اور ماضی کے کچھ جھروکے آنکھوں کے سامنے آ گئے۔

”آپ تو بابا کا بے حد خیال رکھتے تھے اور ان سے محبت بیکار کرتے تھے جب کہ ہمارے ماما بابا کو کبھی غصہ نہ تھا۔“ الشبہ نے کہا۔
”نہیں اگر محبت ہے تو صرف پیار سے ہے۔“

الشبہ دادی کے آنسو پیچھے ہونے اپنے اخذ کردہ نتیجہ پر خود ہی بخن ہوئی۔ جب کہ دادا دادی وہ تو صرف حارث اور الشبہ کے غم کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں کوئی جواب دے سکے۔

☆.....☆
”میرا خیال ہے ہمیں بچوں کو ہاسٹل بھجوا دینا چاہیے۔ کب تک وہ تمہارے ماں باپ کی سرپرستی میں رہیں گے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خود پر اعتماد کرنا سیکھیں اور یہ سب کچھ وہ صرف ہاسٹل جا کر ہی سیکھ سکتے ہیں۔“ تبسم اور ہارون جو اس وقت پکینگ کرنے میں مصروف تھے۔ انہیں ایک کورس کے سلسلے میں یو ایس اے جانا پڑ رہا تھا۔ تبسم جو ہر مسئلہ کا فوری حل نکالنے میں مہارت رکھتی تھی بے دھڑک انداز میں گویا ہوئی۔ اس بات کی پروا کیے

بغیر کہ ان کے اس فیصلے کا بچوں پر کیا اثر ہوگا۔
”ٹھیک ہے، پہلی فرصت میں ہی یہ کام ہو جائے گا۔“ ہارون نے تبسم کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے حامی بھر لی۔
”ہرگز نہیں! ہم کبھی بھی ہاسٹل نہیں جائیں گے۔“ حارث اور الشبہ اپنے دادا دادی کی محبت سے دستبردار ہونے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھے۔ جب کہ والدین بغض تھے انہیں ہاسٹل بھجوانے کے لیے۔

”آپ کے دادا دادی اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور کمزور ہیں۔ وہ زیادہ دیر تک آپ کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ تبسم نے دونوں بچوں کو پیار سے سمجھانا چاہا۔

”ہماری دیکھ بھال کے لیے کل آیا موجود ہے جو آپ دونوں کی کی پوری کر رہی ہے۔“ تبسم نے غصہ آمیز نگاہوں سے تبسم کی طرف دیکھا۔
”گفتگو کے آداب سیکھو! یہ بدتمیزی کس کے سکھائی ہے تمہیں؟“ تبسم نے غصہ سے اسے ڈبکا پھر کچھ توقف کے بعد اپنے غصہ پر قابو پاتے ہوئے نہایت حل سے بولی۔

”بیٹا! میں اور تمہارے بابا صرف تم دونوں کے بہتر مستقبل کے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہے ہیں۔“ تبسم نے ان دونوں کو سمجھانا چاہا۔

”ایسی زندگی ہمیں نہیں چاہیے جس میں آپ دونوں کی محبت اور شفقت نہ ہو۔“ اس بار حارث رنجیدہ انداز میں جھٹ سے بولا۔

”محبت صرف باتیں بنانے یا بچوں کا منہ چوم لینے سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ بچوں کی تمام ضروریات کو بہتر انداز میں پورا کرنے میں ہی یہ محبت جیسے فضول جذبات پوشیدہ ہوتے ہیں۔“ ہارون نے کبھی نگاہوں سے دونوں بچوں کی طرف دیکھا اور ان کو سمجھانے کی کوشش کرنا چاہی، جو کسی

حد تک کارآمد ثابت ہوئی۔
”ٹھیک ہے اگر آپ دونوں یہ ہی چاہتے ہیں تو ہم ہاسٹل جانے کے لیے تیار ہیں۔“ حارث اور الشبہ نے غصہ سے ماں باپ کے اس بے حس فیصلے کو بھی منظور کر لیا اور پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔ تبسم اور ہارون وہ کسی درجہ مطمئن ہو گئے۔ انہیں یہ گمان تھا کہ ابھی حارث اور الشبہ بچے ہیں۔ جب بڑے ہو جائیں گے تو سب سمجھ جائیں گے۔ وقت کا قانون ہے وہ چلتا رہتا ہے۔ تبسم بھی رکتا نہیں ہے۔ حارث اور الشبہ ہاسٹل چلے گئے۔ ہارون اور تبسم نے انہیں ہاسٹل میں بھی فائینو اسٹار سہولتیں میسر کر دیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ دونوں جیسے جیسے زندگی کی منزل طے کرتے چلے گئے اپنے والدین سے اور ہر رشتے سے بے نیاز ہوتے چلے گئے۔ پھر ٹیوٹر کی محنت رنگ لائی اور ان دونوں نے ٹاپ کیا۔ شہر کے سب بڑے میڈیکل انسٹیٹیوٹ میں ان دونوں کا ایڈمشن ہو گیا۔ تبسم اور ہارون نے سکھ کا سانس لیا۔ لیکن انہیں انداز نہیں تھا کہ یہ سکھ کا سانس انہیں بہت بڑے دکھ کے لیے جسے نئے والا ہے۔ وقت کی یہ ہی تو خوبی ہوتی ہے جب انسان کو پھسل جاتا ہے تب پتہ چلتا ہے کیا کھویا اور کیا پایا۔
تبسم اور ہارون نے بینک میں دونوں بچوں کے نام سے الگ الگ اکاؤنٹ کھلوائے جہاں ماہانہ لاکھوں کے حساب سے پیسے بھجوائے جاتے اور اے ٹی ایم مشین ان کی ہر ضرورت کو پورا کرتی رہتی۔ وہ خواہشات اور اغراض کو زندگی کا مقصد سمجھنے لگے۔ رشتوں کو محض سیر و تفریح کا ذریعہ دولت کا احساس انہیں خوشی دینے لگا اور رشتوں سے انہیں کوفت ہونے لگی۔
”یار! تم دونوں کی تو بڑی موج ہے۔“ حارث کے ایک دوست نے انتہائی خوش گوار انداز میں

کہا۔ جس پر حارث بے اعتنائی سے گویا ہوا۔
 ”یہ ہی تو ہمارے پیئرٹس کا پیار ہے اور ایسی
 محبت سب بچوں کو نصیب نہیں ہوتی۔“ حارث کا
 انداز تسخیرانہ تھا جس پر الشبہ جھٹ سے بولی۔
 ”ہاں مگر ایسی محبت کی قیمت چکانا پڑتی ہے اور
 یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔“ الشبہ کے ماتھے
 پر چند ناگوار شکلیں نمایاں ہوئیں۔ جنہیں اس کی
 کلاس فیلو نازیہ نے فوراً دیکھتے ہوئے حیرت سے
 پوچھا۔

”کیا مطلب ہے تمہاری بات کا؟“ انداز
 سوالیہ تھا اور لہجہ تجرّ آئینہ۔
 ”چھوڑو مطلب وہ بھی باتوں کا کوئی مطلب
 نہیں ہوتا۔“ الشبہ نے بے گناہ اور تھوڑی دیر بعد
 بولی۔

”چلو اس بار ویک اینڈ پر کہیں باہر چلتے ہیں۔“
 الشبہ نے بات ٹالنے کی جو کوشش کی تھی اس میں
 کامیاب بھی ہو گئی۔
 ”ہاں ٹھیک ہے۔ ویسے بھی پھر آخری سیمسٹر
 شروع ہو جائے گا اور سب دوست امتحان کی تیاری
 میں جت جائیں گے۔“ حارث نے پر جوش انداز
 میں کہا اور پھر وہ سب ویک اینڈ منانے کے لیے
 پروگرام بنانے لگے۔

☆.....☆

ویک اینڈ کو پھر پورا انداز میں انجوائے کرنے
 کے بعد جب آخری سیمسٹر کی ڈیس انوائس ہوئیں
 تو سب دوست امتحانات کی تیاریوں میں مصروف
 ہو گئے۔ تبسم اور ہارون بھی دونوں بچوں کو یوں لگن
 سے پڑھتا دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔
 ”بچوں کو یوں پڑھتا دیکھ کر مجھے تو اپنا زمانہ یاد
 آ گیا ہے۔“ تبسم نے مسکرا کر کہا۔ ہارون جو اس
 وقت چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا تبسم کی بات
 سن کر دھیسے سے مسکرانے لگا اور پھر گویا ہوا۔

”ہاں شکر ہے ہمارے دونوں بچے بہت محنتی
 ہیں۔“ ہارون تشکر آمیز انداز میں بولا۔
 ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر اس کامیابی میں بچوں
 کے ٹیوٹر کا بہت بڑا کردار ہے۔“ تبسم نے تشکر انداز
 میں کہا تو ہارون نے چائے کی پیالی میز پر رکھتے
 ہوئے تبسم کی طرف دیکھا پھر بولا۔
 ”یہ سب محنت اس ٹیوٹر نے پانچ مرلے مکان
 حاصل کرنے کے لیے کی ہے اور دیکھو میں نے بھی
 اپنا وعدہ پورا کیا۔ اسے مکان خرید کر دے دیا اسی
 لیے آج کل وہ بے حد خوش ہے۔“ ہارون نے
 تفصیل بتائی جس پر تبسم نے ایک سرد آہ بھری۔
 ”کسی نے سچ کہا ہے دولت اگر پاس ہو تو
 انسان سب کچھ خرید سکتا ہے۔“ تبسم کے چہرے پر
 مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس پر ہارون بھی مسکرانے
 لگا۔

”مگر یہ دولت، یہ روپیہ پیسہ ہم دونوں نے
 جس محنت اور مشقت سے حاصل کیا ہے۔ اس بات
 کو بھولنا آسان نہیں کرنا چاہیے۔“ ہارون نے سنجیدہ
 لہجے میں کہا۔ تبسم اور ہارون اس دولت اور اس
 روپے پیسے کی تلاش کی حاصل سمجھ رہے تھے۔
 لیکن اس حاصل کی کتنی کچھ خالی پن تھا۔ جس کا
 اندازہ شاید انہیں ابھی نہیں تھا۔

☆.....☆

زندگی کے سفر نے ایک نیا موڑ لیا۔ حارث اور
 الشبہ بطور ڈاکٹر مقامی ہسپتال میں کام کرنے لگے۔
 تبسم اور ہارون نے دونوں بچوں کی پسند اور خواہش
 کے مطابق دھوم دھام سے ان کی شادی کروادی۔
 پھر اچانک ہارون کے والدین کی روڈ ایکسیڈنٹ
 میں ہونے والی ڈیڑھ گھنٹہ نے انہیں دم بخود کر دیا۔ اور
 وہ کئی دنوں تک اس حقیقت قبول نہ کر سکے۔
 جوانی کی تو انائیاں جب بڑھاپے کی کمزوریوں
 میں بدلنے لگیں۔ تو تبسم اور ہارون نے ریٹائرمنٹ

کا فیصلہ کر لیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد تبسم اور ہارون
 نے اپنا ذاتی ہسپتال اپنے دونوں بچوں کے حوالے
 کر دیا۔ حارث اور الشبہ جنہیں ان کے پیئرٹس نے
 ہمیشہ اس ہسپتال کی وجہ سے ہمیشہ ان گنور کیا۔ سوائے
 معاملات سنبھالنے کے وہ اس ہسپتال سے کوئی
 سروکار نہیں رکھنا چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے ایک
 نوجوان ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر کو ہائر کر لیا۔ پھر تمام
 کام ویسے ہی چلنے لگے جیسے ہارون اور تبسم کی
 سرپرستی میں چل رہے تھے۔

اب زندگی نے وہ وقت دکھایا تھا جب بوڑھے
 جسموں میں ایک بچے کی اطوار نے پینا شروع کر
 دیا تھا۔ اپنے اعمال کی وہ فصل جسے انہوں نے
 خوب محنت سے محبت سے بے سیتھا تھا اسے کاٹنے کا
 وقت آ گیا تھا مگر وہ اس فصل کاٹنے کے لیے ہرگز
 بھی تیار نہیں تھے لیکن فصل تو کاٹنی ہی پڑتی تھی۔

”حارث بیٹا! آؤ ہمارے پاس بیٹھ۔“
 کھانا ساتھ کھاتے ہیں۔“ ہارون نے مصروف
 انداز میں حارث سے کہا جو کوئی فائل ہاتھ میں
 تھا بے سیرھیوں سے اتار رہا تھا۔
 ”آپ نے بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا
 کھایا؟ جو میں کھاؤں!“ حارث نے تفرّ آمیز انداز
 میں طنز کا وہ نشتر چلایا جو ہارون اور تبسم کے وجود کو
 چھلنی کر گیا۔

”میرے پاس ویسے ہی وقت نہیں ہے۔
 میری ایک اہم میٹنگ ہے اور آج میری ٹائیٹ
 ڈیوٹی بھی ہے۔“ حارث ایک نظر غلط باپ پر
 ڈالتے ہوئے نغوت سے بولا۔
 ”ہمارے پاس اب سب کچھ ہے بیٹا! تمہیں
 اور الشبہ کو زیادہ محنت کرنے کی ضرورت نہیں
 ہے۔“ ہارون نے حارث کو سمجھانا چاہا مگر وہ تو وقت
 کے سارے سبق پہلے ہی سکھ چکا تھا۔ اسے کوفت
 ہونے لگی۔ سو وہ حقارت سے گویا ہوا۔

”آپ نے جو روپیہ پیسہ کمایا ہے وہ نا کافنی
 ہے ہمارے لیے اور اب تو آپ دونوں بھی ناکارہ
 ہو گئے ہیں اور گھر بیٹھ گئے ہیں۔ آپ کا بوجھ بھی تو
 ہم دونوں نے اٹھانا ہے اور ویسے بھی آپ ہی تو
 کہتے تھے جوانی میں کام کر لیں تو بڑھاپا سکون سے
 گزرتا ہے۔“ حارث نے نفرت کی آخری حد کو پار
 کر دیا۔ اس کے لہجے میں پوشیدہ حقارت کو بھانپ
 کر تبسم نے غصہ سے بیٹے کو ڈنٹا اور گویا ہوئی۔

”صاف صاف بولو! تم ہمارے پاس بیٹھنا ہی
 نہیں چاہتے کھانا کھانا تو دور کی بات ہے۔“
 حارث نے غصہ سے ماں کی طرف دیکھا۔ کبھی
 الشبہ پہرونی دروازہ کھول کر اندر آئی اور حارث کو
 یوں ٹی وی لائونج میں ماما بابا کے پاس کھڑا دیکھ کر
 غصہ سے چلائی۔

”حارث تم یہاں پر کھڑے اپنا وقت کیوں
 ضائع کر رہے ہو۔ چلو فوراً جاؤ ہسپتال۔ وہاں سب
 تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ الشبہ نے ہاتھ کا اشارہ
 کرتے ہوئے اسے فوراً جانے کا کہا تو وہ خاموشی
 سے وہاں سے چلا گیا۔

”او! ابھی تو بھلا تمہاری ملازمت کیسی
 چل رہی ہے؟ اور تمہیں کس شے کا شک ہے؟“ ہارون
 کے لہجے میں بیٹی کے لیے بے پناہ حسرت تھی۔ اس
 لیے اس کے اچانک آنے پر انہوں نے سوالوں کی
 بوچھاڑ کر دی۔ جب کہ الشبہ نے ان سارے
 سوالوں کو ان گنور کرتے ہوئے ماں باپ دونوں سے
 سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”آپ نے کھانا کھایا ہے؟“ الشبہ کے لہجے
 سے بے اعتنائی چھلک رہی تھی۔
 ”ہاں! کھانا تو کل آیا نے ہمیں کھلا دیا ہے۔“
 تبسم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ان دونوں کو ایک
 لمحے کے لیے یہ گمان ہوا کہ بیٹے کو نہ سہی ہماری بیٹی
 کو تو ہمارا خیال ہے مگر ان کی یہ خوش فہمی زیادہ دیر

سر نہ کھجائیں! Healthy ہو جائیں!..

English



پورا خیال رکھیں۔ آپ کی ہر ضرورت کو پورا کریں۔ اور یہ ہی ہمارا پیار ہوگا آپ کے لیے۔“ الشبہ کے چہرے پر نفرت اور لہجہ میں بے پروائی نمایاں تھی۔ جیسے الشبہ کے سارے احساسات سرد ہو گئے تھے۔ پھر وہ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ سے بولنے لگی۔

”وقت دینا اور آپ کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنا یہ سب ہمارے لیے ایک فضول کام ہے۔ یہ سب صرف وقت کا ضیاع ہے۔ آپ دونوں کو تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم نے آپ کو اولڈ ہوم میں نہیں بھجوا دیا۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ نے ہمیں خود سے دور کر دیا تھا اور ہاسٹل بھجوا دیا تھا۔

ہارون اور تبسم نے ایک نظر اٹھا کر بیٹی کی طرف دیکھا جو انہیں شرمندگی کی سیڑھیوں سے دھکا دے کر ندامت کے کھڈے میں پھینک چکی تھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو نیل بجا دیجیے گا۔ ایا آپ کی اور آپ کی ہر ضرورت کو پورا کر دے گی۔“ وہ بولنے ہی جیسے وہ ہماری ضرورتوں کو پورا کرتی تھی۔ الشبہ کھٹ کھٹ لہجے میں کہتے ہوئے صوفے سے اٹھی اور انہی گئی میڈھی کی سینڈل سے کھٹ کھٹ کرتی ہوئی پھر دروازے کو پار کر گئی۔ لیکن تبسم اور ہارون کو پشیمانیوں کے گورکھ اندھیروں میں دھکا دے گئی۔ تاکہ وہ صدا پیچھتاؤں کی آگ میں جھلتے رہیں۔

دولت اور مادیت پرستی نے انہیں شاید سب کچھ تو دے دیا تھا مگر پھر بھی وہ خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ اعمال کی فصل کٹ چکی تھی مگر ان دونوں کا دامن خالی تھا۔ جس کے احساس نے انہیں آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں میں پٹخ دیا تھا۔

رہنے والی نہ تھی۔ ”اچھا تو گل آیا نے آپ کو دوا بھی کھلا دی ہوگی۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو گل آیا سے کہہ دیجیے گا۔ آپ تک وہ چیز پہنچ جائے گی۔“ الشبہ نے انتہائی کرخت لہجے میں بے اعتنائی برتتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے کی اس گئی کو ہارون اور تبسم اگنور کر رہے تھے یا پھر جان بوجھ کر سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

”ہمیں تمہاری اور حارث کی محبت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ تبسم نے نہایت آہستگی اور حلاوت آمیز انداز سے کہا۔ الشبہ کے چہرے پر تمسخر چمکا اور وہ کسی انیم برلی طرح بھٹ پڑی۔ ”آپ نے ہم پر پچھلے خراج کیا۔ ہماری ہر ضرورت کو پورا کیا، ہمیں ہر طرح کا آرام سکون اور آسائش مہیا کرتے رہے اور آپ کے ہونٹ سنبھال رہے ہیں۔ آپ کا پیار تھا۔ ہم نے جیسے ہی ہونٹ سنبھالیں سبقت تو سیکھا ہے مگر حارث اور میں ہمیشہ اس محبت اور شفقت کی حسرت میں جلتے رہے ہیں۔ جو دوسرے بچوں کے والدین انہیں دیتے تھے۔“ ہارون اور تبسم خاموشی سے بے سدد ہو کر بیٹھے تھے۔ الشبہ کے نخوت سے بھرے الفاظ کو سن رہے تھے۔ جب کہ الشبہ وہ تو اپنے دل کی بھڑاس نکال رہی تھی جو جانے کب سے وہ اپنے اندر دبا بیٹھی تھی۔

”آپ نے ہمارا خیال رکھا اس کے لیے میں اور حارث آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔ آپ نے ہماری ہر آسائش کا خیال رکھا۔ ہماری ہر ضرورت کو پورا کیا۔ مگر محبت، توجہ اور شفقت سے ہمیشہ محروم رکھا۔“ وہ نہایت گل سے بول رہی تھی۔ جب کہ وہ دونوں بت بے بیٹھے ماضی کے جھروکوں کی یاد میں کھونے لگے۔

”اب ہمارا بھی فرض ہے ہم آپ کی صحت کا

فہرہ افروز

سے پہلے نہیں تھا شادی کے بعد دنیا کا کوئی ایسا
اعتراض نہیں تھا جو ان دونوں کو ناہوتا۔

”یہ ہوتی ہے کون آپ پر حق جمانے والی بی
جہال پینڈو پینڈو پہننے تک کی تیر نہیں ہے اس کو گوشت کا
پھاڑ میں تو اس سے بات نہیں کرتی زیادہ کان کے
پردے بہت عزیز ہیں مجھے ایسے چنگھاڑتی ہے الامان!
حلیہ دیکھیں آپ کی نانی لگتی ہے موٹو“۔ یہ ساری
داستان میں آنسو ماہ نور اسلم کے لبوں سے دن میں کئی
بار سنتا تھا، میرے نازک سے کانوں کے پردے بھٹنے
کو تھے اس کی باریک جھپک جھپک سے۔ وہ صرف
مجھے نہیں سارے محلے کو سناتی تھی۔

”کلمو ہی اس میں ہے کیا جس پر یہ اکڑتی ہے
ہانس کی پیداوار بلکہ کانے کی اس سوچی سزی کو دو
لگا دیں ناں میں نے تو چار دن ہوش نہیں آنا اسے
میرے سے پنگا لیتی ہے سوچی بری جیسی شکل ہے اس
کی“۔ میرے کان کا پردہ پھٹ ہی جاتا اس سے بات
کر کے چھ مہرے کے میرے گھر میں دیوار بھی کھڑی
ہو گئی ان کی وجہ سے۔

☆☆☆☆

دیوار ہو گئی تو بھی مشکل دونوں کے پیٹ میں درد
شروع۔

”ادھر گیا ہے پتہ نہیں کیا پٹیاں پڑھا رہی ہوگی
اسے موٹی سوچی پتہ نہیں کیا کیا بوا اس کر رہی ہوگی
ذرا جھانکوں تو سہی“۔ یہ دونوں سوچتی تھیں اسی تا کا

اب اسے پہلے ہی بات ہو گئی تھی۔

”ایک آپ کی پسند کی ایک میری پسند کی“۔ ابا
بھلے مانس تھے یا پھر شاید انہیں اپنے بھلے مانس بیٹے پر
اعتبار بہت تھا ڈیل ڈن ہو گئی اپنی پسند سے باندھ
دیا میرا رشتہ اپنے دوست کی بیٹی رضیہ سلطانہ سے
کیا بتاؤں رضیہ سلطانہ کی بابت رنگیلی چلبلی، نخریلی
بھی اور ہاں بھڑکیلی میرے سامنے خواتواہ کی
شرابی ویسے نظر لی، بشیرانی حیداس کی بھجولی ہاں
ہاں بنالیں ذہن میں ایک مجسم صورت اونچی لمبی
گوری چٹی بڑے بڑے نین نقش گہرا پیلا اور سچ
لباس بڑے بڑے آویزے چوڑیاں کوچی رضیہ
سلطانہ تیار۔

میں نے اپنی شرط اس کے گوش گزار بھی کر دی تھی
جس پر اسے رتی بھر بھی اعتراض نہیں تھا شاید اسے
بھی میرے بیباک ہونے پر یقین تھا ویسے میں اتنا
بھی سیدھا نہیں تھا دوسری تھی واقعی۔ ماہ نور اسلم
میرے کلچ کی فرینڈ میری محبت شہری لڑکی
کافیڈنٹ سبھی ہوئی سادہ سی سوہری رضیہ سلطانہ
کے بالکل الٹ وہ بھی میری پسند اور میں اس کی بھی تو
دو والی شرط پر اسے بھی اعتراض نہیں تھا۔ دولہا دلہن
راضی تو پھر کیا کرتا قاضی چھ دفعہ قبول ہے قبول ہے۔
تو یہ آغاز تھا اسی قصے کا کہتے ہیں شادی کا لٹو جو
کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نا کھائے وہ بھی میں
نے تو دوبار کھایا شوگر ہو گئی اعتراض دونوں کو شادی



جھانکی میں اتنے بڑے بڑے سوراخ کر لئے انہوں نے پلستر والی دیوار میں آندھی کے موسم میں دیوار اتنی کمزور ہو چکی تھی کہ دھڑام! خس کم جہاں پاک۔

☆☆☆☆

اور میرا گھر شاید وہ واحد گھر ہے جس میں سارے فساد کام کرنے پر اٹھتے ہیں کھانا پکانا، میں کروں گی، نہیں میں کروں گی، نہیں میں دھونا دھلاتا میں، نہیں میں فلاں کام میں، نہیں میں۔ ہر وقت میں میں ہوتی رہتی ہے، دیسی کھانوں کی شوقین رضیہ سلطانہ اور مغربی پکوانوں کی رسیا ماہ نور اور میں بدقسمی کے کہتے ہیں اس موضوع پر میں کئی ہزار کتابیں لکھ سکتا ہوں اپنی دونوں بیویوں کا دل رکھنے کی خاطر نجانے کیسی کیسی خرافات و شُرک کھا چکا ہوں میں، جیسے شوار مالا ساگ، قیر کرینے کا نوڈلز، لڈو پلس چائیز سوپ، ایسے ہر وقت کے دنگے فساد سے بچنے کے لئے میں نے ماہ نور کو کئی دفعہ جاب پر اکسایا، شادی سے پہلے میڈیسن کا پروفیشن اس کا پٹیشن ہوا کرتا تھا پر اب اس کا پروفیشن اور پٹیشن بس ایک ہی ہے، سوتن کو نیچا دکھانا۔ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ لسانی جنگ، لٹھوں میں جسمانی ہوجاتی ہے، بلا جھجک ایک دوسرے پر کپ، پلیٹ، پھونکی، اچھال دی جاتی ہے پھر وہ غدر چتا ہے کہ الامان، میرے محلے میں اب ریلنگ لٹی وی پر نہیں دیکھتے، ان کے لئے ان کے محلے میں جولا نیو شوکا بندوبست ہو چکا ہے اور وہ بھی بالکل مفت! انا ہوتی بیویاں تو کیا ہوتا؟

☆☆☆☆

شادی کے اڑھائی سال بعد رضیہ سلطانہ کو پتہ چلا کہ وہ ہمیشہ کے لئے باجھ ہے وہ بھی ماں نہیں بن سکے گی ایسی چپ لگی کہ میں کیا بتاؤں کلینک سے گھر تک وہ بمشکل آتی میں نے راستے میں کئی دفعہ بلانے

کی کوشش کی بھی پر نہیں چپ۔ اور ویسی خاموشی، ویسا سنا میرے گھر میں بھی چھپا رہا۔

☆☆☆☆

خدا جانے وہ کونسا ڈرتا تھا جواگلے ہی روز ماہ نور کو اسپتال لے گیا اندیشہ حقیقت کا روپ دھار گئے، وہ بھی وہی تھی اپنی سوتن کی طرح، کہتے ہیں عورت کائنات کی سب سے مشکل پہیلی ہے ایک ایسی واحد پہیلی جس کا کوئی جواب نہیں یا شاید جس کا کوئی ایک جواب نہیں، صبح میں کچھ اور دوپہر میں کچھ اور ایک دوسرے کو کاٹ کھانے والی وہ دونوں عورتیں اس دن ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر روئی تھیں، میں نے بے بس تماشائی کی طرح ان دونوں کو ایک دوسرے کے گلے سے لگے پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا رضیہ سلطانہ ماہ نور کے آنسو پونچھ رہی تھی اور وہ اسے دلا سے دے رہی تھی۔ اگلے کچھ دنوں کو چھوڑ کر ان سے اگلے دن میری زندگی کے مشکل ترین دن تھے رضیہ سلطانہ کو وہ رپورٹس جھوٹ کا پلندہ معلوم ہونے لگیں وہ مجھے لئے ہر اس عامل بابا کے پاس گئی جو ملک میں میسر تھا، بابا فلاں، بابا فلاں، جھنڈ ہو گئی میری زندگی، عملیات کے ماہر بابا جی جادوگر اور جادوگر بنیاں، رضیہ سلطانہ کو ان پر پکا اعتقاد تھا، دوسری طرف میری حقیقت پسند بیوی ماہ نور کلینک اسپتال میڈیکل اسٹیٹوٹ، ہیلتھ سینٹر، میری جو تیاں چٹ گئیں پروہنا چٹی۔ اگلے ڈیڑھ سالوں تک علاج چلتے رہے روحانی جسمانی، اعصابی اور معاشی، نتیجہ صفر پر پورس وہی رہیں۔

☆☆☆☆

”ہرگز نہیں“۔ میں نے سنا اور سنتے ہی صاف انکار حد ہوتی ہے، پہلے دو بیویوں نے مجھے تھوڑا انگلی کا ناچ نیچا رکھا ہے جو ایک اور کرلوں، نہیں، بالکل نہیں، میں اٹل تھا، لیکن سامنے بھی رضیہ سلطانہ تھی اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے، ہر وقت ایک ہی راگ

”رہتا تھا“ ایک ہی بات الارم کی صورت ایک ہی منتر میں نے چلا کر بھی دیکھ لیا، غصے سے بھی منع کیا، پیار سے بھی سمجھایا پر نہیں مرغی کی ایک ٹانگ۔ بلکہ تھن کی۔

”اپنی مرضی سے بھی تو میرے ہوتے ہوئے دوسری کی بھی ناں اب میرے کہنے سے بھی کر لیں۔ یہ عورت کیا واقعی موٹے دماغ کی ہے؟ میں نے ماہ نور سے سر پھوڑا کہ اسے سمجھائے وہ آگے سے چپ! میں کو اس کرتا رہا اور وہ آگے سے ہوں ناہاں بندہ پتھر سے سر پھوڑے، یہ تو مجھے اگلے دن پتہ چلا کہ اس کے شیطانی دماغ میں کیل چل رہا تھا۔

”رضیہ باجی ٹھیک کہہ رہی ہیں، آپ کو شادی کر لینی چاہئے کب تک یہ گھر سونا سونا رہے گا؟ آپ مان لیں پلیز، میں حق دیتی ہوں۔“

☆☆☆☆

مجھے ماننا ہی پڑا ماننا ہی پڑنا تھا، ایک طرف ڈھول تھا جوشہا شاہہ بجتے ہوئے شادی، شادی بیکار رہا تھا اور دوسری طرف پیس پیس کرتی بانسری۔ لیکن یہ پہلا اور واحد موقع تھا جب وہ دونوں ایک بار پر تیار تھیں اس کے بعد نہیں۔

”میرے خالو کی بیٹی ہے حسنہ، بچاری کم عمری میں بیوہ ہو گئی، بہت اچھی ہے، کم عمر شرمیلی سی اچھی لڑکی ہے، میں بس خالو سے بات کر لی ہوں۔“ رضیہ سلطانہ تیار تھی تیار کوئی اور بھی تھا۔

”عائشہ میری دوست، بچاری کی چار منگنیاں ٹوٹ چکی ہیں، والدین پریشان ہیں رشتے کے لئے میں نے انکل سے بات کی تھی وہ راضی ہیں۔“ میں نے سر پکڑ لیا۔

”شادی ہوگی تو میری پسند سے بس۔“ رضیہ سلطانہ۔ ”ابو بس۔“ ماہ نور نے ناک سے کھٹی اڑائی۔ ”اپنے جیسی ڈھونڈی ہوگی تم نے بھی، ہمیں ایک ہی سائنڈ کافی ہے۔“ جواباً جو رضیہ کو دیکھا تو غصے

سے لال جھاگ اڑاتا منہ بڑی بڑی غصیلی آنکھیں، تنھے چلاتے ہوئے، ہائے یہ سائنڈ مجھے ملنا مار دے۔ ”تو خود کیا ہے پھٹکی، میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا حسنہ آگے کی اس گھر میں۔“ جنگ عظیم سوم شروع ہو چکی تھی باتوں سے ایک دوسرے کو قاتل نا کر سکنے کے بعد اب بات باتوں کی آچکی تھی، رضیہ سلطانہ اپنے آہنی ہاتھوں سے ماہ نور کے بال جکڑ چکی تھی جبکہ اس کی گردن ماہ نور کی سوکھی کلائیوں کے گھیرے میں تھی۔

☆☆☆☆

”دیکھیں دانیاں! امیری بات غور سے سنیں، کہتے ہیں بد قسمتی صرف ایک دفعہ آتی ہے دوبار نہیں، بالفرض کوئی بد قسمتی دوبار واقع ہو تو وہی بد قسمتی تیسری بار بھی ضرور ہوتی ہے، خدا نہ کرے اگر حسنہ بھی باجھ ہوگی تو۔“ ماہ نور نے تقریر کی میں نے بغور اسے دیکھا۔

”اور اگر باجھ عائشہ ہوگی تو۔۔۔۔۔“

”تو یہ کہ پھر حسنہ سے اولاد ہوگی تیسری بد قسمتی کے لئے تیار رہنے تاکہ چوٹی بار خوشیاں آسکیں۔“ میں نے سر جھکا دیا۔

”یہ وہی عورت میرا تماشہ بنوا کر چھوڑے گی، دو عورتوں نے مجھے آدھا باگل کر دیا ہے چار کے ہوتے ہوئے میرا کیا حال ہوگا۔“ میں نے جھرجھری لی۔

”آپ پلیز ہاں کر دیں۔“

”نہیں نہیں ایسے نہیں۔“ اسے کہنا چاہئے تھا کہ یہ رہا کلباڑا، پلیز اسے اپنے پیروں پر مار لیں۔

☆☆☆☆

”آیا لاڑی اے نی تیرا سہرا یاں والا۔۔۔۔۔“ جگ گئے سہرے جگ گیا ڈھول، تیسری بار اور پھر چوٹی بار۔ کہتے ہیں جب آپ ایک دفعہ قبول ہے کہتے ہیں تو آپ صرف ایک عورت سے جڑی خوشیاں قبول نہیں کرتے اس کے حصے کے دکھ، تکالیف اور مصائب بھی قبول کرتے ہیں۔ باخدا میں نے دل سے قبول

کساہ لگایا



اف! زندگی مجھے کس موڑ پر لے آئی ہے ایک ایسا گہرا اور اندھا دور رہا جہاں زندہ رہنے کے لیے کس راستے پر قدم رکھوں؟ میں نہیں جانتا کہ کون سی راہ کپڑوں کو کون سی چھوڑوں میں نہیں جانتا بھلا فیصلے کے لیے دینا میرے پاس اختیار ہی کہاں چھوڑا ہے۔ ہر طرف اداسیوں اور تنہائیوں کے مہوہ سائے ہیں پچھتاوے اور ندامتوں کے ماندھے کنوئیں ہیں میں تو اس راہ کا مسافر ہوں جس کی کوئی منزل ہی نہیں۔ بابا آپ نے یہ کیا کیا آپ سے نہت لگنا چاہوں بھی تو نہیں کر سکتا، صنویہ کو بھولنا چاہوں تو یہ میرے بس کی بات نہیں، بعض یادیں عذاب بن جاتی ہیں اور زندہ رہنے کا حوصلہ چھین لیتی ہیں۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب چھین لے مجھ سے حافظ میرا

☆.....☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں ایک کنیا سے نکل کر اس محل تک کیسے پہنچا۔ میری یادوں میں اب تک وہ رات زندہ ہے جب میں اپنی ماں کے سر ہانے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا۔ رات میری بدبختی کی طرح سیاہ اور تاریک تھی اور یارش کے شور میں میری آہیں اور سسکیاں دب گئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے ہزاروں ہنگامی ہوئی رو جس پچ رہی ہوں۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھلا اور میرے مرحوم ابا کے دوست آصف انکل گھر میں داخل ہوئے۔ میرے ابو کون تھے، کیسے تھے میں ناواقف تھا لیکن میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ میری پیدائش

سے پہلے ان کا انتقال ہو گیا تھا اور اماں مجھے لے کر ملیں گے اس چھوٹے سے دو کمروں کے گھر میں آگئی تھیں۔ جہاں آبادی برائے نام بھی میری عمر اس وقت بمشکل 8 سال تھی اور میں ایک سرکاری اسکول میں جماعت سوئم کا طالب علم تھا مجھے ابو کے یہ دوست بہت اچھے لگتے تھے۔ جب بھی آتے میرے لیے بے شمار کھلونے، کپڑے اور گھر کی ضروریات کا مکمل سامان ڈلو کر جاتے تھے۔ وہ ہم دونوں کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ عموما ان کی آمد کافی رات گئے ہوتی تھی۔ ان کی گاڑی بڑی شاندار تھی لیکن گلی تک ہونے کی وجہ سے اندر نہیں آسکتی تھی اور دور کھڑی رہتی تھی۔ شاید انہیں ماں کی شدید بیماری کا پتا چل گیا تھا۔ میں اپنی چیزیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو جاتا تھا اور اباں سرگوشیوں میں ان سے کچھ کہتا تھا۔ ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا تھا۔ مگر شاید اماں کا کمزور سا وجود ان کے غم کی آغوش کی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ اس لیے اماں نے رات کی جیسے ناطہ توڑنے میں ایک لمحہ نہیں لگایا۔ آصف انکل مجھے گلے سے لگا کر رونے لگے اور میں پریشان ہو گیا کہ کیا کروں۔ اماں تو شاید تھک کر سو گئی ہیں مجھے اپنے نقصان کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہی اماں کی چیمبر وٹافین ہو گئی اور آصف انکل نے وہ گھر اور اس کا تمام سامان اپنے ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔ ان کی گاڑی میں، میں جب بیٹھنے لگا تو انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں عجیب سی بے بسی اور درد و کرب کی ایک دنیا آباد تھی۔ گھر آنے تک وہ بالکل خاموش رہے۔ ان

کا عظیم الشان محل جیسا گھر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں حیرت سے۔ آصف انکل سے تو میں واقف تھا بے حد عظیم الطبع، مشفق اور مہربان اماں ہمیشہ ان کی شفقت، محبت اور عنایتوں کے کن گاتی تھیں۔ بڑے سے بی لاؤنج میں کافی لوگ تھے مگر میں شرم و ندامت کے باعث سر اوپر نہیں اٹھا رہا تھا۔ کیونکہ میرے معمولی کپڑے اور بوسیدہ چپل مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس دلارہے تھے۔ اماں کی بیماری میں، میں خود سے غافل ہو گیا تھا۔ آصف انکل سب سے میرا تعارف کرارہے تھے اور میں صم غم فرش کو تنک رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئے تو میں نے سر اوپر اٹھایا میرے سامنے معمولی نقش و نگار والی ایک مٹی کی بارعب خاتون بیٹھی تھیں جن کے چہرے سے شفقت اور خوت نیک رہی تھی۔ برابر میں میرا ہی ایک ہم عمر لڑکا اور بیٹوں سے لگی ایک معصوم شکل بھولی بھالی لڑکی یہ ہم عمر تھیں جو چاندنی طرح گلابی کپڑوں میں چمک رہی تھیں، وہ لمحہ آج بھی میرے دل پر نقش ہے کیونکہ تمہاری معصوم مسکراہٹ میں ایک خلوص بھی تھا جب کہ آنٹی کے چہرے پر درد شکنی اور لڑکے کی آنکھوں میں حقیر اور برتری کا احساس وہ مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے میں زمین پر رینگنے والا معمولی کیڑا مکوڑا ہوں۔

”یہ میرے دوست کا بیٹا میکاں ہے باپ تو کافی عرصے پہلے گزر گیا تھا، ماں بھی چل بسی۔ اس لیے اب یہ یہیں رہے گا۔“ پھر انہوں نے نوکر سے مجھے ہاتھ روم لے جانے کو کہا تا کہ نہادھو کر صاف ستھرا ہو جاؤں۔ میں ڈرائنگ روم سے نکل رہا تھا جب آنٹی کی آواز آئی۔

”نہ کب تک یہاں رہے گا؟“

”نی الحال تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ آصف انکل نے جواب دیا۔

”نی الحال سے آپ کا کیا مطلب ہے انکل کیا یہ ساری زندگی یہیں رہے گا۔ کیا میری خالہ نے دنیا بھر

کے قیہوں کو پالنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟“ اس لڑکے کی آواز نے میرے قدم زمین پر جمادینے۔

”بیٹم ابھی زمین سے اگے نہیں ہوا اور اپنی عمر سے بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو تم اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ میکاں سے چھ سال بڑے ہو پہلے بات کرنے کی بڑوں سے نیز اور آداب سیکھ لو پھر بولنا۔“ آصف انکل کو پہلی مرتبہ میں نے غصے میں دیکھا تھا۔ میری آنکھیں نا اچھی کے باوجود بھیگی گئیں اور قدم سست پڑ گئے۔

”معلوم ہوتا ہے آپ اسے کسی چڑیا گھر سے پکڑ کر لائے ہیں انکل۔“ وہ لڑکا زور سے ہنسا۔

”کم از کم میں تو اسے ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتا۔“ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

”شرم آئی چاہیے خرم بھائی آپ کو کیا وہ آپ کی طرح انسان نہیں اس طرح حقارت سے کسی کو دیکھنا بڑا پن نہیں گھنایا ہے۔“ صنوبیہ تمہاری نرم اور بیٹھی آواز نے جیسے میرے زخموں پر مرہم رکھ دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں خرم سے متاثر ہو گیا۔

☆.....☆

خرم بخش انکا کا بھائی تھا۔ صنوبیہ کے بعد جب ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی تو ان کے بچے اپنی آواز کا بیٹا گوڑ لے لیا۔ جو صنوبیہ سے مکمل گائی ہوا تھا۔ بیٹے کی خواہش نے انہیں ایسا کر کے پر جب کر دیا تھا۔ ان کے بے جالا ڈبیہ انے خرم کو حسدی، خود سر اور مغرور بنا دیا تھا اور انہوں نے ابھی سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ بڑے ہو کر صنوبیہ خرم کی دہن بنے گی جب کہ آصف انکل اس بات پر خوش نظر نہیں آتے تھے۔

”اگر آصف نکل اور صنوبیہ نہ ہوتے تو آنٹی اور خرم کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر میں کب کیا ہاں سے بھاگ جاتا مگر ان دونوں کی شفقت، محبت اور خلوص میرے پیروں کی زنجیر بن گئی تھی۔ اب میں اسی انگلش میڈیم اسکول میں پڑھ رہا تھا جہاں خرم اور صنوبیہ جاتے تھے اور اسکول کے معیار پر پختہ کے لیے مجھے

لیوشن کے ساتھ ساتھ محنت بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ رات کو بستر پر لیٹا تو دن بھر کی توجہ باتیں میرے دل پر نشتر لگاتی رہتیں۔ اپنی بے بسی پر رونا آتا۔ کیا میں ساری زندگی دوسروں کے ٹکروں پر گزرا دوں گا؟ احساس کمتری نے مجھے مار کھا تھا یوں لگتا تھا ہر شخص مجھ پر خندہ زن ہو۔ مگر صنوبیہ اس وقت بھی تم میری سب سے بڑی ڈھال اور سہارا تھیں تم نے ہی ہمیشہ میرا حوصلہ بڑھایا، اخلاقی مدد کی اور جینے کی امنگ دی اور پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے کچھ بن کے کھانا ہے اور سر اٹھا کر جینا ہے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میں کامیابی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اسکول اور کالج میں میرے ریکارڈ بنتے رہے اور خرم اور آنٹی کے سینے پر سناٹا بننے لگا۔

میڈیکل کالج میں داخلہ میں اچھا تھا اور جب میرے اس خواب کی تکمیل ہوئی تو مکمل طور پر صنوبیہ کی خوش دیدنی تھی۔ اب میں ایک کامیاب ڈاکٹر تھا۔ اب میں یہاں سے چلے جانا چاہتا تھا کیونکہ آنٹی کی نفرت اور خرم کی حقارت آج بھی جوں کی توں ہی لیکن انکل اور صنوبیہ کے سامنے میری ایک نہ چلی اور میں مجبور ہو گیا کیونکہ صنوبیہ کی محبت میری خوشیوں کی ضامن تھی۔ میرے زندہ رہنے کی دلیل تھی اور پھر دنیا میں میرا تھا بھی کون۔ میں تو صحرا میں اگے ہوئے ایک خود رو پودے کی طرح تھا۔ آوارہ ہواؤں میں پلٹنے والا اور ہواؤں کے تیز و تند بھٹکروں میں مر جھانے والا۔

شاید تم نے آصف انکل سے بھی کچھ کہا تھا جو ایک دن جب آنٹی اور خرم گھر میں نہیں تھے تو وہ مجھے سمجھانے بیٹھ گئے۔

بیٹا! جو کچھ تم نے اب تک سہا ہے وہ میں شادی کے بعد سے بھگت رہا ہوں۔ صنوبیہ کی ماں بے حد خود سر اور خوشامد پسند عورت ہے۔ یہ مجبوری کا سودا تھا۔ میرے والد بنیش کے ابو کے پاس کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کاؤنٹس میں گڑبڑ ہو گئی حالانکہ اس میں

میرے باپ کا کوئی قصور نہ تھا مگر نا کردہ گناہوں کی سزا سے بچنے کے لیے انہیں اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دینی پڑی۔ ان کی اکلوتی اور بڑی ہوئی بیٹی سے شادی کر کے جس سے کوئی شادی کے لیے تیار نہ تھا۔ جو تھے وہ سب خود غرض اور دولت کے لالچی تھے جب کہ ہنس کے ابا مجھے بچپن سے جانتے تھے۔ ابا کی طرح بے حد خوددار، مختی اور بے غرض یہ ان کی سوچی سمجھی سازش تھی اور میں قربانی کا بکرا بن گیا یوں مجھو انہوں نے مجھے خرید لیا اور میں بے مول بک گیا۔

بیٹا تم سمجھ دار ہو تمہارے سامنے ایک تابناک مستقبل ہے بے شک جن کے راستے کٹھن ہوں ان کی منزلیں بھی آسان نہیں ہوتیں مگر ہمیں حوصلے اور ہمت سے کام لینا ہے۔ اپنی آنٹی اور خرم کے رویے کی پرواہ کیے بغیر کیونکہ میں تمہیں بہت اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں یہ میرا ارمان نہیں خواہش تھی ہے۔ مجھے تم پر بڑا مان ہے۔ میرے بعد صنوبیہ کا بے حد خیال رہا۔ اس کو کبھی خرم اور اپنی آنٹی کے چنگل میں مت پھنسنے دینا۔ بے حد بھولی اور معصوم ہے۔ یہ کہہ کر وہ رونے لگے اور مکاں کے لیے ان کو چپ کرانا مشکل ہو گیا۔

☆.....☆

آصف انکل آج کل بہت زیادہ چپ رہنے لگے تھے۔ پتا نہیں کیا غم تھا جو انہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا اور گھن کی طرح ان کی صحت کو چاٹ رہا تھا۔ اس کا نتیجہ شدید ہارٹ اٹیک کی صورت میں نکلا۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا مجھے ان سے ایسی ہی محبت تھی جو کسی بیٹے کو اپنے باپ سے ہو سکتی ہے۔ آنٹی سی یو میں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی مگر میں ڈاکٹر تھا ان کی دیکھ بھال میں پیش پیش مگر میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ ان کی حالت اچھی نہ تھی پھر ہوش میں آتے ہی انہوں نے مجھے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی آگئی وہ چاروں طرف سے

مشینوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ وہ مجھے سینے سے لگانا چاہتے تھے مگر بے بس تھے میں ان کا ہاتھ پکڑ کر روئے لگا تو انہوں نے ڈاکٹر کو اشارہ کیا اور ایک سوئیڈ بونیڈ آدی نے کچھ کاغذات میرے حوالے کر دیئے۔ ان کی خواہش پر ڈاکٹر نے ماسک ہٹایا تو وہ بمشکل تمام بول سکے۔

”بیٹا یہ بیرسٹر ظفر میرے دوست ہیں۔ کبھی کوئی مشکل ہو تو ان کے پاس چلے جانا۔ یہ املاک کے کاغذات تمہارے نام ہیں اور اس پر تمہاری آئی کا کوئی حق نہیں۔ یہ ایک بڑے حق حلال کی کمائی کے ہیں اب تم اس بے رحم معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکتے ہو۔“ میں ایک خواب کی سی کیفیت میں تھا وہ شاید کچھ اوز بھی کہنا چاہتے تھے مگر وقت کے مہلے پہنچ دی اور ڈاکٹر نے ان کی موت کا اعلان کر دیا۔

آصف انکل کی وفات نے میری راہ میں مشکل پیدا کی پہاڑ کھڑے کر دیئے۔ میں خوش تھا کہ اب آسانی سے تمہیں پاسکوں گا مگر تمہارے برتاؤ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا تھا۔ جتنی خوش مزاج رہیں مکہ اور باتونی تھیں اب اسی قدر برہم، گم صم اور برگشتہ خاطر سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ زیادہ تر کمرے میں بند یا خرم کے ساتھ گھومنے پھرنے میں مصروف میں اس کا یا پلٹ پر حیران تھا جب ایک دن تم نے کمرے میں آکر کہا۔

”آپ کو اب اس گھر سے چلے جانا چاہیے کیونکہ جن کی وجہ سے آپ تھے۔ وہ وجوہات اب رہی نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز اور اس کا لہجہ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھما جاپا تو وہ غصے سے پھرج گئی۔

”آپ کو شرم آتی چاہیے میں آپ کے لیے بہنوں جیسی ہوں۔“ مجھے لگا جیسے کسی نے مجھے بلندی سے پستی میں دیکھ لیا تھا۔ اب تک یہ کرم نوازیوں اور مہربانیاں بن کر تھیں۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ بے بسی اور بے بسی میرا منہ چڑا رہی تھی۔ آخری، خرم اور صنوبیہ سب ایک ہو گئے

تھے اور میں بالکل تنہا کچھ عرصہ یہ کشمکش جاری رہی۔ آخر مجھے اپنی شکست قبول کرنا پڑی کیونکہ صنوبیہ کے رویے نے مجھے توڑ دیا تھا۔ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا اور روپے پیسے کی کوئی کمی نہ تھی۔ اس لیے گھر، شہر اور ملک چھوڑنے کا میں نے فیصلہ کر لیا۔ میری رنجش کی دن سب سے زیادہ بے چین و بے قرار وہی تھی اور شاید سارا دن روتی بھی رہی تھی۔ وہ مجھے ملنے آتی تو بولی۔

”میکال بھائی! آپ سے ایک وعدہ لینا ہے۔“ میرا ذہن تو ابھی تک بھائی میں ہی لگا ہوا تھا۔ ”یہ خط جو میں آپ کو دے رہی ہوں تعلیم مکمل ہونے کے بعد پڑھنا وعدہ کریں اس سے پہلے اسے نہیں پڑھیں گے۔“

”میں نے وعدہ کر لیا کیونکہ اس کی کسی بات کو نہ ماننا میرے بس میں نہیں تھا میں امریکہ چلا آیا اور خود کو پڑھنے میں مدغم کر لیا۔ سارے امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیے اور یونیورسٹی بھی آسانی سے مل گئی اور محنت، مشق اور محنت کے ثمرات نے مجھے ایک ماہر ڈاکٹر کے روپ میں ڈھال دیا۔ پبلشنگ کرنے کے بعد تو جیسے مجھ پر بہن برسنے لگی۔ وفات، شہرت اور شہرت نے میرے قدم چومے مگر ایک لمحے کی اور بے چینی میرا احاطہ کیے رہتی اور صنوبیہ کا پیکر لگا ہوں کے سامنے اچانک ایک دن اپنا سامان رکھتے ہوئے میری نظر اس لفافے پر پڑی جو صنوبیہ نے وعدہ لے کر دیا تھا اور میں بھول چکا تھا میں نے لفافہ کھولا تو دماغ گھوم گیا اور میں سر سے پاؤں تک لرز اٹھا۔

میرے بھیا!

آپ یقیناً چونک گئے ہوں گے مگر خدا را بابا کو معاف کر دیجیے گا جو اپنی شرافت، بزدلی اور کم ہمتی کی وجہ سے آپ کو یہ بنا بنا سیکے کہ وہ آپ کے حقیقی باپ تھے۔ ان کی آخری سانسیں تھیں جب انہوں نے مجھے اس راز میں شریک کیا۔ اس وعدے کے ساتھ جب

تک آپ کی تعلیم مکمل نہ ہو آپ کو نہ بتایا جائے۔ آپ مجھ سے بدگمان اور میں پیشمان اور آپ سے شرمندہ تھی مگر بابا کی قسم نے زبان پر تالے ڈال دیئے تھے۔ آپ میرے جتنی بھائی ہیں اور میں کبھی سمجھ کر آپ سے محبت کرتی رہی میری آپ سے نظریں ملانے کی ہمت نہیں تھی کہ ایک مقدس رشتہ آلودہ ہو گیا تھا ہو سکے تو اپنی بہن اور باپ کو معاف کر دیجیے کہ ایک خط بابا نے ان کے لیے بھی دیا ہے جو آج میں انہیں دے دوں گی۔

آگے بھی کچھ لکھا تھا لیکن اس سے زیادہ پڑھنے کی میکال میں ہمت نہیں نہ ہوا۔ میں خود سے شرمندہ تھا اور اپنی بہن سے بھی کوئی بارود دگا رہے رحم دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا تھا دلہن ہوتی مگر جاننے کے باوجود میں انکل جو میرے بابا تھے نفرت نہ کر سکا۔ ان کی محبت اور شفقت نفرت پر حاوی تھی۔ میں نے فوراً پاکستان کے لیے رخت سفر باندھا۔ میری بہن نے جاننے کس حال میں ہوگی۔ انکل نے مجھے اس کی حفاظت کا کہا تھا۔ میں ایئر پورٹ سے سیدھا بنگلے پر پہنچا تو اجنبی لوگوں سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بتایا کہ انہوں نے یہ بنگلہ خرم سے خریدا تھا اور پہلی تو پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔

میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اب میں اپنی بہن کو کہاں ڈھونڈوں۔ مجھے کراچی کے ایک بڑے اسپتال میں جا ب مل گئی تھی مگر مجھے کسی صورت قرار نہیں تھا۔ پاگلوں کی طرح سرخوں، گلیوں اور کوچوں میں صنوبیہ کو ڈھونڈنا رہتا تھا۔ ندن کو چین تھا نہ رات کو آرام۔ خلش اور بے چینی حد سے سوا تھی۔

☆.....☆

اس دن بھی میں بڑا ڈپرید تھا۔ ایک جوان لڑکے کی موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس کی ماں کے بین تھوڑے کی طرح دماغ پر برس رہے تھے۔ تب ہی اسٹنٹ کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”سرایک سیریس کیس ہے آپ چل کر دیلیہ لیں۔“ ”یار اس وقت میرا اعلیٰ موز نہیں ہے کسی اور ڈاکٹر سے کہہ دو۔“ میں نے بے زاریت سے کہا۔

اسٹنٹ نکلا تو شور نے سنائے کو توڑ دیا۔ کوئی عورت بری طرح رو رہی تھی اور شاید مجھ سے ملنے کی ضد بھی کر رہی تھی۔

”یہ کیسا شور ہے کیوں ہنگامہ مچا رکھا ہے۔“ میں نے باہر نکل کر اسٹنٹ کو ڈنٹا تو ایک اجڑی ہوئی کمزوری عورت میرے سامنے آئی۔

”بیٹا میری بیٹی کو بچالو۔“ شکل جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

”آئی نیش!“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”ہاں بیٹا میں تمہاری آئی نیش ہی ہوں مگر خدا را اس وقت مجھ سے کچھ محبت پوچھو، صرف صنوبیہ کو بچالو تمہاری صنوبیہ مر رہی ہے۔ وہ بری طرح گڑ گڑانے لگیں اور میں بھاگتے ہوئے جہز وارد میں داخل ہوا۔ اگرچہ مجھے چاہ حسن کی مالک نہ ہوئی تو شاید میں پہچان بھی نہ پاتا۔ وہ بڈیوں کا ڈھانچا لگ رہی تھی چہرے پر جیسے زردیال لگا ہوا۔

”میری بہن میری صاحبہ!“ اس کی پیشانی پر بوسا دیتے ہوئے میں رو پڑا۔

”مت کہو تم اسے اپنی بہن تمہاری حقیقی بہن نہیں ہے۔ میں نے صنوبیہ سے جھوٹ بولا تھا یہ سب میری سازشوں کا نتیجہ اور گناہوں کی سزا ہے کیونکہ تمہارے انکل نے خط میں مرنے سے پہلے یہ اعتراف کر لیا تھا کہ تم ان کے حقیقی بیٹے ہو اور صنوبیہ کی تم سے شادی کر دی جائے۔ کیونکہ اس حقیقت سے صرف ہم دونوں ہی واقف تھے کہ میں بانجھ تھی اور تمہارے انکل کی اعلیٰ ظرفی کہ انہوں نے بھی مجھے احساس نہ ہونے دیا نہ جتنا اور ہم نے ایک لاوارث بچی کو دلے لی اور دوسرے شہر منتقل ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ یہ ہماری اولاد ہے۔ اس وقت میں نے تمہارے

تبت

ٹالکم پاؤڈر



اب 3 نئی خوشبوؤں میں دستیاب



کلاسیک

سلیکٹ

لکچر

تبت ٹالکم پاؤڈر - صبح سے شام تک پہنچائے

انگل سے وعدہ لیا تھا کہ زندگی بھر اس راز کو افشا نہیں کریں گے اور اس عظیم انسان نے آخری تک اس وعدے کو نبھایا اور مجھ کو ظرف نے اسی کو ڈھال بنا کر اپنی ہی بیٹی کے خلاف استعمال کیا۔ کیونکہ یہ جان کر کہ تم آصف کے حقیقی بیٹے ہو۔ میرے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ انتقام کا اس سے اچھا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا کہ میں نے صنوبیہ کو حقیقت سے لاعلم رکھا اور اپنی ہی پالی ہوئی بیٹی کے جذبات کی پرواہ نہ کی۔ بلکہ میں اسے یہ کہہ کہہ کر شرمندہ کرتی رہی کہ ایک گئے بھائی کے لیے تمہارے کیسے جذبات تھے اور پھر میں نے زبردستی صنوبیہ کو خرم سے منسوب کر دیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایک صاحب کو دودھ پلا رہی ہوں اور اس آستین کے سانپ کیسے ہی ڈس لیا۔ اس نے میرے علم میں لائے بغیر ایک ایک کر کے سارے اثاثے بیچ دیئے۔ کیونکہ اس کی جاپلوسی بالوں میں آکر میں نے برلن کے سارے اختیارات اس کے ہاتھوں میں دے دیئے تھے۔ اس نے نامی گراما پر شرزی خدمات لیں۔ پانی کی طرح پیسہ خرچ کیا۔ جھوٹی شہادتیں جمع کیں اور دستاویزات پر سے میرا اور صنوبیہ کا نام کاٹ کر اپنا نام لکھ لیا جب مجھے علم ہوا تو پانی سر سے گزر چکا تھا۔ کبھی بک چکی تھی وہ ہوس کا مارا اسی لیے صنوبیہ سے بھی شادی کرنا چاہتا تھا۔

میکال بت بنانا ان کی کہانی سن رہا تھا اور صنوبیہ آنکھیں پھاڑے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”بس بیٹا! میں ناعاقبت اندیش عورت تمہارے باپ کی قدر ہی نہ کر سکی ہاں مجھ ہی تو شادی کرنا ان کا اخلاقی اور شرعی حق تھا۔ ان کی حد سے زیادہ شرافت اور نرمی کا میں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا اور وہ شریف انسان آخری وقت تک اس رشتے کو نبھاتے رہے۔ انہوں نے طوفان کے آثار شاید پہلے ہی محسوس کر لیے تھے اس لیے اپنی زندگی میں ہی انہوں نے ڈیفنس میں فلیٹ اور ایک خطیر رقم صنوبیہ کے لیے بینک میں ڈپازٹ کر دی

تھی۔ جب خرم نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیریں تو بیسٹ فلفر اس وقت ہمارے کام آئے اور انہوں نے سب کچھ ہمارے حوالے کر دیا۔ اس سارے کیس میں سب سے زیادہ نقصان میری معصوم بیٹی کا ہوا۔ کہتے ہیں پیدا کرنے والے سے زیادہ پالنے والے کو محبت ہوتی ہے مگر جانے میں کیسی خود غرض ماں تھی کہ نہ پیدا کر سکی نہ لے پا لک سے محبت اور اس کو بچو کے لگا لگا کر اس مقام پر پہنچا دیا۔ میں تم دونوں کی گناہ گار ہوں۔ خدا را مجھے معاف کر دو اور میری صنوبیہ کو بچالو۔“ ہنش میکال کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ روتو وہ دونوں بھی رہے تھے۔

”آئی! جو ہونا تھا وہ ہو گیا شاید اس میں بھی ہمارے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ بہتری رکھی ہوگی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے رہی صنوبیہ تو کل بھی میری ذمہ داری تھی اور آج بھی ہے۔ اللہ نے چاہا تو اس کو کچھ نہیں ہوگا۔ اس کو زندہ رہنا ہوگا میرے لیے۔“ میکال نے ہنسنے لگی۔

”ختمی! ختم کیا کیا؟“ میں خود کو پوچھنے سے باز نہیں رکھ سکا۔

”کیا بننا تھا اس ملک ختم ہونے کی موت مرا اور لاوارثوں کی طرح دفن کیا گیا۔ اپنی حسیوں کے ہاتھوں ایڈز کا شکار ہو کر کمپری کی موت مرا۔ یہ سب میں نے اخبار میں پڑھا تھا اب تو اللہ سے اپنے گناہوں کے کفارے کے لیے ساری زندگی گزر گئی رہوں گی اور تم دونوں کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کروں گی۔ شاید اس طرح آصف بھی مجھے معاف کر دیں اور جو دکھ تمہیں میری ذات سے پہنچے ہیں اس کا ازالہ ہو جائے۔“ وہ ایک مرتبہ پھر بلک بلک کر رونے لگیں اور صنوبیہ اور میکال انہیں تسلی دینے لگے۔

زویب کی دوکاندار

”سماویہ یار! جلدی سے مجھے چائے پلا دو، میں زویب نے چوٹی بار کھائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔
”جی جی بس لارہی ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی
نے ضروری کام سے صفدر کی طرف بھی جانا ہے۔“

چائے پیالیوں میں ڈالنی چاہی تو پتیلی سے تھوڑی سی
چائے اس کے ہاتھ پر گر گئی۔
”آئے اللہ ماہی۔“ تکلیف سے اس کی
آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
”یار! چائے لارہی ہو یا پتیلی جاؤں۔“ اب کی بار
زویب کی آواز میں جھنجھلاہٹ تھی۔
”یہ پتیلی چائے۔“ ایک ہاتھ میں چائے کی
پکڑے دوسرے ہاتھ پر ٹوٹھ پیٹ لگا کے اس نے
زویب کو چائے پکڑائی۔
”کمال ہے یار! اتنی دیر کرا دی تم نے چائے کے
چکر میں، یہ تو چائے نہیں پائے بن لئے ان لہ پنا
میں میرا ضروری کام رہ جاتا۔“ اس نے جلدی بلدی
چائے کے گرم گھونٹ بھرتے طنز کیا۔
”زویب! میرا ہاتھ جل گیا تھا چائے سے اس
لئے تھوڑی دیر لگ گئی۔“ اس نے اپنا جلا ہاتھ شوہر
کے آگے کیا۔
”کمال ہے یار کوئی کام تم سے ٹھیک سے نہیں
ہوتا۔“ اس نے خالی پیالی ٹرے میں واپس رکھی اور
جلدی جلدی جو تے پہن کے نکل گیا۔
”کمال ہے زویب! آپ کو دو منٹ دیر ہو گئی تو



غصہ ہو گئے لیکن یہ نظر نہیں آیا کہ کتنی تکلیف ہو رہی ہے مجھے۔“ اس نے تو تھ پیٹ لگے ہاتھ پر نظر ڈالی۔
”ایک بار پوچھ ہی لیتے میرا دل رکھنے کے لیے کہ کیسے جل گیا ہاتھ لیکن آپ کو کیا پرواہ آپ کو تو اپنے کام ٹائم پر کیے ملنے چاہیں۔ میں مروں یا جیوں آپ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ اس نے دکھ سے سوچا۔

☆.....☆

”یہ دیکھو! فیصل نے مجھے شادی کی سالگرہ کا گفٹ دیا کل۔“ عنانیہ نے اپنی کلائی اس کے آگے لہرائی تو اس میں لشکارے مارنے دو گنگن اس کو چونکانے کے لیے کافی تھے۔
”بہت خوب صورت ہیں عنانیہ! فیصل بھائی تم سے بہت پیار کرتے ہیں ناں۔ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

”ہاں یار! بہت چاہتے ہیں فیصل مجھے سنا کر لو میرج جو کی تھی مجھ سے پیار تو بہت کرتے ہیں۔“ کہتے ہوئے اس کی گردن تن کی گئی۔
”لو میرج تو زوہیب نے بھی مجھ سے کی تھی۔ اس کے بڑبڑانے پر عنانیہ چونک گئی۔
”کیا ہوا ساویہ! کوئی مسئلہ ہے کیا۔ زوہیب بھائی سے لڑائی ہوئی ہے کیا؟“ اس نے چائے کی پیالی نیل پرواہیں رکھ دی۔

”نہیں بابا لڑائی کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا۔ بات کرنا تو دور، ٹائم ہی نہیں ہوتا ان کے پاس میرے لیے۔“ آفس سے آتے ہیں تو دوستوں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ میں اکیلی سارا دن گھر میں ان کے انتظار میں سوکتی رہتی ہوں۔“ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔
”تم بولا کرو کہ تمہیں بھی ٹائم دیا کریں بتاؤ کہ تم ان کے انتظار میں بیٹھی رہتی ہو سارا سارا دن، کچھ وقت تمہارے لیے بھی نکالیں اور تھوڑا تم تیار بھی ہوا کرو، جب زوہیب بھائی کے آنے کا وقت ہو تو خوب اچھے سے تیار ہوا کرو، خود بھی ان کو گفٹ دیا کرو اور

خاص موقعوں پر ان سے لیا بھی کرو۔“ عنانیہ نے اپنے کنگنوں پر فخریہ نظر دوڑائی۔
”کہاں یار میں تیار ہوتی ہوں تو دھیان ہی نہیں دیتے۔ میں خود سے پوچھوں کہ کیسی لگ رہی ہوں تو بغیر نظر ڈالے بول دیتے ہیں کہ ٹھیک ہی لگ رہی ہو تو اس وقت اتنا رونا آتا ہے کہ کیا بتاؤں اور گفٹ کا تو نام بھی مت لو۔ پچھلے ہفتے جب میری سالگرہ تھی تو میں نے پہلے تو انتظار کیا کہ شاید خود ہی دے دیں لیکن گفٹ دینا تو دور کی بات دس تک نہ کیا تو میں نے بھی گلہ کر دیا تو بجائے شرمندہ ہونے کے کہنے لگے کہ یاد ہی نہیں رہا، میں نے کہا کہ اب دے دیں تو کہنے لگے کہ آج کل تو بالکل بھی ٹائم نہیں، جب ٹائم ملے گا تو دے دوں گا۔“ ساویہ بالکل روہا سی ہو گئی۔
”اچھا تم فکر مت کرو ایسا کرو کہ تم ویلنٹائن ڈے پر زوہیب بھائی کو گفٹ دینا اچھا سا اور ابھی سے بول دو کہ 14 فروری کو ڈنر باہر کروائیں تمہیں ٹھیک ہے ناں ان کو ویلنٹائن ڈے کا بھی تین دن رہتے ہیں ویلنٹائن ڈے میں تو جتنے بھی کام ہیں نشا لیں۔ اس دن کوئی بہانہ نہیں ہونا چاہیے۔“ اس کے کہنے پر ساویہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
”میں نے تو فیصل کو اس سے بولی دیا ہے کہ گفٹ میں مجھے ڈائننگ رنگ چاہیے اور چائے یا ڈنر میرے فیورٹ ریسٹورنٹ میں۔“ اس نے فخریہ کہا جیسے بہت بڑا کارنامہ سر انجام دیا ہو۔
”تو فیصل بھائی مان گئے رنگ اور ڈنر کے لیے۔“ ساویہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔
”ہاں یار اور انکار کرتے بھی تو کیوں، آخر کو ان کی بیوی ہوں اتنا تو حق بنتا ہے میرا، اچھا اب میں چلتی ہوں فیصل آنے والے ہوں گے اور اگر ان کے آنے پر میں ان کو نظر نہ آؤں تو یہاں وہاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں مجھے جب تک مجھے دیکھ نہ لیں چین نہیں آتا انہیں۔“ اس نے اپنا پرس صوفے سے اٹھایا۔

”بہت کئی ہوتم کہ تمہیں فیصل بھائی جیسے کیئرنگ مسیڈ ملے۔“ اس نے حسرت سے کہا۔
”تم بھی کئی ہو جاؤ گی میں نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کرنا۔“ دروازے سے نکلتے اس نے یاد کروایا تو ساویہ نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ ضرور عنانیہ کی کئی باتوں پر عمل کرے گی تاکہ زوہیب بھی فیصل کی طرح اس کا خیال رکھیں۔

☆.....☆

”زوہیب! میں کیسی لگ رہی ہوں۔“ وہ جو آفس سے آ کے ابھی لیٹا ہی تھا کہ ساویہ کی آواز پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پلنگ لائن کے نئے سوٹ میں ہلکے سے میک اپ، کانوں میں نازک سی امیز رنگ، ہاتھوں میں ڈیئر ساری، پینک اور وائٹ چوڑیاں پہنے وہ اس کے جواب کی منتظر تھی۔
”ٹھیک لگ رہی ہو لیکن اتنا تیار ہوں نہیں۔“ اس نے دوبارہ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔
”آف تو یہ زوہیب! بہت برے ہیں آپ، کبھی جو میری تعریف کی ہو آپ نے، حسرت ہی رہی میری۔“ وہ اب غصے میں چوڑیاں اتار کر بیٹھ رہی تھی۔
”کیا ہو گیا ہے آج تمہیں اتنا غصے کیوں آ رہا ہے۔ اچھا وہ جو اس دن تمہارا ہاتھ جلا تھا اب ٹھیک ہوا کہ نہیں، لاؤ دکھاؤ مجھے کیسے جل گیا تھا۔“ وہ اچانک یاد آنے پر اسے بلانے لگا لیکن وہ غصے سے کمرے سے نکل گئی تو زوہیب اس کے عجیب برتاؤ پر حیران ہوا۔
”اس ویلنٹائن ڈے پر مجھے اچھا سا گفٹ چاہیے اور ساتھ ڈنر بھی باہر کرنا ہے مجھے ابھی سے سن لیں اس دن کوئی بہانہ نہیں چلے گا آپ کا۔“ اس نے آملیت اس کے سامنے رکھا اور خود بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔
”یار! کوشش کروں گا تمہیں پتا بھی ہے کہ نہ نایا کاروبار سیٹ کر رہا ہوں، آج کل تو ٹائم نہیں ہوتا اگر

ٹائم نکل آیا تو چلے جائیں گے ڈنر کے لیے۔“ اس نے بڑے بڑے نوالے منہ میں ڈالنے شروع کیے۔
”زوہیب! میں بول دیتی ہوں کہ اس دفعہ میں کوئی بہانہ نہیں سنوں گی آپ کو مجھے لے کر چلنا ہی ہو گا۔ سالگرہ کے گفٹ پر بھی مجھے تالا تھا لیکن اس بار نہیں بہت ہو گیا، ذرا فیصل بھائی کو تو دیکھیں کتنا خیال رکھتے ہیں اتنے گفٹ دیتے ہیں عنانیہ کو، ہر دوسرے دن باہر گھمانے لے کر جاتے ہیں اور ایک آپ ہیں۔ میری کوئی پرواہ ہی نہیں ذرا ٹائم نہیں میرے لیے سارا سارا دن آپ کا انتظار کرنی رہتی ہوں لیکن آپ کو کیا پرواہ میری۔“ آج اس کے منہ سے سارے گلے نکل آئے۔

”یار! میں تمہارے لیے ہی تو اتنی محنت کر رہا ہوں تاکہ تمہیں ہر چیز دے سکوں۔“ اس نے اپنی صفائی دینی چاہی تو وہ غصے سے پکڑ میں چلی آئی۔ زوہیب اسے منانے کچن کی طرف گیا۔ دروازے پر پہنچ کر نظر نکالا تو وہاں جھنجھکی گھڑی پر ڈالی جو پونے آٹھ بج رہی تھی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھا۔
”بس یہی خیال ہے جس میں ناراض ہوں تو منایا تک نہیں، میری کیا پرواہ ہے میں کئی میں۔“ تیاری کرتے زوہیب نے اس کی بو بڑی سے سنا کر دیا۔

☆.....☆

زوہیب کے ماں باپ زندہ نہ تھے بس ایک بہن تھی جو شادی شدہ تھی اور سعودی عرب میں مقیم تھی۔ زوہیب اپنی یونیورسٹی میں جونیئر کلاس کی ساویہ کو پسند کرنے لگا تو پڑھائی مکمل کر کے بہن سمیرا کو ساری بات بتائی اور نوکری لگتے ہی سمیرا کے گھر رشتے کے لیے بیجبا یوں آنا فانا دونوں کی شادی ہو گئی۔ شادی کے مہینے بعد ہی سمیرا واپس اپنے گھر چلی گئی۔ یوں وہ اکیلی سسرال کے جھنجھٹ سے آزاد خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔ جب اچانک زوہیب کو اپنا

Poora Pakistan Raha Hai Bol Hashmi Ispaghool

Hashmi
Ispaghool

روزانہ ہاشمی اسپغول
قدرتی فائبر کا استعمال رکھو
✓ معدے کو صاف
✓ بلڈ شوگر کا لیول برقرار
✓ کو لیسٹرول کو کم اور دل کو صحت مند
✓ قبض سے دور اور نظام ہضم کو درست

Daily Lo Fit

www.hashmisurma.com Hashmi Since 1974

کاروبار کرنے کا شوق ہوا تو ماں باپ کے چھوڑے پیسے کو کاروبار میں لگا کر خوب محنت کرنے لگا تاکہ سماویہ کو دنیا کی ہر خوشی دے سکے، نئے کاروبار کو پروان چڑھانے میں اسے وقت کا ہوش ہی نہ رہتا، صبح کا گیا رات کو لوٹتا تو کھٹک سے بچو کر ہوسوتا سوچ ہی اٹھتا۔ اس ساری صورت حال میں اسے احساس تک نہ ہوا کہ سماویہ اس کی مصروفیت سے کتنی ڈسٹرب رہنے لگی ہے۔ شادی کے پانچ مہینے بعد جب اس کی سالگرہ گزری تو کام کی مصروفیت کی وجہ سے اس کے ذہن سے نکل گیا۔ بعد میں اس کے یاد دلانے پر وقت کی کمی کی وجہ سے ابھی تک اس کا گفٹ نہ دے سکا تو اس بات پر سماویہ کا دل بہت دکھا اور پر سے اس کی سیکل عنائیہ جب اپنے شوہر کی وارنٹھیاں بتاتی تو وہ اسے یاسیت کا شکار ہو جاتی۔

☆.....☆

”کل اگر ویلنٹائن ڈے کا گفٹ نہ دیا اور باہر نہ لے کر گئے تو میں بھی امی کی طرف چلی جاؤں گی اور وہیں رہوں گی جب تک انہیں احساس نہیں ہوتا۔“ اس نے ربخ موڈ کر لیٹے زوہیب پر نظر ڈالی اور خود سے یاد دہانی کی۔

”بس آج رات سو جاؤ اے دل، کل سماویہ کو سر پر اندر دینے کے لیے ابھی چپ ہونا بہت ضروری ہے۔“ اس نے ناراض بیوی کو منانے کے لیے تڑپتے دل کو ڈپٹا۔

☆.....☆

”مجھے یقین ہے کہ آج بھی لیٹ آئیں گے میں جا کے بیگ پیک کر لیتی ہوں کل صبح ہی امی کی طرف چلی جاؤں گی۔ پھر شاید احساس ہو کہ محبت کا اظہار کتنا ضروری ہے۔“ اس نے کپڑے بیگ میں ڈال کے زپ بند کی ہی تھی کہ دروازے کی بیل پر چونک اٹھی۔

”آپ اس وقت، مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ زوہیب کے ساتھ اندر آتے اس نے گھڑی پر نظر

☆.....☆

عشق کی دواستہ ہیرا پیری

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: آنسو غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بہنوں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ وہ سب میں حسین تھی۔ خود سے پہلے اپنے والدین اور بہنوں کی خوشی کا سوچتی تھی۔ کم عمری میں ہی اس نے گھر کی تنگدستی دور کرنے کے لیے

محنت کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے لیے خریدی چیزیں بہنوں کے پسند آ جانے پر انہیں دے دیتی تھی۔ وہ اپنی روٹی بھٹی زندگی سے عاجز تھی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ کی امیر کبیر بندے سے شادی کر کے اپنے گھر والوں کی زندگی سنوارے گی۔ دونوں چھوٹی بہنیں اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس سے بڑی درخشاں کی آنسو سے گھنی رہتی تھی۔ وہ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ قدوس صاحب جو آنسو کے والد ہیں اولاد پر نہ ہونے پر اپنی بیوی ہاجرہ کو ساری زندگی باتیں سناتے رہے۔ انہیں آنسو کا کانچ جانا پسند نہیں تھا۔ ہاجرہ، آنسو کے بارلر (جو اس نے گھر میں ہی کھولا ہوا تھا اور محلے کی عورتیں بڑے بارلر میں پیسے بچانے کی خاطر اس کے پاس آتی تھیں کہ وہ کم پیسوں میں بہترین کام کرتی تھی) اور کوچنگ سے ملنے والی آمدنی کے گن گاتیں تو قدوس صاحب کی انا بلبلاتی تھی۔ آنسو بھی ان کی جلی جلی کی زد میں رہتی تھی۔ عریشان ولی جدی پستی رئیس ہے۔ Perfection اس کی پہچان ہے۔ ذرا بھی نقص اسے برداشت نہیں خواہ وہ چیز اسے کتنی ہی عزیز کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے کمرے سے محض

قسط نمبر 12



عرشان ولی ٹراؤز اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں برآمد ہوا تھا۔ گیلیے بالوں میں برش کر کے پیڈنک آیا تھا۔ نیم دراز ہو کر اس نے سیل فون اٹھالیا تھا۔ پھر اک نظر ٹائم پر ڈالی۔ گھڑی رات کے ڈھائی بج رہی تھی۔
 ”سوچکی ہوں گی محترمہ!“ سیل فون بائیں پھلی پر مارتے اس نے ہونٹ سکڑ لیے۔ اسی اثناء میں سیل فون پر زندگی کا لنگ کے حرف چمکنے لگے تھے۔

”Think the devil and devil is hear“ سنا تھا آج تجربہ بھی ہو گیا۔“ اس کے لبوں پر بے حد محظوظ کن مسکراہٹ تھی۔ دل شدت سے اس بات کرنے کا متنی تھا اور اس کی کال آ ہی گئی۔ تو اس نے بے ساختہ گفتگو کا آغاز کیا۔

”جی!“ دوسری طرف آنسو اس بے ساختہ انداز پر ٹھنک گئی۔ اسے کال کرنا مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ مبادا سو گیا ہو لیکن اس نے سوچا تھا ٹرائی کر لے۔ چند میل تک نہ اٹھایا تو کال بند کر دے گی۔ اس خیال سے ہی اس نے نمبر ملایا تھا۔ مگر پہلی ہی بیل پر کال پک ہو گئی تھی۔

”نہیں ہی کال کرنے لگا تھا۔ پھر خیال آپنا سوتا رہی ہو۔“

”نہیں نہیں آ رہی تھی۔“ اس نے مجبوری بتائی۔

”تو تم نے سوچا کیوں تا میری بھی نیند اڑا دو۔“ سر کے نیچے اک ہاتھ رکھ کر اس نے شریر لہجے میں کہا۔

”آپ سہ ہے تھے؟“ اسے فکر ہوئی۔ نہیں خسار میں ہوں۔“ اس کا لہجہ شوخی لیے ہوئے تھا۔

”کیسی بھکی بھکی باتیں کر رہے ہیں نشے میں ہیں؟“ وہ پریشان ہونے لگی۔

”او اللہ کی بندی، توبہ کرو۔ ایسے شوق نہیں پالے میں نے۔“ اس نے ہنستے ہوئے اس کی پریشانی دور کی۔ لید کے ساتھ باہر تھا۔ کچھ دیر قبل لوٹا ہوں۔ تم کیوں جاگ رہی ہو؟ رشتہ طے ہونے کی خوشی میں نیند نہیں آ رہی کیا؟“ وہ چیخ رہا تھا۔

”بہی سمجھ لیں میں نے آپ کو تھیکس کہنے کے لیے کال کی تھی۔ آپ نے جس طرح گھر آ کر میرے والدین کو عزت دی معافی مانگی میں اس کے لیے آپ کی احسان مند ہوں۔“ وہ مشکور تھی۔

”مجھے تو یہ کہنا ہی تھا۔ غلطی مام کی تھی۔ خیر چھوڑ تم خوش ہو؟“ اس کا دھیمالہجہ آنسو کے جذبات کو گدگدانے لگا تھا۔

”جی!“ اس نے ہولے سے اعتراف کیا۔

”بس تیار ہو جاؤ، اس ہفتے مسز عرشان بننے کے لیے۔“ اس نے جیسے بم پھوڑا۔

”اتنی جلدی؟“ اس نے بے ساختگی سے دریافت کیا۔

”جی آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“ وہ سوال کر رہا تھا اور آنسو کی نظروں میں اپنے گھر کی معاشی مسائل گھوم گئے تھے۔

”تم کچھ مت سوچو، اب سے تمہاری ساری سوچیں میری، میری ساری خوشیاں تمہاری۔“ وہ واقعی ساحر تھا۔ اک لمحے میں اس کی خاموشی کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

”اور اگر سوچنے کا دل مزید کرے تو عرشان ولی کو سوچ لینا۔ تمہیں اچھا لگے گا۔“ وہ اس قدر لطیف اندازی بات کرتا تھا کہ اس کے لبوں سے ناچنے والی مسکراہٹ چپک کر رہ جاتی تھی۔

”میں فضول باتیں نہیں سوچتی۔“ اس کا کھلکھلاتا جواب آیا تھا۔ آنسو کی ہنسی بے ساختہ تھی جسے اس نے قابو میں کیا۔ رات کے اس وقت اس کی ہنسی سب نے اٹھ کر اس کی کلاس لے لینی تھی۔

کمرے کی زینت بنا دیتا تھا مگر خود سے جدا کرنا گوارا نہیں تھا۔ عرشان ولی وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ بے حد ہمدرد دل رکھتا تھا۔ ماہ بارہ بے حد تک چڑھی اور ماڈرن خاتون ہیں۔ عرشان ولی کی والدہ محترمہ، فرہاد صاحب، ماہ پارہ کے مزاج کے بالکل برخلاف بہت اچھے انسان ہیں۔ ماہ پارہ اور فرہاد صاحب کی تین اولادیں ہیں۔ اسمارا بڑی بیٹی ہے جو اپنے شوہر راجیل اور تین بچوں کے ساتھ شارجہ میں رہتی ہے۔ راجیل لاپٹی انسان ہے۔ اسمارا، ماہ پارہ کی طرح تنگ مزاج ہے۔ اسمارا سے چھوٹا شاہ میر ہے۔ ممئی، شاہ میر کی بیوی ہے جسے کم صورتی کے باعث اکثر ماہ پارہ جلی کٹی سانی تھیں۔ ممئی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے وہ ابھی تک بے اولاد کی کاشکار تھی۔ ممئی سنبھے مزاج کی لڑکی ہے۔ ماہ پارہ کی بیسٹ فرینڈ واصفہ کی دو اولاد ہے۔ کاشان اور زویا۔ کاشان بھورا صفت انسان ہے۔ فلرٹ اس کا سن پسند مشغلہ ہے۔ زویا تک چڑھی لڑکی ہے۔ وہ عرشان ولی کو پسند کرتی ہے۔ اس کی نظر کرم چائل کرنے کے متعلق کرتی رہتی ہے۔ تینوں بچپن سے دوست ہیں۔ آنسو نے زویا سے بڑے بچپن کر کے دوستی کی تھی۔ کاشان کی صورت میں محروم زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ زویا نے کاشان کو پہنچ گیا تھا کہ وہ آنسو سے فلرٹ کر کے دکھائے تو وہ استاد مان لے گی۔ کاشان نے پہنچ قبول کر لیا تھا چلدی ہی اس نے آنسو سے دوستی کر لی۔ اسے سوٹ اور سیل فون گفٹ کیا۔ جدید اسمارٹ فون استعمال کرنا آنسو کو مشکل لگ رہا تھا۔ عرشان ولی، کاشان کو اس کی حرکتوں پر بے نقط کی سناٹا رہا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو کاشان کا دشمن بنی تھیں۔ وہ اپنی محبت اور جذبے اس کے لیے سنبھالے بیٹھا تھا جو صرف اس کی ہوتی۔ ولید عرشان ولی کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ (اب آپ آگے پڑھیں)

☆☆☆

تو کیا جانے میری غریبی کا عالم

اپنے گھر میں سب سے بڑی ہوں میں

گھر میں ہو کا عالم تھا سب اپنی اپنی جگہ پر سو رہے تھے لیکن اس گھر میں پہلی بار سب کے چہروں پر پرسکون مسکراہٹ تھی۔ غریبی کے گرم پھپھروں میں گرم اڑتی ریت پر جیسے کن من ہونے لگی تھی جو آہستہ آہستہ برسات کا روپ دھار چکی تھی۔

آنسو نیم اندھیرے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ آج اس کی سوچ اک الگ زاویے پر بہہ رہی تھی۔

”کیا غریبی کی چادر اس قدر بدنما ہے کہ انسان کا اصل رنگ، لہجہ ڈھانپ دیتی ہے۔ آج کیسے ابا کے اوپر سے خول اتر گیا۔ ان کا بدلا انداز دیکھنے کو ملا۔ ہم ہمیشہ ان کے سخت جملوں، گھورتی نظروں سے خائف رہیں۔ کبھی ان سخت جملوں اور گھورتی نظروں کے راز تک رسائی حاصل کر کے ان کے اندر موجود حساس باپ کو ڈھونڈ نہ سکے اور ان سب کے لیے عرشان ولی کا شکر یہ..... جس نے اپنے وجود کے سحر سے سب بدل دیا ہے۔“

اس کے لب بے ساختہ مسکرائے تھے۔ اس نے بے اختیار سیل فون اٹھا کر گیلری کھولی تھی۔ عرشان ولی کی کتنی ہی سلفی اس میں قید تھیں جو وہ گا رہے ہوا اسے واٹس اپ کرنا رہتا تھا۔ کچھ لوگوں کی صورت دیکھتے ہی اک آسودگی محسوس ہوتی ہے وہ بھی اس وقت آسودگی محسوس کر رہی تھی۔ اس کے والدین کو عزت بخش کر وہ اس کی نظر میں اور معتبر ہو گیا تھا۔ اس سے بات کرنے کی خواہش شدید ہو رہی تھی۔ وہ اس کا شکر یہ تک ادا کر سکی تھی۔ وہ کافی دیر قد و س اور باجرہ کے پاس بیٹھا رہا پھر جانے لگا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

بہت عجیب لڑکی ہے اس کی خاطر میں

پڑھے بغیر حسنیوں کے خط جلا دوں گا

”سونی سے کہو جلدی شربت سیجیے۔“ ہاجرہ پلٹ کر روٹی سے سرگوشی کر رہی تھیں۔ روٹی جلدی سے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔

ہاجرہ نے نیلم کے گھر سے چار کرسیاں اور میز تھوڑی دیر کے لیے ادھار لے لیں تاکہ انہیں بٹھا سکے۔ حنی نے دزدیدہ نظروں سے ماہ پارہ کو دیکھا وہ لالچ سے بیٹھی تھیں۔ سپاٹ تاثرات لیے۔ اور اس کی اہم وجہ عثمان ولی کی وقت رخصت تیبہ تھی۔

”مام! اگر آپ نے آنسو یا اس کی فیملی کی ذرا بھی انسلٹ کی تو میں سمجھوں گا وہ میری انسلٹ ہوئی ہے۔ پھر آپ ساری زندگی کے لیے اپنے بیٹے کو کھو دیں گی۔“ اور ماہ پارہ چپ رہ گئی تھیں۔

”آنسو رکھو بلا لیں آئی! اس کے متعلق تن من کر ملنے ک اشتیاق ہو رہا ہے۔“ حنی نے ماحول میں چھائے سنائے کو ختم کرنے کی سعی کی۔

”ہاں، ہاں آتی ہے۔“ ہاجرہ دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سونی شربت لے کر داخل ہو گئی تھی۔

”سونی آنسو کو بلاؤ جلدی۔“ ہاجرہ نے اسے دیکھتے ہی پیغام دیا وہ سر ہلا کر چلی گئی۔

”آپ لوگ شربت لیں نا۔“ ہاجرہ ماہ پارہ کو دیکھ رہی تھیں جو جب سے آئی تھیں چپ تھیں۔

”آنسو! ہاجرہ نے داخل ہونے پر تعارف کروایا۔ حنی بے اختیار اسے دیکھنے لگی۔

”یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔“ حنی نے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ ماہ پارہ نے آنسو کو دیکھ کر تیوری چڑھا لی تھی۔ اس دن کی بہ نسبت آج وہ تیار تھی اور مزید حسین لگ رہی تھی۔

”بہت پیاری ہو اب سمجھ آیا عثمان کیوں دیوانہ ہوا جا رہا ہے۔“ حنی نے سرگوشی کی تو وہ شرم کر سر جھکا گئی۔ ڈرائیور مٹھائی اور فروس کے ٹوکے لیے داخل ہوا تھا۔

”بی بی انہیں کہاں رکھوں؟“ وہ منتظر تھا۔

”مٹھن میں ہی رکھ دو۔“ حنی ہی سوال و جواب کر رہی تھی۔

”آپ لوگوں نے نا حق تکلیف کی۔“ ہاجرہ شرمندہ سی ہو گئیں۔

”آنسو ہماری ہونے جا رہی ہے آئی یہ سب تو چلتا ہے۔“ حنی نے مسکراتے ہوئے ماحول کی کثافت دور کی۔

”اس جمعہ کو نکاح اور رخصتی چاہ رہے ہیں ہم۔“ اتنی دیر میں ماہ پارہ نے پہلی بار لب کشائی کی تھی۔

”اتنی جلدی؟“ ہاجرہ حیران رہ گئیں۔

”اچھا ہے نا! آئی، نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“ حنی نے بات سنبھالی۔

”میں آنسو کے اباس بات کر لوں تو۔“ ہاجرہ ہچکچا کر چپ ہو گئیں وہ اکیلی کیسے اتنا بڑا فیصلہ کر سکتی تھیں۔

”وہ آپ تسلی سے کرنی رہے گا۔ سونی مٹھائی لے آؤ۔ میں اپنی دیورانی کا منہ تو بیٹھا کرواؤں۔“ حنی خوش دلی سے کہہ رہی تھی۔ سونی بھاگ کر مٹھائی کے ٹوکے سے مٹھائی نکال لائی تھی۔ سب کے چہروں پر خوشی تھی سوائے ماہ پارہ کے۔ وہ جیسے آنکھوں کے آگے ناپسندیدہ کھیل چلتا دیکھ رہی تھیں۔

☆.....☆

عثمان ولی ناول سے پسینہ خشک کرتے سیل فون کان سے لگا گیا تھا۔ یہ مخصوص وقت تھا جم کا۔ اس وقت وہ فروراور بلیک بنیان ایکسپریس سائز میں مصروف تھا مگر اس کا سارا دھیان آنسو کی طرف لگا ہوا تھا۔

☆.....☆

”افسوس سے کیا حاصل چاند تو چڑھا یا عثمان نے۔ اوکے اسارا پھر بات کرتی ہوں اپنا اور بچوں کا خیال رکھنا۔“ ماہ پارہ، اسارا سے کال پر بات کر رہی تھیں۔ فرہاد صاحب دزدیدہ نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

”کبھی تو ان سطحی باتوں سے ہٹ کر سوچا کرو۔“ کیا غریب اور کم حیثیت لوگ انسان نہیں۔ وہ بغور انہیں دیکھ رہے تھے۔ ماہ پارہ خاموش ہی رہیں۔

”وہ نہیں سمجھا یا تھا کہ آنسو کے گھر والوں سے کس طرح ملتا ہے۔ پھر بھی تم نے ان کی بے عزتی کی۔“ فرہاد صاحب کڑے تیوروں سے دیکھ رہے تھے۔

”وہ لوگ اسی لائق تھے۔ نوکری کروانے کے ساتھ لڑکیوں کو اپنے اور اعلا خاندان کے امیر لڑکے جاننے بھیجا تھا انہوں نے۔“ ماہ پارہ کے لفظوں میں حقارت تھی۔

”کسی کی بیٹی کی طرف انگلی اٹھانے سے پہلے سو بار سوچا کرو کہ کردار کشی کی کتنی سخت سزا ہے۔ آنسو اور اس کی فیملی نے اگر ایسا سوچا بھی تو کیا غلط کیا ہر انسان کو اچھا سوچنے کا حق ہے۔ اپنی بیٹی اسارا کا تو سوچو جس نے عیش و عشرت میں آنکھ کھولی اور اک ٹپ پونجے کو پسند کر کے ہمارے سامنے کھڑا کر دیا۔ جس کی لالچ ختم ہونے کا نام

نہیں لے رہی۔“ فرہاد صاحب جارحانہ انداز میں کہہ رہے تھے اور یہ نہیں ماہ پارہ لا جواب ہو گئی تھیں۔

”اب سے اگر تم نے مزید کچھ کیا کوئی شکایت ملی تو یاد رکھنا میں اگلی بار وارنٹک نہیں پیسہ زہماریے منہ پر ماروں گا۔“ فرہاد صاحب غصے سے کہہ کر رخ پھیر گئے تھے۔ ماہ پارہ کھوتی نظر سے ان کی پشت دیکھنے لگی تھیں۔

☆.....☆

”اچھی طرح صفائی کر کے گھر لاک کر دینا۔ ہم زویا اور کا شان کے پاس انگلینڈ جا رہے ہیں۔ گھر کی صفائی لازم ہو ہر چیز جو کی توں ملے۔“ واصلہ فریڈلنگ بیگ لیے ملازم کو ہدایت کر رہی تھیں۔ یہاں ان کا دم بھٹنے لگا تھا۔ کا شان اور زویا سے بات ہوئی تو دونوں نے انہیں بھی تبدیلی آج و ہوا کا مشورہ دیا۔ وہ تیار ہو گئیں تو خرم

صاحب یہاں اکیلے کیا کرتے وہ بھی ساتھ ہو لیے۔

”جی بیگم صلیب۔“ ملازم نے یقین دہانی کروائی۔

”اسے بچوں کو کووارٹیک ہی رکھنا۔ یہ نا ہو ہماری غیر موجودگی میں دندناتے پھریں۔“ وہ تنبیہ کرنا نا بھولی

کہ امیروں کو نا درو نایاب چیزوں کی بڑی فکر رہتی ہے کہیں کچھ خراب نہ ہو جائے۔ پالش نا اتر جائے۔ انسان جذبات اور انسان ان کے لیے معنی نہیں رکھتے۔

”آپ فکر نہ کریں تسلی رہیں۔“ ملازم وفادار اور نمک حلال تھا۔

”سامان رکھو او گاڑی میں۔“ واصلہ حکم دے کر آگے بڑھ گئی تھیں۔ خرم صاحب ہم قدم تھے۔ پیچھے ملازم بیگ لیے آ رہا تھا۔

☆.....☆

”اسلام علیکم!“ روٹی نے دروازہ دیا کیا تھا۔ ماہ پارہ اور حنی اندر داخل ہو رہی تھیں۔

”وعلیکم اسلام۔“ حنی محسن میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی نظریں گھر کا جائزہ ضرور لے رہی تھیں۔ مگر ان میں تنہیک و تحقیر کی بجائے حیرت کے رنگ تھے۔ ہاجرہ تیزی سے ان تک آئی تھیں۔

”آئیے، آئیے۔“ ماہ پارہ اور حنی کمرے میں چلی گئیں تھیں۔

اسلام علیکم! آنسو نے کال ریسیڈ کر لی تھی۔
 ”والسلام! every thing is ok zindagi!“ وہ استفسار کر رہا تھا۔ آنسو اس کی فکر مندی پر مسکرا دی۔ غالباً پچھلے واقعے کے بعد سے وہ بہت کانٹھس ہو گیا تھا۔
 ”جی! اس نے آہستہ آواز سے کہا۔ وہ دوسرے کمرے میں آگئی تھی۔ قدوس صاحب آگئے تو وہ اٹھ کر آگئی تھی۔
 ”مام نے پھر کچھ کیا تو نہیں؟“ وہ تشویش سے پوچھ رہا تھا۔ گوکہ اسے خود پر یقین تھا مگر وہ آنسو کے معاملے میں بے حد پکڑی ہو رہا تھا۔ نہیں قدرے خاموش ہیں۔“ ان کی خاموشی پر اسے بھی حیران ہو رہی تھی۔ عرشان ریلیکس ہو گیا۔

”بھائی سے ملیں؟“
 ”جی نیچر کی اچھی ہیں۔ ابا آگئے ہیں سب وہیں بیٹھے ہیں۔“ اس کا لہجہ دھیمہ تھا۔
 ”تم کیوں اپ سیٹ ہو؟“ اس کا اداس لہجہ چونکا گیا۔
 ”نہیں تو.....“ اس نے جھٹلایا۔

”مجھ سے چھپاؤ گی؟“ گلہ ہوا۔ آنسو کے حلق میں آنسو چھننے لگے۔
 ”عرشان اتنی جلدی سب میری فیملی.....“ اس سے آگے بولا نہ گیا۔ کم مائیگی نے زبان بند کر دی۔ اتنی جلدی اتنا سب کچھ یقیناً اس کے والدین کی نینداڑانے کے لیے کافی تھا۔ جہاں عرشان ولی جیسے بندے کا ہم سفر ہونا باعث راحت تھا وہیں اپنے پیچھے والوں کی بھی دامن کی احساس اسے بے کل کر گیا تھا۔
 ”نکاح اور رخصتی بے حد سادگی سے ہوگی۔ صرف فیملی ممبرز ہوں گے۔ مہمانوں کی فوج جمع کر کے تم تک آنے کے لیے ان کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ میرے اور تمہارے درمیان کسی کی موجودگی مجھے گراں گزرے گی۔ اس لیے نکاح اور رخصتی سادگی سے ہوگی۔ البتہ Grand Reception ہوگا۔“ وہ بے حد محفول وجہ بتا کر اس کی ٹینشن دور کرنے کی سعی کر گیا۔ آنسو چپ سی رہ گئی۔

”اور کوئی پراہلم زندگی؟“ وہ استفسار کر رہا تھا۔
 ”نہیں آپ کہاں ہیں؟“ اس نے یوں ہی برسیل تذکرہ پوچھ لیا۔
 ”جم میں کیوں ملنا ہے.....؟ چارون ہیں صبر کرلو۔ پھر تو ساتھ ہی رہنا ہے۔“ وہ شوشی سے چھڑ رہا تھا۔ اس کے رخسار جلنے لگے۔ ہونٹوں پر شرمیلی مسکان پھیل گئی۔
 ”توبہ! میں تو یوں ہی پوچھ رہی تھی۔“ وہ جھینپ گئی۔
 ”تم بلاؤ گی تو آ بھی جاؤں گا۔ ویسے بھی ابا سے بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا۔
 آنسو بھی مسکرا دی

☆.....☆

ماہ پارہ اور حنیٰ کار میں بیٹھ رہی تھیں۔ ہاجرہ انہیں دروازے تک رخصت کرنے آئی تھیں۔ درخشاں نے دروازے کے سامنے چمکتی کار اور دروازے پر ہاجرہ کو دیکھا تو قدموں کی رفتار تیز کر دی مگر اس کے قریب آنے سے پہلے گاڑی اس کے قریب سے گزر گئی۔
 ”یہ گاڑی میں کون آیا تھا؟“ وہ ابھی تک گردن موڑ کر گلی کے کنارے پر نگاہ جمائے کھڑی تھی۔ گاڑی اب نکل گئی

تھی۔ دروازے پر کھڑی ہاجرہ سے اس نے بے ساختہ استفسار کیا۔ حواس ایسے اڑے کہ سلام دعا سب فراموش کر گئی۔

”ذرا پہلے آ جاتی مل تو لیتی ان لوگوں سے۔“ ہاجرہ نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اس کے اندر آنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔ کون تھیں یہ خواتین اور اتنی ہنگامی گاڑی۔“ درخشاں کی آنکھیں نہیں سلجھ رہی تھی۔
 ”اندر آ کر بیٹھو جاؤ پہلے اکیلی آئی ہو؟“ ہاجرہ نے حیرانی سے اسے دیکھا۔
 ”نہیں گلی تک آصف چھوڑ گئے ہیں اب بتائیں۔“ درخشاں سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے جھٹ پٹنگ پر بیٹھ کر بیہرہ سکڑ لیا۔

”سوئی، روہی درخشاں آئی ہے۔ پانی پلاؤ بہن کو۔“ ہاجرہ نے کمرے کی طرف منہ کرے ہوئے آواز دی تھی۔
 ”رہنے دیں پانی دانی، عورتیں بہت پیسے والی لگ رہی تھیں۔“ اس کی آنکھیں تھیر سے پھیلی ہوئی تھیں۔
 ”ہاں..... آنسو کی ساس اور جھٹانی تھیں۔“ ہاجرہ نے خوشی سے بتایا۔
 ”آپ نے آنسو کا رشتہ کب طے کیا اور مجھے بتایا تک نہیں۔“ درخشاں کی آنکھیں تھیر سے پھٹنے لگیں۔
 ”چند روز پہلے صرف ساس آئی تھیں آج بہو کو ساتھ لے کر آئیں اور آج ہی نکاح کی تاریخ رکھ دی۔ خیر سے اس جمعہ کو نکاح اور رخصتی ہے۔“ ہاجرہ بتا رہی تھیں آنسو بھی اس کا سن کر باہر نکل آئی تھی۔ درخشاں نے اس کے تہمتا تے چہرے کو کھٹا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔ لائیٹ سے میک اپ میں وہ دم رکھ رہی تھی۔

”آپنی پانی،“ روہی نے پانی سے بھر اگلاس پیش کیا تھا۔
 ”ہٹاؤ پرے۔“ درخشاں نے قوت سے ہاتھ اٹھا کر پرے کرنے کا اشارہ کیا۔
 ”کیسے مل گئیں دیکھا۔“ سوئی بھی چلی آئی تھی اور اب آنسو سے جڑ کے ٹپٹپی اس کے کان میں سرگوشی کر گئی۔ آنسو نے کہنی مار کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔
 ”اسنے امیر لوگ مل کیسے گئے۔ لڑکا لپٹا مارل ہے کیا؟“ درخشاں کی زبان کے آگے واقعی خندق تھی۔ ہاجرہ سر پر ہاتھ رکھ گئیں۔

آنسو کے پاس ہیں عرشان بھائی اور لپٹا مارل ہوں آنسو کے دشمن۔ وہ تو اتنے ہندسہ مگڈ لنگ ہیں کہ آپ دیکھ کر بے ہوش ہو جائیں گی۔“ سوئی نے بہت اچھی طرح اسے جواب دیا تھا۔ درخشاں کے تواسرے تلوں تک لگ گئی۔
 ”تو رنگ لے ہی آیا تمہارا باہر نکلتا۔“ درخشاں طنزیہ نظروں سے آنسو کو گھور رہی تھی۔ اس نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔

”اور اماں! آپ نے بڑی بیٹی اور داماد کو پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہ کی۔ اور بالا ہی بالا سب طے کر لیا۔“ اب اس کی توپوں کا رخ ہاجرہ کی طرف ہو گیا۔
 ”سب کچھ چند روز میں ہی ہوا تمہیں بلانے ہی والی تھی۔“ ہاجرہ نے اس کا گلہ دور کرنا چاہا۔

”ابا کیسے مان گئے؟“ اسے کھد بدگئی ہوئی تھی۔
 ”ابا کی بہت اچھی دوستی ہوگئی ہے عرشان بھائی سے اور آج کل ابا کا مزاج بہت اچھا ہے۔“ سوئی نے جلتی پر پیروں ڈالا۔ وہ مزید ہندسہ ہوگی۔ اس وقت تو چپ کر کے خالی آنسو کو گھورتی رہی مگر جب قدوس صاحب باہر سے آئے تو وہ دوبارہ سے اپنے لفظوں کے جوہر دکھانے لگی۔
 ”مجھے تو بہت حیرت ہے ابا کہ آپ مان گئے۔“ تینوں اٹھ کر اپنے اپنے کاموں میں لگ گئی تھیں مگر سب کی سماعت

باہر لگی ہوئی تھی۔

”تو برا کیا کیا؟“ ہاجرہ کو اب کے اس کی باتوں پر غصہ آنے لگا۔

”اماں! یہ پیسے والے لڑکے عادات و اطوار کے بالکل ٹھیک نہیں ہوتے۔ جانے کتنی لڑکیوں سے راہ و رسم رکھتے ہیں۔“ وہ رازدارانہ انداز میں آواز دھیمی کر کے کہہ رہی تھی تاکہ بات میں وزن پیدا ہو۔

”درخشاں تو کچھ زیادہ بے باک نہیں ہوگئی؟ باپ کے سامنے کیسی باتیں کر رہی ہے۔“ ہاجرہ نے ناگواری سے اسے ٹوک دیا۔

”سچ کہہ رہی ہوں لیکن آپ لوگوں کی آنکھوں میں دولت کی پٹی بندھ گئی ہے۔“ وہ برامان گئی۔ ساری کوشش بے سود جاری رہی تھی۔

”تو یہ کہہنا کہ ہمیشہ کی طرح آنسو سے جل رہی ہے۔ تجھ سے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی کہ اتنی اچھی جگہ اس کا رشتہ ہو رہا ہے۔“ ہاجرہ نے ٹھیک ٹھاک سنا دی وہ ہلایا لگی۔

”مجھے کیا کر دس شادی، میں تو بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔ کل کو سر پڑ کر روئیں گی تو میری باتیں یاد آئیں گی۔“ وہ داتا بنی انہیں پشیمان پڑھا رہی تھی۔

”ہم عرشان سے مل چکے ہیں وہ بہت اچھا بچہ ہے۔“ قدوس صاحب کی تعریف نے رہی سہی آس بھی ختم کر دی۔ وہ اپنا سامنہ لے کر رہ گئی۔

☆.....☆

ہم سے اک لمحہ گفتگو کرلو

ہم نے صدیوں تمہیں بکا رہے

عرشان ولی پینک سے نکل رہا تھا اس نے بے ساختہ آنسو کا نہر ملا یا تھا۔ دن بھر بیٹکڑوں کا لڑ آنے کے باوجود ایک یہ ہی نمبر سب سے اوپر جگہ گزار رہا تھا۔ آنسو کو بھی اس کی ہر دھمک پر کال کرنے کی ادا کی عادت ہو گئی تھی تب ہی وہ اک پل کے لیے بھی سیل فون سے غافل نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ چاول کی تھال لیے چاول صاف کر رہی تھی جب عرشان ولی کی تصویر جھلملانے لگی۔

”السلام علیکم!“ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”والسلام! کیا کر رہی ہو؟“ وہ واک کرتے کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”کچھ خاص نہیں بور ہو رہی ہوں۔ آپ نے آفس جانے سے بھی منع کر دیا۔“ اس نے چاول سے نکلر چنتے جیسے شکایت کی۔

”شادی میں تین دن رہ گئے ہیں۔ نئی زندگی کی پلاننگ کرو آفس جا کے کیا کرنا ہے۔“ وہ گاڑی تک آ گیا تھا۔ مسٹر ڈ جینز پر اس نے بلیک ٹی شرٹ پہن رکھی تھی آنکھوں پر گلاسز لگے ہوئے تھے۔ وہ کار کا دروازہ کھول رہا تھا۔

”جی بہتر!“ اسے مانتے ہی بنی

”پندرہ منٹ ہیں تمہارے پاس فوراً تیار ہو جاؤ۔“ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے اس نے حکم دیا۔

”کیوں؟“ وہ بے طرح چونک گئی۔

”میں تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔ شادی کی شاپنگ کرنی ہے۔“

”لیکن عرشان..... اماں ابا۔“ اس شادی فرمان نے اس کے ہوش اڑا دیے۔ وہ کیا بہانہ کرتی۔ آفس سے عرشان نے

ریزا کن کروا دیا تھا۔ کوچنگ میں بھی اس نے چھوڑنے کے حوالے سے کال کر دی تھی۔

”اماں ابا سے میں خود آ کر اجازت لے لوں گا۔ تم بس تیار ہو جاؤ۔ اوکے؟“ وہ حتیٰ لچھے میں کہہ کر فون بند کر گیا۔

”عرشان!“ وہ اسے روکتی رہ گئی مگر کال کٹ چکی تھی۔ چاول کی تھال چھوڑ کر وہ الماری تک بڑھی کہ کوئی ڈھنگ کا سوٹ نکال لے مگر پھر اس خیال سے پیچھے ہٹ گئی کہ جانے ہاجرہ اور قدوس اجازت بھی دیتے ہیں یا نہیں۔ ان ہی سوچوں میں وہ کمرے کے چکر لگانے لگی۔

”کیا ہو گیا۔ کیوں سلیج پیر کی ٹلی بنی ہوئی ہو؟“ سونی نے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ کچھ الجھی ہوئی لگ رہی تھی۔

”یہ عرشان نا۔“ آنسو تھک کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ آدھے ادھورے جملے میں محبت بھری شکایت تھی۔

”اب کیا کرو دیا یہاں نے؟“ سونی ہنسی۔

”مجھے تیار ہونے کا آرڈر دیا ہے۔ پندرہ منٹ میں۔ شاپنگ پر لے کر جائیں گے۔“ اس نے منہ بسور کر اپنی پریشانی بیان کی۔

”اور اماں ابا سے کیا کہو گی۔“ سونی نے فکر مندی سے پوچھا۔

”عرشان آ رہے ہیں اجازت لینے۔“ اطلاع دی۔

”پھر کیوں مینشن لے رہی ہو۔ اتنا اچھا لائف پارٹنر ملا ہے جو ہر کچھ خود فیس کر کے تمہیں بچا لیتا ہے یاد ہے اس دن ماہ پارہ آئی کے جانے کے بعد ابا کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ قریب تھا تمہیں جان سے مار دیتے۔ عرشان بھائی نے تمہاری روتی شکل دیکھ کر کیسے ضبط کیا تھا۔ میں نے بخوبی نوٹس کیا۔ کیسے ابا کو کہہ رہے تھے انہیں سزا دی جائے تمہیں نہیں.....“ سونی فلش بیک میں چلی گئی تھی۔

آنسو کے لبوں پر بھی آسودہ مسکراہٹ آ گئی تھی۔

”ہاں یہ تو ہے۔ عرشان کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شجر سایہ دار جس کے ہونے سے دنیا کی کوئی آفت مجھ تک نہیں آ پائی گی۔“ وہ مطمئن تھی۔

پھر پریشان کیوں ہوتی ہو۔“ سونی نے سمجھایا۔

”اماں، ابا کیا سوچیں گے۔ پھر درخشاں بھی اتنا کہہ کر گئی ہے۔“ وہ متحیر تھی۔

”بھاڑ میں ڈالو سب فکر و کو۔ آپنی جب سے آئیں تھیں اماں ابا کے کان ہی بھرے جاری تھیں کہ کس طرح رشتہ ختم ہو۔ وہ تو امانے منہ کی سناٹی تو برامان کے چلی گئی۔ اچھا ہی ہوا۔“ سونی نے ناگواری سے کہتے آخر میں اطمینان کا اظہار کیا۔

اسی ٹاپے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ دونوں نے اک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”جاؤ آگے تمہارے طلب گار۔“ سونی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ متفکر نظروں سے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

یہ دل دیار محبت میں خاک ہو جائے

بھی ناماند پڑے تیری آرزو مجھ میں

”اتنی خاموش کیوں ہو؟“ وہ اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر برامان تھی۔ عرشان ولی نے قدوس اور ہاجرہ سے جانے کیا کہا تھا کہ اگلے ہی لمحے ہاجرہ نے روٹی کو آواز دے کر آنسو کے لیے تیار ہونے کا پیغام بھیج دیا۔ روٹی تو بھاگ کر اس کا موٹ آؤن کرنے لگی۔ عرشان ولی نے خود سونی سے چائے کی فرمائش کی تو وہ دلچسپی سے چائے بنا کر اندر دے آئی تھی۔

جب تک اس کی چائے شمع ہوئی وہ تیار بھی ہوگئی۔ جس میں دونوں بہنوں نے بھرپور ساتھ دیا تھا۔ رونی نے کپڑے آئرن کر کے لٹکاے تب تک وہ منہ دھو چکی تھی۔ چادر لے کر تیار ہوئی تو سونے نے پکڑ کر لائیت سافا وٹو لیشن، کا جل کے ساتھ گلاس بھی لگا دیا۔

”شاپنگ پر جارہی ہو میت میں تھوڑی۔“ اس کے منع کرنے پر سونے نے گھر کا تھا۔ ماں باپ کے سامنے عرشان کے ساتھ باجانا اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ اپنی پرانی سینڈل پہننا چاہی تو سونے نے جھٹ اپنی جوتی لاکر اس کے پیروں کے پاس رکھ کر اس کی سینڈل پر سے کر دی۔

”یہ پہنو، وہ گندی لگ رہی ہے۔“ اور اس محبت بھرے عمل پر وہ اپنی بہنوں کی شکر گزار تھی۔

”حیران ہوں، اماں ابانے اجازت کیسے دے دی۔“ اس نے حیرت کو زبان دی۔

”تم عرشان ولی کی مسز بننے جا رہی ہو، عرشان ولی ہر ناممکن کو ممکن کرنا جانتا ہے۔“ وہ ڈرائیو کرتے شرارتا کہہ رہا تھا۔ ”ابا جس طرح آپ کے گمن گانے لگے ہیں اور جس طرح مجھے آپ کے ساتھ بھیج دیا اس کے بعد تو ماننا پڑے گا۔“ اس نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

”شکریہ!“ اس نے کالر کو چٹکی سے پکڑ کر چھٹکا دیا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ سرنٹی میں ہلا کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

”پہلے ڈیزائنر کے پاس جائیں گے اس کے بعد جیولر پھر تمہاری Excesries لیں گے اس کے بعد نہایت شرافت سے تمہیں گھر ڈراپ کر دوں گا۔“ وہ معصومانہ انداز میں پلاننگ بنا گیا۔ آنسو نے اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت روٹین کے حلیے میں تھا۔ بلیک ٹی شرٹ بہت سج رہی تھی اس پر۔

”آپ Causal Dress میں زیادہ اچھے لگتے ہیں۔“ وہ بے ساختہ تعریف کر گئی۔

”یعنی سوئنگ میں اچھا نہیں لگتا؟“ وہ مصنوعی مسکرائے منہ بنا گیا۔

”اس میں بھی اچھے لگتے ہیں لیکن جینز جیکٹ زیادہ سوٹ کرتی ہے۔ سوئنگ میں کھڑوں ہاس لگتے ہیں!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہو تو نکاح میں نینز جیکٹ پہن لوں تاکہ تمہیں اچھا لگوں۔“ وہ خوشی سے کہہ کر پیچھے سے چاکلیٹ کا ڈبا اٹھا کر اس کی گود میں رکھ گیا۔

”آپ مجھے ہر روپ میں اچھے لگتے ہیں۔“ وہ بے اختیار کہہ گئی۔

”کیوں ایسے رومینک ڈائیکوگ بول کر جذبہ بانی کر رہی ہو؟“ وہ شریہ ہو رہا تھا۔ آنسو شرما کر رخ کھڑکی کی طرف کر گئی۔

”اب منہ پھیرنے کو بھی نہیں کہا میں نے ادھر دیکھو۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر گمیر پر رکھ کر اپنا ہاتھ اوپر رکھ لیتا ہے۔ وہ گود میں دھرے چاکلیٹ باکس کو دیکھ کر حیا سے سرخ پڑنے لگتی ہے۔

”کس قدر شرمانی ہو اف!“ وہ ہنس رہا تھا۔

☆.....☆

برائینڈل ڈریس لے کر وہ جیولر کی شاپ پر آ گئے تھے۔

”سیٹ تیار ہو گئے؟“ وہ دریافت کر رہا تھا اور آنسو جگر جگر کرتے ٹیکس کو دیکھ رہی تھی۔

”جی تیار ہیں۔“ جیولر کی شاپ کا اسٹاف خوش دلی سے گویا تھا۔ جیولر نے نئی ڈبے دھڑ دھڑ کھول دیے تھے۔

”پسند آیا؟“ وہ آنسو کے عقب میں کھڑا استفسار کر رہا تھا۔

”جی بہت خوب صورت ہیں سب۔“ اس نے ذرا سا گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

”باقی سیٹ تو پیک کر دیں لیکن اس کے علاوہ کوئی اور دکھائیں۔“ اک ڈبے کو پیچھے کھسکا کر عرشان ولی نے باقی کے ڈبے پیک کرنے کا اشارہ کیا۔ جیولر کی شاپ کا آئرن چوٹک گیا۔ تمام کلائنٹ کو چھوڑ کر وہ ان تک آیا تھا۔ کیوں سر، آپ نے یہ بھی آرڈر پر ہوا ہے۔“ وہ متعجب تھا۔

”آپ نے غلوں کا سائز چھوٹا کر دیا ہے۔“ اسے اعتراض ہوا۔

”سر بنانے میں تھوڑا فرق تو ہو ہی جاتا ہے۔“ آنسو نے سمجھانا چاہا۔

”You know میں Conpromise نہیں کرتا۔ کام میں perfection آپ کو لانے کی ضرورت ہے۔ کوئی اور ہے تو دکھائیں۔“

”عرشان لے لیں۔ اچھا لگ رہا ہے۔“ آنسو نے کہا تھا مگر عرشان ولی کی سنجیدہ نظر نے اسے چپ کر دیا۔ جیولر نے مزید کئی سیٹ نکال کر سامنے رکھے تھے۔ جس میں سے اسے اللہ اللہ کر کے اک اسے پسند آئی گیا تھا۔ اتنے سارے سیٹ دیکھ کر آنسو کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

واپسی میں وہ ڈر کر کہنے ہوئے آئے تھے۔ آنسو اس کے مقابل بیٹھی تھی۔ ہوٹل کا ماحول بے حد خواب ناک تھا۔ اسے یہ سب ایک خواب لگ رہا تھا۔

”آپ نے وہ سیٹ reject کر دیا۔ اک معمولی سے نقص پر؟“ اسے ابھی تک حیرانی ہو رہی تھی۔

”ہاں بس perfection پر پورا نہیں اتر رہی تھی۔“ ویٹر کو اشارہ کرنے کے لیے عرشان ولی نے ہاتھ اٹھایا تھا تب ہی اس کا بازو اس کی نظروں کی زد میں آ گیا۔

”بازو پر یہ نشان کیسا ہے چوٹ لگی تھی؟“ وہ اس کے بازو پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔ عرشان ولی نے بھی نظر ڈالی تھی۔ پھر منہ بنا لیا۔

”کچھ عرصہ پہلے گولی لگی تھی۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا۔

”گولی..... کیسے.....“ وہ اچھل گئی۔

”یہ قصہ اتنی بار ہر اچکا ہوں کہ چڑی ہو گئی تھی۔“ اس نے سر جھٹکا۔

”اگر اتنا ہر Experiancel ہے تو رہنے دیں۔“ اس کے موڈ کے پیش نظر اس نے منع کرنا چاہا۔

”تم سے شکر کر سکتا ہوں۔ تمہارے لیے تو جان حاضر ہے۔“ اس نے مسکراتی ہوئی نظر ڈالی تھی۔ وہ ہاتھ روک کر اس کی طرف متوجہ تھی۔

”مارٹنگ نام تھا۔ میں آفس جا رہا تھا۔ اک لڑکی کو چند لڑکے اغوا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لڑکی مدد کے لیے شور کر رہی تھی۔“ عرشان ولی نے کہنا شروع کیا تھا اور آنسو کے لب مسکراتا شروع ہو گئے تھے۔ چہرے پر بے یقینی کے تاثرات رنگ جمانے لگے تھے۔ میں نے لڑکی کی مدد کرنے کی کوشش کی اس سے پہلے کہ کچھ کرتا۔ ان میں سے اک نے لڑکر دیا۔ گولی بازو کو چیرتی نکل گئی۔ سر پتھر پر لگا تھا سو میں بے ہوش ہو گیا تھا۔“ آنسو کے ارد گرد دھماکے ہونے لگے تھے۔ وہ بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے عرشان ولی کو دیکھنے لگی تھی۔

”عرشان وہی شخص ہے جس نے اس دن مجھے بچایا تھا۔ کیا اسے بتاؤں کہ وہ لڑکی میں ہوں۔“ اس کے اندر جنگ چلنے لگی تھی۔ تحریک میں کسی طور کی نہیں آ رہی تھی۔

”کون لڑی تھی۔ آپ نے دیکھا تھا اسے۔“ اس کی پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ جانے کون لڑی تھی۔ اس نے اتنی چپ حرکت کی کہ میرے سیل سے اپنا نمبر ڈائل کر کے میرا نمبر بھی لے لیا۔ اور دیدہ دلیری سے کال کر کے میرا حال بھی پوچھنے لگی۔ ”وہ بے زاری سے کہہ رہا تھا اور آنسو کو اپنی اور اس کی فون پر ہوئی بات پورے سیاق و سباق سے یاد آنے لگی۔ کتنا بے زار اور روڈ انداز تھا اس کا کس طرح گلا توڑ جواب دے کر اسے کال کرنے سے منع کیا تھا اس نے۔۔۔۔۔ اور اس نے ایک سینکڑی دیری کیے بناء وہ نمبر Delete کر دیا تھا۔

کیا خبر تھی کہ وہی رنگ نمبر جس کے ہندسوں پر بھی کبھی دونوں نے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی وہی نمبر ان کا راحیث نمبر بن جائے گا۔ اک پل کو اسے لگا کہ اسے عرفشان ولی سے چھپا نا نہیں چاہیے مگر اگلے ہی پل عرفشان ولی کے جملے نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ مجھے ایسی لڑکیوں سے نفرت ہے جو یوں منہ اٹھا کر کسی کو بھی کال کر دیتی ہیں، صرف رسم و راہ بوجھانے کے لیے۔“ وہ نظریں ڈنر پر مرکوز کر گیا تھا۔

”اگر جو عرفشان کو پتا چل جائے بھی کہ وہ لڑکی میں ہوں تو۔۔۔۔۔“ اور اس سوچ سے آگے ہی اس کی سوچ کی اڑان ختم ہو گئی تھی۔

”تم کیوں پریشان ہو؟“ عرفشان ولی اس کے پریشان چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ آنسو نے سرعت سے خود کو کمپوز کر کے گئی میں سر ہلایا تھا۔

”پریشان نہیں ہو رہی آپ کی تکلیف کا احساس ہو رہا ہے۔ اک امتحان لڑی کے لیے آپ نے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔“ وہ جلدی میں بات بنا گئی کہ مبادا اس سے پہلے وہ مزید تفتیش شروع کر دے۔

”تم پہلے نہیں لی تھیں نا مل جائیں تو ایسی حماقت نہیں کرتا۔“ اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے وہ خوشی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی رفاقت میں شاداں و فرحان وہ بہت آسودہ لگ رہا تھا۔ وجہ تو وہ پہلے بھی بے حد محتاط تو اک الگ طرح کا سا نکھار اس کے چہرے سے جھلکنے لگا تھا۔ اس کی محبت بھری نظروں کا ارتکاز اپنے چہرے پر محسوس کر کے آنسو مسکرا کر ذرا سا رخ موڑ گئی تھی۔ چہرے پر شریکیں رنگ پھیل گئے تھے۔ لیکن عرفشان ولی کو اس کی ادا ذرا بھی پسند نہیں آئی تھی تب ہی وہ اس کا بازو پکڑ کر جھٹکے سے اس کا رخ اپنی طرف کر گیا تھا۔ انداز کسی حد تک جارحانہ تھا۔ آنسو راک دم سے متوحش نظر آنے لگی تھی۔ وہ استعجاب بھری نظریں عرفشان ولی پر جمائے جیسے اس کے عمل کی وجہ پوچھ رہی تھی۔

”میں بالکل پسند نہیں کروں گا کہ تم کبھی مجھ سے رخ پھیر کر بیٹھو۔ تمہارا چہرہ ہر وقت ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے ہونا چاہیے۔“ عرفشان ولی محبت کی شدت لہجے میں سمو کر لگا ہوں میں بسا کر گویا تھا۔ آنسو بے حد جراتی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ اتنی دیوانگی اتنی جنونیت۔

☆.....☆

”کیوں ہم کو سنا تے جو جہنم کے فسانے اس دور میں چین کی سزا کم تو نہیں ہے“

ہاجرہ ترپائی کر رہی تھیں۔ قدوس صاحب چارپائی پر لیٹے اندھیری رات پر نظریں جمائے آسمان پر ٹمٹماتے دور دور سے جھپکتے ستاروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے پر کس قدر اندھیر لگی تھی۔ ہاجرہ ترپائی کرتے گا ہے لگا ہے ان پر بھی نظر ڈال لیتی تھیں۔ جب سے آنسو کی شادی طے ہوئی تھی ہاجرہ محسوس کر رہی تھیں۔ قدوس صاحب چپ چپ سے رہنے لگے تھے۔ بے شک آنسو اس گھر کا کماؤ پوت بھی اور اس کی شادی طے ہو جانا

جہاں بے حد خوشی کی علامت تھی وہیں مسائل بھی منہ بھاڑے کھڑے تھے۔

”آنسو کی شادی کے بعد گھر کیسے چلے گا قدوس صاحب؟“ ہاجرہ فکر مندی سے دریافت کر گئی تھیں۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا تھا۔ امید تو یہ ہی تھی کہ جواب میں کوئی چنگاڑ ہی سننے کو ملے گی۔ مگر جب وہ بولنے لگے تو ہاجرہ کو بے حد حیرانگی ہونے لگی۔

”میں نے کئی جگہوں پر بات کر رکھی ہے نوکری کی، اللہ نے چاہا تو جواب جلد آ جائے گا۔“ ان کے نرم اور دھیسے لہجے پر ہاجرہ کو بے حد حیرت ہوئی تھی۔ مگر انہوں نے غاہ نہیں ہونے دیا۔

”اللہ کرے جلد کوئی وسیلہ بن جائے، آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔“ ہاجرہ کے لیے ان کا یہ روپ اور انداز خاصا حیران کن تھا جس کا انہوں نے اظہار بھی کر دیا۔

”اپنی کم مائیگی پر افسردہ ہوں۔۔۔۔۔ بیٹی رخصت ہوگی اور جہیز کے نام پر دینے کے لیے میرے پاس چار چیزیں بھی نہیں ہیں۔“ قدوس صاحب جن کی گھن گرج سہتہ ہاجرہ نے پوری زندگی بتا دی تھی آج ان کے سچے میں کی محسوس کر کے چپ سی رہ گئیں۔

”بیٹیوں کو بوجھ بھٹنے والے مجھ جیسے انسانوں پر اسی وقت کھلتا ہے جب بیٹیاں رخصت ہونے لگتی ہیں کہ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں بلکہ آپ کا بوجھ کم کرتی ہیں۔ کبھی نوکری کر کے بھی گھر کے امور میں حصہ لے کے۔ بیٹیوں کی پیدائش پر میں نے ہر اک کی باری میں ناخوشی کا اظہار کیا۔ میرا بازو بٹنے والے بیٹے کیوں نہیں آتے، ہر بار یہ ہی گلا ہوتا تھا۔ بیٹیاں سینے پر موگ دی محسوس ہوتی تھیں لیکن اب جب اک بیٹی رخصت ہونے لگی تو احساس ہو رہا ہے کتنے نادان ہیں ہم جیسے لوگ۔۔۔۔۔ بیس بائیس حد سے حد تیس سال تک بیٹیاں باپ کے گھر رہتی ہیں اور اپنی عمر کا دو گنا حصہ سسرال میں گزارتی ہیں۔ نادانی، لالائی کا دور ماں باپ کے گھر گزار کر اک نئے سفر، نئے امتحان کو چل دیتی ہیں۔ جہاں کے نا محول کی خبر ہوتی ہے نا انسانوں کی عادات طور طریقوں کی۔ وہ اک بار پھر جیسے بچپن میں چلی جاتی ہیں۔ نئے سرے سے سب سمجھتی ہیں۔ سب سیکھتی ہیں تاکہ نئے ماحول میں ایڈجسٹ کر سکیں۔ پیدا ہونا ان کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ امیر کے گھر ہونا ہے یا غریب کے۔ وہ صابروں کا کر رہتی ہیں۔ مگر کیا گھر نیا ہم سفر بھی انہیں اچھا نالے تو بیٹیاں کیا کریں؟ کس سے گلہ کریں؟۔۔۔۔۔ آج مجھے حقیقت اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس شدت سے ہو رہا ہے کہ میں انہیں کچھ ناوے سکا ساری عمر کم محبت ہی دے دیتا تو آج میرے گھر میں گھستے ہی یہ سب کونے کھدروں میں تو نا چھپنے کی کرتیں۔“

قدوس صاحب دل گرفتگی سے گویا تھے۔ ہاجرہ کا منہ کھلتا چلا جا رہا تھا۔ اتنی تبدیلی، اتنا بدلاؤ، حقیقتاً بیٹیوں کی ہمدانی کا احساس اک باپ کو بخیر خود گیا تھا۔ قدوس صاحب کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو جھللا رہے تھے۔ انہوں نے کتنے ہی ماہ و سال بچوں سے فاصلے پر گزار دیے تھے اور آج جب وہ اک اک کر کے رخصت ہونے لگی تھیں تو انہیں اکیلے پن کا احساس بچھو بن کر ڈنک مارنے لگا تھا۔

ہاجرہ بھی دل گرفتگی ہو گئی تھیں۔

”آپ دل برانا کریں۔ بچیاں بہت محبت کرتی ہیں آپ سے بس آپ نے شروع سے جو رعب رکھا ہے اس کے باعث ڈرتی ہیں سامنے اٹھنے بیٹھنے سے۔“ اب جب قدوس صاحب کو بیٹے دنوں پر کسک ہو رہی تھی تو ایسے میں ان کا فرض تھا کہ وہ ان کے بچ کا خلا دور کریں۔

”یہ ہی تو افسوس ہے میں نے محبت کا نہیں اپنی بیٹیوں کے ساتھ ڈر کا رشتہ قائم رکھا۔“ قدوس صاحب ملول

سے ہو گئے۔
 ”دیر کبھی بھی نہیں ہوتی قدوس صاحب! آپ اب بھی بچیوں کو اپنی محبت کا احساس دلا دیتے ہیں۔“ ہاجرہ کے سمجھانے پر قدوس صاحب سر ہلانے لگے تھے۔
 آنسو کی شادی کوئی عام بات نہ تھی جو ہو جاتی اور کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس کے جانے کے تصور نے ہی قدوس صاحب کو ہنسنے پر مجبور کر رکھا تھا۔
 ”کم عمری سے ہی بہت محنت کی ہے آنسو نے۔ چھوٹی عمر سے گھر کے اخراجات کے لیے چار پیسے کر کے دیے اس نے..... اللہ نے اس کا صلہ دیا اسے کروڑوں میں ایک رشتہ کر دیا۔ میں تو بہت خوش ہوں، اللہ میری بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ ہاجرہ خوشی کا اظہار کر رہی تھیں عثمان ولی سے مل کر تو قدوس بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ انہیں پوری امید تھی آنسو بہت خوش رہے گی۔ ہاجرہ کے اختتامی جملے پر انہوں نے دل ہی دل میں آمین کہا تھا۔

☆.....☆

”لان کی صفائی بہت اچھی ہونی چاہیے، مجھے اے ٹو زیڈ سب پرفیکٹ چاہیے۔“
 ماہ پارہ ملازم کو ہدایت کر رہی تھیں۔ ملازم ان کی ہدایت سننا سر ہلا رہا تھا۔ عثمان ولی کی گاڑی اسی دم اندر داخل ہوئی تھی۔ چابی ملازم کے سپرد کرتے وہ ماہ پارہ کے پاس چلا آیا تھا جولان کے پتوں بچ کھڑی جانے کیا ہدایت کر رہی تھیں۔

”کس چیز کی تیاری ہے ماہ؟“

”تمہاری مایوں کی۔“ ماہ پارہ نے اسے جواب دے کر ملازم کو کام شروع کرنے کا اشارہ کیا وہ کٹر لے کر لان کی گھاس پر چلانے لگا۔

ماہ پارہ ملازم پر نظر میں جمائے اسے جواب سے نوازی رہی تھیں۔

”مام! لیکن کیوں؟“ وہ حیرانگی سے دریافت کر رہا تھا۔ ماہ پارہ بے ساختہ اس کی طرف پلٹی تھیں۔
 ”ہر چیز میں اپنی مرضی چلا رہے ہو۔ کیا میں اپنی مرضی سے تمہاری مایوں کی رسم بھی نہیں رکھ سکتی؟ شہر کی کریم کو بھی تو پتا چلے میرے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے۔“ ماہ پارہ حلقی بھرے لہجے میں نزوٹھے انداز سے گویا تھیں۔
 عثمان ولی کو بھی احساس ہو گیا تھا وہ ہر چیز میں اپنی من مانی کر رہا تھا۔ بحیثیت ماں ان کے بھی کچھ ارمان ہوں گے۔ عثمان ولی نے محبت سے انہیں قریب کر لیا تھا۔

”اوکے جیسی آپ کی مرضی۔“ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ راضی ہو گئیں۔“ عثمان ولی ماہ پارہ کی ضدی فطرت سے واقف تھا اتنے انکار کے بعد ان کا مانا جاننا ہی خاصا حیران کن تھا۔ کیا کہ وہ دلچسپی بھی لے رہی تھیں۔
 عثمان ولی کا خیال تھا۔ وہ مارے باندھے راضی تو ہو گئی ہیں۔ شاید منہ سجا کر الگ تھلگ رہیں مگر ان کے عمل نے اسے خوشی دی تھی۔

”کیسے راضی نہ ہوتی میرے اور کون سے چار پانچ بچے ہیں اک تمہاری ہی شادی کا ارمان لیے بیٹھی تھی۔“
 ماہ پارہ لہجے میں محبت سمو کے بول رہی تھیں عثمان ولی نے بے ساختہ ان کے شانے پر سر رکھ دیا۔

”So sweet of you Mom!“ چاہو تو آنسو اور اس کی فیملی کو بھی مدعو کر لو، ساتھ ہی رسمیں ہو جائیں گی۔“

ماہ پارہ نے خیال ظاہر کیا تو عثمان ولی نے بھی پر سوچ انداز میں ہونٹ سکینر لیے۔
 ”میرا خیال ہے Uncomfortable ہوں گے مام! پھر بھی آپ کی خواہش پر میں آنسو سے پوچھ کر آپ کو بتا دوں گا۔“ عثمان ولی مسکراتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا تھا۔
 ”ٹٹ پونچے لوگ Uncomfortable ہی ٹٹل کریں گے۔ ان کا Comfort Zone تو کبائے والے کے پاس ہی ہوگا۔“ ماہ پارہ بری طرح جھلس گئی تھیں کہ ابھی آنسو اس گھر میں آئی بھی نہیں تھی اور ان کا بیٹا ابھی سے ہر کچھ اس سے پوچھ کر اس کی منشا پر کر رہا تھا۔ انہیں آنسو کے ہاتھوں ہونی شکست پر سوائے تلملانے کے کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔

☆.....☆

اس کی ذات سے منسوب ہیں تمام قصے

وہی اک شخص سرمایہ حیات ٹہرا

”عثمان میرے اتنے نزدیک تھے اور میں نے انہیں دیکھا تک نہیں۔“ آنسو سنجیدہ تاثرات کے ساتھ منڈیر سے کہنے لگا کئے کھڑی تھی۔

”کیا یہ بریکنگ نیوز میڈیا پر چل گئی ہے۔“ عثمان ولی کا جھنجھلا ہوا لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔
 ”کس قدر گراں گزرا تھا انہیں میرا کال کر کے پوچھنا۔“ اس کی سماعت پر وہ بے زار انداز بھگتانے والا لہجہ گو بجنے لگا تھا۔

”میں انہیں کبھی نہیں بتاؤں گی کہ میں ہی وہ لڑکی تھی۔ سچ جان کر جانے وہ کیسا بی ہو کر میں عثمان کو کھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔“ وہ اس کی انتہا پسند طبیعت سے بہت اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ تب ہی اس نے اپنے خیال کی خود ہی نفی کر دی۔

”تم یہاں ہو؟ ہم تمہیں کب سے نیچے ڈھونڈ رہے تھے۔“ روبی اور سونی میٹرھیوں سے نمودار ہوئی تھیں۔
 اسے یہاں موجود پا کر دونوں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

”کیوں ڈھونڈ رہی تھیں؟“ نکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر آنسو نے دو تین بل دے کر ہائیں شولڈر پر دھریا تھا۔

”ابن کی رسم کے لیے تم نے عثمان بھائی کو تو منع کر دیا۔ لیکن میڈم ابن تو آپ کو لگے گی ہی۔ آجائیں جلدی۔“ ابن کا پاؤں لیے روبی پلنگ پر بیٹھ گئی تھی۔

عثمان نے تھوڑی دیر پہل کال کر کے ماہ پارہ کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن آنسو نے سبھاؤ سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اپنے گھر والوں کی سوچ کا پتا تھا۔ اپنے مالی حالات کی بھی خبر تھی۔ ان بے چاروں کے پاس تو مایوں کے نام پر پیلے رنگ کی دھبی بھی نہ تھی پھر وہ کیسے شہر کی کریم کے سامنے جا کر سر اٹھا کر مایوں کی رسم کرتے۔

عثمان ولی کو بھی احساس تھا۔ تب ہی اس نے ماہ پارہ کو انکار کر دیا تھا لیکن آنسو کی آرا جاننے کے بعد ہی۔
 ”میں نہیں لگا رہی، مجھے اس کی اسمیل پسند نہیں۔“ آنسو نے ناگواری سے منہ بنا کر انکار کر دیا۔

”بیٹھ جاؤ شرافت سے، وہ دیکھن ہی کیا جس کے وجود سے ابن کی مہک نہ آئے۔“ سونی اسے پکڑ کر پلنگ لے آئی تھی۔ پھر اس کے ناں ناں کے باوجود دونوں نے اس کی اک نہیں سنی اور ابن ملنا شروع کر دیا۔

”میں نے مہندی بھی منگوا لی ہے اماں سے، تم جلدی کھانا کھا لینا پھر تمہیں مہندی لگانا شروع کر دوں گی۔“

سونی اسے یاد دہانی کروا رہی تھی۔
 ”یعنی آج میں تم دونوں کے ہاتھوں مشق ستم بنی رہوں گی۔“ آنسور نے شرارت سے ٹھنڈی آہ بھری۔
 ”جی، جی۔“ دونوں نے شد و مد سے سر ہلایا۔ اسی اثناء میں آنسور کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ وہ بے چاری
 نظروں سے عرشان ولی کا ٹانگہ جگمگاتے دیکھ رہی تھی اور لاچار اندر سے اپنی پہلی سیٹیلیٹ کو۔ دونوں اب اس کی
 مخر و طی انگلیوں پر اٹھن رگڑ رہی تھیں۔
 ”اک تو انہیں چین نہیں۔“ سونی اسکرین کو دیکھتے جھٹ دوپٹے سے اپنے ہاتھ صاف کر کے سیل فون اٹھا
 گئی تھی۔
 ”بھائی صاحب! آپ کی محترمہ کی انگلیاں اٹھن سے رنگین ہو رہی ہیں وہ بات کرنے سے قاصر ہیں۔ جو
 پیغام بے مجھے دے دیں، میں بنا خیانت کے پہنچا دوں گی۔“
 سونی کال ریسیو کرتے ہی شروع ہو چکی تھی۔ آنسور جھینپتے ہوئے اسے پھر مارنے لگی تھی۔ دوسری طرف
 عرشان ولی بھی سونی کی آواز سن کر اک لمحے کو تحیر میں مبتلا ہوا تھا۔ اگلے ہی پل اس کی گفتگو سن کر اس کے لبوں پر بھی
 جاندار مسکراہٹ پھیل گئی۔ آنسور کی جھینپی جھینپی آواز اور رونی کی کھی کھی بھی اسے بغور سنائی دے گئی تھی۔
 ”پیغام تو کوئی نہیں دینا تھا۔ بس“ اپنی محترمہ کی آواز سننے کے لیے فون کیا تھا۔ اپنی محترمہ پر زور دیا تو سونی
 بے ساختہ سیل فون آنسور کے کان سے لگا گئی۔
 ”لو، آواز سنا دو اپنی۔“ سونی کی شرارت پر آنسور بری طرح ٹپٹا گئی تھی۔ اسپیکر سے آئے عرشان ولی کے
 قہقہے پردہ مزید جھینپ گئی۔
 ”میں فری ہو کر آپ سے بات کرتی ہوں۔“ دونوں ہاتھ پھیلائے آنسور جیسی آواز میں کہہ رہی تھی۔
 ”جی، جو حکم محترمہ! عرشان ولی شرارتی لہجے میں کہتا اس کے گلابی رخساروں کی سرخی بڑھا گیا تھا۔
 ”میرا خیال ہے آپ کو واقف ہو گیا ہوگا۔“ سونی سیل فون کان سے لگائے دوبارہ شروع ہو چکی تھی۔ عرشان
 ولی کا جاندار قہقہہ گونجا تھا۔
 ”جی، کافی حد تک۔“ وہ محفوظ ہوا تھا۔
 ”بدتمیز!“ آنسور نے بے ساختہ سونی کی گدی پر اپنا رنگین ہاتھ جمادیا تھا۔
 ☆.....☆
 لان برقی قہقہوں سے آراستہ تھا۔ عرشان ولی سرخوشی کی کیفیت سے چوک پر بیٹھا ہوا تھا۔ ارگرد لوگوں کا ہجوم
 تھا۔ ہر اک حسد و رشک بھری نظروں سے دھانٹ کرتے پاجامے میں لمبوس و جاہت کا شاہکار عرشان ولی کو دیکھ
 رہا تھا۔ فرہاد اور شاہ میر دیگر انتظامات دیکھ رہے تھے۔ ماہ پارہ ساڑی کا پلو سنجالے مہمانوں سے مل رہی تھیں۔
 حمنی اٹھن مل رہی تھی۔
 ”بھابھی! اب بس کر دیں۔“ اس کی اچھی خاصی درگت بنا دی تھی۔ حمنی نے کہنیوں تک آستین چڑھائی ہوئی
 تھی۔ سفید کرتا پیلے دھبے سے منور ہو چکا تھا۔ چہرے کے بعد جب حمنی کان کی لوٹک اٹھن ملنے لگی تو وہ دہائی دینے
 لگا۔
 ”ابھی نہیں ابھی تو تمہیں تمہاری بہن کی طرح حسین بنانا ہے۔“ حمنی مسکرا رہی تھی۔
 ”پہلے بتانا تھا نہ آپ کی دیورانی سے مقابلہ ہے میرا۔ یہ بات ہے تو پھر کرنا تا رو دیتا ہوں۔“ عرشان ولی

شرارت سے کرنا اتارنے کا پوز کرنے لگا۔ لڑکیوں کا شورا اٹھا تھا۔
 ”اوئے، بدتمیز۔“ حمنی ہنستے ہوئے پیچھے ہٹی گئی۔ اسی لمحے ولید اور وریشہ بھی قریب آچکے تھے۔
 ”بہت اچھے کیا اسپڈ پکڑی ہے تم نے۔“ آنا فانا شادی۔ چار فنی مون ٹرپ ہی کنسل کروا دیا تم نے۔“ ولید
 آتے ہی دہائی دینے لگا۔ یہ سچ تھا کہ عرشان ولی کی پہلے گوشہ نشینی اور پھر اچانک شادی کی وجہ سے ولید نے اپنا
 پلان موخر کیا تھا۔
 ”بھابھی اس کی بولتی اب تک بند نہیں کروائی آپ نے؟“ عرشان ولی شرارت سے وریشہ سے استفسار کر
 رہا تھا۔
 ”آنسور بھابھی آجائیں پھر تجھ سے پوچھوں گا۔“ ولید بھی دو بد و مقابلے پر آیا وریشہ مسکرا کے رہ گئی۔
 ”بہت مبارک ہو عرشان! بھئی مجھے تو تمہاری پسند دیکھنے کا اشتیاق ہو رہا ہے۔“ مسز ولید مٹھائی کھلانے
 اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھیں۔
 ”انشاء اللہ یہ خواہش بھی جلد پوری ہو جائے گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے دلا سادے رہا تھا۔
 ”کیسے پوری ہوگی..... بارات میں تو تم نے نو ایٹ ہی نہیں کیا۔“ مسز ولید گلہ کرتے مدعا بیان کر گئیں۔
 ”دراصل آنسور کی فیملی ذرا پرانے خیالات کی ہے۔ ٹریڈیشنل لوگ ہیں اور عرشان بھی سادگی کا قائل ہے۔
 یہ تو میں نے ضد کر کے اٹھن کی رسم رکھ لی۔“ ماہ پارہ اپنا بھرم رکھنے کے لیے جلدی سے باتیں گھڑنے لگی تھیں۔
 ”اچھا کیا شادی کا حسن ہی ان رونقوں سے ہے۔ ولید تو گرینڈ کرو گے ہاں؟“ مسز ولید دریافت کر رہی
 تھیں۔
 ”انشاء اللہ!“ عرشان ولی ہولے سے مسکرایا تھا۔ اسے احساس ہو گیا تھا ماہ پارہ نہیں چاہتی تھیں کہ آنسور کی
 کم مائیگی کی بھنگ بھی ان کے سرکل پر پڑے۔ حیثیت دوسرے کی اس کی نظر میں کبھی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی مگر
 ماہ پارہ کے باعث وہ چپ رہ گیا کہ لوگ آنسور کو (غریب ہے بے چاری چچ) کر کے ترم بھری نظروں سے
 دیکھیں اسے وہ بھی گوارا نہیں تھا کہ کوئی اس کی پسند پر انگلی اٹھائے۔
 اب کے وریشہ رسم کرنے آئی تھی اور ولید اس کی کھپائی کر رہا تھا۔ وہ محفوظ ہوتے نہلے پردہ مار رہا تھا۔
 ”توبہ کتنا بے شرم دلہا ہے۔“ ولید ہنستے ہوئے اسے شرم دلا رہا تھا۔
 ”جی جی بے شرمی کے ریکارڈ تو آپ نے قائم کیے ہیں کیا رقص پیش کیا تھا اپنی اٹھن میں، میں تو ریکارڈ
 ٹوڑنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ عرشان ولی کے آئینہ دکھانے پر وریشہ تو جھینپ گئی تھی۔ ولید ہنسنے لگا تھا۔ وہ
 لا جواب کر گیا تھا۔

☆.....☆

پرفون تقریب اختتام پذیر ہو چکی تھی۔ مہمان کھانا کھا کر جا چکے تھے۔ ملازم لان کی بکھری چیزیں سینے میں
 لے ہوئے تھے۔
 وہ بالنگی میں آکھڑا ہوا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو لیے تھے مگر ابھی کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے۔ کپڑے پر
 ایک بھی نشان برداشت نہ کرنے والا عرشان ولی اس گھڑی جا بجا اٹھن کے دھبے والا کرتا زیب تن کیے کھڑا تھا۔
 آج یہ رنگ، یہ دھبے اسے خوشی کا احساس دلا رہے تھے۔ دل کو گدگد رہا ہے تھے۔ اٹھن کی اٹھتی مہک اسے اس
 من دل و جال کی یاد دلا رہی تھی۔ تب ہی رخ موڑ کر کمر بالنگی کی گرل سے لگاتے وہ بے ساختہ سیل فون سامنے

ان کی دوری محسوس نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ اپنی وفاؤں کا اعتبار دلارہا تھا۔ آنسوؤں کے منوحش دل کو بھی تپ قرار آنے لگا تھا۔ وہ اس کا موڈ بدلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

”مہندی اتار دی؟“
 ”نہیں، سوکھ گئی ہے بس اتارنے ہی لگی ہوں۔“ وہ سوکھی مہندی کو انگلیوں سے مسلنے لگی۔
 ”رنگ کیسا آیا، بالکل میری محبت کی طرح بھر پور نا۔“ وہ چھپڑ رہا تھا۔
 ”خوش فہمی ہے۔“ وہ چڑانے لگی۔
 ”اسے خود شناسی کہتے ہیں میم!“ وہ باور کر رہا تھا۔ آنسوؤں سے مسکرانے لگی تھی۔

☆.....☆

اگلے دن کا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ سب سویرے ہی اٹھ گئے تھے کہ آج آنسوؤں کا نکاح تھا۔ جلدی جلدی ناشتا کر کے سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ سب کے احساسات عجیب سے ہورہے تھے۔ جہاں آنسوؤں کی زندگی میں عرشان ولی جیسے شہزادے کے آنے کی خوشی تھی وہیں آنسوؤں کی دوری کا بھی قلق تھا۔ آنسوؤں بھی کم و بیش انہی احساسات کا شکار تھی۔ مہندی لگے ہاتھوں کی بھیننی بھیننی خوشبو احساسات، جذبات کو گلدہا رہی تھی تو وہیں انہوں کی دوری دل میں کسک پیدا کر رہی تھی۔

دن ٹھیک سے چڑھا بھی نہیں تھا کہ مٹی ساز و سامان اور بیوٹیشن کے ساتھ آمو جوہر ہوئی۔
 ”آنسو! تمہاری ساری چیزیں بھیجی ہیں۔ تمہارے انہوں نے اور یہ حوریہ ہے تمہیں تیار کرے گی۔
 میرے لائق اور کوئی کام ہے تو بتاؤ؟“
 حنی چیزیں پلنگ پر رکھتی شروع ہو گئی تھی۔ سب ہی اشتیاق سے چیزوں کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”نہیں شکریہ!“ آنسوؤں ہولے سے مسکرانے لگی۔

”او کے پھر میں نماز جمعہ کے بعد آؤں گی۔ دو لمبے میاں کے ساتھ۔“ حنی اس کے گال سے گال ٹکراتی پانے کو تیار کھڑی تھی۔ ساتھ آئی حوریہ تنقیدی نظروں سے گھر کو دیکھتی آخر میں آنسوؤں کو دیکھ کر لمبی سانس خارج کر رہی تھی۔

”ارے اتنی جلدی بیٹا ٹھنڈا شربت تو پتی جاؤ۔“ ہاجرہ نے اسے روکنا چاہا۔
 ”ہاں اتنی دیر تک سکتی ہوں۔“ حنی اپنا نیت سے کہتی بیٹھ گئی تو ہاجرہ نے سونی کو اشارہ کیا۔
 ”میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔“ سونی روٹی کو ہاتھ مارتی نکلی تو اس کا اشارہ سمجھ کر روٹی سامنے والوں کے گھر سے برف یا ٹھنڈا پانی لینے کو دوڑی کہ فریق انور ڈکرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ اندر ہاجرہ، حنی کی سعادت مندی مسکرا رہی تھیں۔

”اتنا فارل نہ ہوں آنٹی! عرشان میرا بہت کینرنگ دیور ہے۔ اسی نسبت سے مجھے آنسوؤں بھی بہت پسند آنٹی۔
 بہت سوٹ کرتے ہیں دونوں اک دوسرے کو۔“ حنی خوش دلی سے انہیں سراہ رہی تھی۔
 ”اللہ رب العزت دونوں کو خوش رکھے، آمین!“ ہاجرہ دعا گو تھیں۔ حنی مسکرا رہی تھی۔
 ”سونی! اگر دیر ہے تو میں چلتی ہوں۔“ چندا اچھے بھی تیار ہونا ہے۔“ حنی نے اوپچی آواز سے کہا تھا۔
 ”میں دیکھتی ہوں۔“ ہاجرہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھیں۔ سونی جو تھوڑے سے پانی میں چینی گھول کر چلاتی روٹی کے لوٹنے کی شدت سے منتظر تھی۔ حنی کی آواز پر مزید بے فراری سے چکن کے دروازے تک

کر گیا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔
 ”ہماری نیند اڑا کے بستر تھکے ہو سکتی ہیں۔“ اپنے ہی خیال کی نفی کر کے اس نے آنسوؤں کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ جو اکثر اس کی لسٹ میں سب سے اوپر ہی جگہ کاٹتا تھا۔

سیل فون کی واہریشن پر اس نے بے ساختہ اپنے مہندی سے رہے ہاتھوں پر نظر ڈالی تھی۔ مہندی اب سوکھ چکی تھی۔ اس نے احتیاط سے کالر ریسوکر لی تھی۔
 ”کہاں ہو تم صبح سے نا کال نامیج۔“ اس کی آواز سنتے ہی عرشان ولی گلہ کر گیا۔
 ”پہلے گھر کی مصروفیت، پھر اینٹن، مہندی نے موقع نہیں دیا۔ مجھے لگا آپ بھی مصروف ہوں گے۔ اینٹن کی رسم میں۔“ وہ جیسی آواز میں گوش گزار کر گئی۔

”میں بھلے لاکھ مصروف رہوں، تم مصروفیت کو نہیں مجھے اہمیت دو، صرف میری فکر کرو۔ تم سے اہم میرے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔ تم جس لمحے یاد کرتی ہو تمہارا پیغام ملتا ہے وہ پل مجھے اضمحل لگتا ہے۔ ورنہ ویرانی سی لگتی ہے۔“ وہ دھستے سروں میں اپنے جذبات مہکتے ہوا کے سنگ بیان کر رہا تھا۔ آنسوؤں نے کچھ سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔ سر دیوار سے لگا ہوا تھا۔ محبت بھرے احساسات پر خوش گوار ہوا بڑا دل فریب تاثر ڈال رہی تھی۔
 ”بہتر۔“ آئندہ سے دھیان رکھوں گی۔“ اسے اس کی دیوانگی کا اندازہ تھا۔

”ڈرائیو پہنچ گیا تھا نا تم پر؟“ وہ استفسار کر رہا تھا۔
 ”آپ نے ناحق اتنی ساری چیزیں کھانا بھیج دیا آپ بہت زیادہ کرتے ہیں عرشان۔“ آنسوؤں کو بھی یاد آ گیا۔ سر شام ہی ڈرائیو سوزوکی میں کھانے کی دیکیں، فرانس، مٹھائیاں لے کر آیا تھا اور وہ اتنی زیادہ مقدار میں تھیں کہ انہوں نے محلے میں بھی تقسیم کی تھی۔ تمام چیزیں بے حد لذت بخش تھیں۔ سب نے تعریف کی تھی۔
 ”چپ بالکل چپ، میری ٹہلی کے لیے مجھے کیا کرنا ہے یہ مجھے تم سے نہیں پوچھنا۔ تم یہ بتاؤ مہندی لگو الی؟“ وہ بڑی دھونس سے کہتا اس کی توجہ دوسری جانب مبذول کر گیا۔

”جی روٹی سونی نے زبردستی لگا لی۔“ وہ بہنوں کی محبت پر مسکرا دی۔
 ”تمہارے ساتھ زبردستی ہی کرنی چاہیے بالکل کیئر نہیں کرتی اپنی۔“ وہ سنار ہاتھا۔
 ”صبح کون سا دور ہے محترمہ! آج پھر دیکھو کیئر ہوئی ہے تمہاری۔“ اس کے محبت بھرے انداز پر وہ مسکرا دی تھی لیکن مسکراہٹ بہت عجیب سی تھی۔ احساسات بہت عجیب سے ہورہے تھے۔ جنہیں وہ کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔ من پسند ہم سفر پانے کی خوشی تھی تو وہیں اس گھر کے درد دیوار جیسی لگنے لگے تھے۔ ماں باپ نہیں جن کے ساتھ ساری زندگی گزری تھی وہ خود سے بہت دور محسوس ہورہے تھے۔
 ملن اور جدائی کی گھڑی جب یوں قریب آتی ہے تو شاید ہر لڑکی کے احساسات اتنے ہی سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

”اپنوں سے دوری کا سوچ کر اداس ہو؟“ وہ لہجے کی افسردگی پہچان گیا تھا۔
 ”ہاں شاید! وہ دگر فتنہ تھی۔“

”اداس نہیں ہوتے زندگی!“ وہ کہہ رہا تھا اور آنسوؤں کا بوجھل دل جیسے بہنے کو تیار ہو گیا تھا۔ آنکھیں بھر آتی تھیں۔
 ”تم پہلے سے کہیں زیادہ ان کے قریب رہو گی، جب کہو گی جس وقت کہو گی ملوانے لے جایا کروں گا۔ کبھی

آگئی۔ باجرہ کچن کی طرف آتی نظر آئیں تو اسی لمحے روہی بھی کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں آکس کیوب کی ٹرے دیکھ کر سونی نے سکون کا سانس لیا تھا۔
 ”سہن جلدی سے نہالو۔“ باجرہ ہدایت کر رہی تھیں سونی نے سر ہلا کر مستعدی سے روح افزا کی بوتل جگ میں انڈلی گئی۔ روہی تیزی سے کچھ کیوبز کا چورا کر رہی تھی تاکہ شربت ٹھنڈا تیار ہو۔ غریبی کے سارے نسخے انہیں ازبر تھے۔

☆.....☆

جمعہ کی نماز کا وقت ہوا جا رہا تھا۔ گھر میں افراد تقریبی لگ گئی تھی۔ کیرنگ والے پہلے ہی آچکے تھے اور انہوں نے سارا رات بچھٹ چھت پر کر لیا تھا۔ اسی لمحے شاہ زادوں کی آن بان لیے عثمان ولی وائٹ کرتے اور میروں شلوار میں سب کے ہمراہ داخل ہوا تھا۔ قدوس صاحب کے ساتھ آصف بھی بطور داماد انہیں خوش آمدید کر رہا تھا۔ آصف ان سب سے قدرے مرعوب ہو کر کتری میں گھلنے لگا تھا مگر قدوس صاحب کے تعارف کے بعد عثمان ولی نے جتنی عزت و محبت سے اسے گلے لگایا وہ اس کا معترف ہو گیا۔
 تجسس کے مارے درخشاں بھی دروازے سے جھانکنے لگی تھی۔ عثمان ولی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کشادہ ہو گئی تھیں مگر دل ہی دل میں کاش یہ تا ہو کہتے وہ ولید پر نظریں جما گئی تھی۔
 ”ان میں سے عثمان کون ہے؟“ درخشاں سے زیادہ دیر صبر نہ ہو سکا تھا۔
 ”یہ وائٹ کرتے والے ہیں ناسب سے وجہہ جو لگ رہے ہیں۔“ روہی نے بتایا تو درخشاں کا منہ ٹیڑھا ہونے لگا۔

”اچھا!“ اسے آنسوؤں کے نصیب سے سخت جلن ہونے لگی۔
 ”کیوں برائی کرنے کے الفاظ نہیں مل رہے نا؟“ سونی نے جیسے چڑایا۔ درخشاں گھورنے لگی تو سونی چھپاک سے دوسرے کمرے میں چلی گئی کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا جو اس بات کا اعلان تھا کہ آنسوؤں تیار ہو چکی ہے۔
 ”اللہ آپ کی قننی حسین لگ رہی ہو۔ بالکل پہچانی نہیں جا رہی ہیں۔“ سونی کے پیچھے روہی اور درخشاں بھی داخل ہو گئی تھیں۔ مروں لیٹنے اور دھانٹ دوپٹا جس کے آچھل اور کنارے مروں امبرائیڈی سے بھرے ہوئے تھے۔ سلیٹے سے میک اپ کروائے پری لگ رہی تھی۔ دلہن بن کر اس پر خوب روپ چڑھا تھا۔
 ”ماشاء اللہ! نظر نہ لگے۔“ سونی بڑے بوڑھوں کی طرح دعا دے رہی تھی۔ درخشاں کا دل جل کے کباب ہو گیا تھا۔

”ہوگئی تیار قاضی نکاح کے لیے اجازت مانگ رہے ہیں۔“ باجرہ غلت میں اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنا عید کا جوڑا نکال کر پہنا تھا جو نہانے نئی عیدوں سے ہر عید پر نکل آتا تھا۔
 روہی، سونی نے بھی تقریباً ایسا ہی کیا تھا۔ اپنے؟؟ انہوں نے اپنا سب سے خاص جوڑا پہنا تھا۔ اک درخشاں بھی جو اپنی بری کالال جھللاتا جوڑا اتنی گرمی میں تیز میک اپ کے بھر بھر آنکھوں میں ریڈ شیڈ لگائے سب سے بھاری گولڈن کلر کا ٹیکس پینے کھڑی تھی مگر اس کا منہ سیدھا نہیں ہو رہا تھا۔
 دلہن بنی آنسوؤں نے بساختہ باجرہ کی طرف دیکھا تھا باجرہ بھی اسے دیکھ رہی تھیں۔
 ”ماشاء اللہ!“ باجرہ کی آنکھیں جھللاتے لگی تھیں۔ بیٹیوں میں وہ سب سے زیادہ دل کے قریب تھی ان کے

اس طرح مردانہ وار گھر چلانے میں جتنی رہتی تھی۔ قدوس صاحب جب بھی ہاتھ اٹھانے کے لیے پھڑ پھڑاتے سانسے آکر ان کی ڈھال بن جاتی تھی۔ کتنی ہی بار انہیں بچانے پٹی تھی۔ وہ کیوں کر نہ پیاری ہوتی کہ انسان ان میں گھرا لے ہی تو نہیں کرتا۔
 ان کی دیکھا دیکھی آنسوؤں بھی رونے کا پلان کرنے لگی تھی۔

”اوہ بھی کوئی ناروے میک اپ خراب ہو جائے گا۔ اماں آپ تو چپ کریں۔“ سونی جلدی سے آنسوؤں کے ٹول میں بیٹھ کر اس کی لائنز مسکارا سے کچی آنکھ کے نیچے ٹشو دبا گئی تھی تاکہ میک اپ خراب نہ ہو۔ روہی باجرہ کو خاموشی کی۔

”ہاں، ہاں نہیں روئی چادر ڈال دو میری بچی پر قاضی اور باقی سب آنے والے ہیں۔“ باجرہ کہتی نکل گئی۔ بیوٹن اپنا ساز و سامان سمیٹ رہی تھی۔

”کھانے دانے کا کیا انتظام ہے؟“ درخشاں کو اپنا فرض یاد آ گیا دیر سے ہی۔

”کیرنگ والوں کا قلم پہلے ہی آچکا ہے۔ چھت پر رینج ہے سب۔ عثمان بھائی نے ہر کام اس طرح کیا ہے کہ ہمیں نیل بھی نہیں ہونے دیا۔“ روہی اسے رپورٹ دے رہی تھی۔ اس کے لہجے میں عثمان ولی کے لیے بے عزت تھی۔

”بہت خوب، آنسوؤں کے بعد اب عثمان ولی کے بھی گن گانے لگی ہو تم لوگ؟“ درخشاں کا انداز استہزاء سیہ

”جو تعریف کے لائق ہوتا ہے اس کی تعریف بھی ہوتی ہے۔“ سونی کہنے سے نہیں چوکتی تھی۔ آنسوؤں کا سدھار کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ درخشاں اسے گھورنے لگی تھی۔

اسی لمحے قاضی صاحب اور سب کی آمد کا شور اٹھا تھا۔ روہی اور سونی تو باجرہ کے اشارے کرنے پر کچن میں لی تھیں۔ درخشاں باؤنٹو اسٹند آنسوؤں کے پہلو میں بیٹھ گئی تھی۔ دنیا دکھاوے کو۔

قاضی صاحب نکاح کے ایجاب و قبول کے الفاظ دہرا رہے تھے اور حق مہر دس لاکھ سن کر ہی درخشاں کو چکر لگے۔

نکاح نامہ آنسوؤں کے آگے رکھا گیا تو اس کا وجود جھٹکوں کی زد میں آ گیا۔ کیسا تین حرفی رشتہ تھا جو دنیا کا پہلا دن گیا تھا۔ بچکیوں کے ساتھ سائن کرتے اس کے احساسات عجیب سے ہورہے تھے۔

یہاں سے جانے کے بعد عثمان ولی کی باری آئی تھی۔ اپنی زندگی کا سب سے اہم بیچر اس نے پوری دلی کی کے ساتھ سائن کر دیے تھے۔

”اوہ بھی ہولا ہاتھ چیک بک نہیں نکاح نامہ ہے۔ جلدی کس بات کی ہے۔“ ولید چھیڑ رہا تھا۔
 منی مسکراتے ہوئے شاہ میر سے کچھ کہہ رہی تھی۔ ماہ پارہ مصنوعی مسکراہٹ سجائے بیٹھی تھیں۔ فرہاد عثمان ولی کے دائیں طرف بیٹھے تھے تو ولید بائیں طرف قاضی صاحب دعا کے بعد مبارک باد دے رہے تھے۔

”یقین کر فرما دو دو دھ کی نہر نکالنے پر اتنی خوشی نہیں ہوئی ہوگی جتنی خوشی اس وقت تیرے چہرے پر ہے۔“
 ملنے اسے کہہ گیا تھا۔

”مے مرو!“ عثمان ولی نے جھینٹے ہوئے اسے پرے دھکیلا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے پیچھے ہو گیا۔

رخصتی کے وقت خاصے رقص آمیز مناظر دیکھنے میں آئے تھے۔ سوائے درخشاں کے ہر اک لنگا جتنا بہانے پر تلا تھا۔

”مجھے معاف کر دینا بیٹی! میں نے ہمیشہ تیرے ساتھ سخت رویہ رکھا۔ ساری زندگی بیٹے کی کمی کا رونا روتا رہا اور تو نے بیٹا بن کر دیکھا۔“ قدوس صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھے آبدیدہ تھے۔ آنسو کا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ عثمان ولی کو جانے کہہ دے۔

”میں نے نہیں جانا۔“ مگر جانا تو تھا کہ یہ ہی ریت تھی۔

”اللہ بہت خوشیاں دکھائے۔“ قدوس صاحب اسے باپ لے آئے تھے۔ اس کا گھونگٹ آگے تک تھا۔ باوجود کوشش کے عثمان ولی کو اس کی اک جھلک بھی نظر نہ آ سکی تھی۔

جمنی سب سے مل کر انہیں تسلی دے رہی تھی۔ رومی، سولی کو چپ کر رہی تھی۔ ماہ پارہ نے کسی سے ملنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

دروازے سے نکلے آنسو کے قدم لڑکھڑائے تھے۔ عثمان ولی نے تیزی سے اسے سنبھالا تھا۔

”کیا اولہک چیمپئن کی سی تیزی سے بیگم کو گرنے سے بچایا۔“ جمنی کی جملے بازی سے وہ جھینپ گیا تھا۔ دوسری طرف سے وریشہ نے آکر اسے سنبھال کر گاڑی میں بیٹھنے میں مدد دی تھی۔

☆.....☆

جلائے، مارے، گرائے، اٹھائے مہت کرے!

میں اس کے صدمے، یہ تاثیر جس نگاہ میں ہے

اس شاہ زادے کی سلطنت میں اس کے سرگ قدم رکھتے آنسو کے قدم ڈگر مار رہے تھے۔ اتنا حسین بنگلہ۔ اس نے تو ڈراموں میں بھی نہیں دیکھے تھے۔

اسے لاکڑ لاؤج کے صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ولید اور وریشہ بھی موجود تھے۔ ان کے آتے ہی ملازم شربت اور کولڈریک سرور کرنے لگے تھے۔ سب آرام دہ صوفے پر براجمان ہو گئے تھے۔ لیکن بیٹی آنسو کو بھی صوفے پر بٹھا دیا گیا تھا۔ ماہ پارہ اپنے کمرے میں گئی تھیں جب لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں اک جیولری باکس تھا۔

”بھوک تو نہیں لگ رہی، کچھ لاؤں آنسو!“ جمنی دھیمے سروں میں دریافت کر رہی تھی۔ آنسو نے جھپکتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ سب ہی ارد گرد بیٹھے تھے۔ اس سے کچھ فاصلے پر اس کا من میت شری رشتے سے بندھ کر بیٹھا تھا۔ اک عجیب سے احساس سے اس کی گردن جھکی جا رہی تھی۔ عثمان ولی کی وقفے وقفے سے اٹھتی نگاہ اسے خود میں سمٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔

”یہ ہمارے خاندانی لنگن ہیں۔ نسل در نسل ہوتے مجھ تک آئے تھے۔ میں نے عثمان کی بیوی کے لیے سنبھال کر رکھے تھے۔“

ماہ پارہ آنسو کے قریب بیٹھ گئی تھیں۔ جیولری باکس سے انہوں نے ایک لنگن نکالے تھے۔ سب کی نظریں اٹھ گئی تھیں، جن میں ستائی رنگ نمایاں تھے جمنی کے مسکراتے لب بے ساختہ بھینچ گئے تھے۔ شاہ میر اور عثمان ولی کی نظریں بے ساختہ جمنی پر اٹھی تھیں۔ جمنی کے چہرے پر پھیکا پن عود کر آ گیا تھا۔ آنسو کی نظریں بھی لنگن کی خوب صورتی کو سہا رہی تھیں جو ماہ پارہ کیس سے نکال کر آنسو کو پہنانے کا ارادہ سمجھتی تھیں۔

”جمنی بھابھی! اس گھر کی بڑی بہو ہیں اگر آپ کو برانہ لگے تو میں اک لنگن بھابھی سے شیر کرنا چاہوں گی۔“

آنسو کی بات پر اک سناٹا چھا گیا تھا۔ ماہ پارہ جو آنسو کی کلائی تمام کر دونوں لنگن پہنانے کے ارادے سے تھیں ان کے چہرے پر سرعت سے ناگواری کا عکس جھلایا مگر انہوں نے سب کے سامنے زبردستی کی مسکراہٹ سجائی۔

”جمنی بھابھی!“ ماہ پارہ کی طرف سے مطمئن ہو کر آنسو نے دھیمے سے جمنی کو آواز دی تھی جو قریب ہی کھڑی تھیں۔ آنسو کے سر کے اشارہ کرنے سے رومی سے اس تک آئی تھی۔

”مام پلیز! بڑی ہونے کے ناتے پہلے بھابھی کو پہنا دیں۔“ آنسو بے ساختہ جمنی کی کلائی تمام کر ماہ پارہ کے سامنے کڑکئی تھی۔ سب دلچسپی سے یہ مناظر دیکھ رہے تھے۔ ماہ پارہ نے بالآخر استہمائی کی کلائی میں اک لنگن پہنا دیا۔

”بہت اعلیٰ انتخاب ہے۔“ فرہاد صاحب عثمان ولی کو داد دے رہے تھے۔ شاہ میر نے بھی بیٹھ چھپتھپائی تھی۔ وہ مسکرا کر آنسو کو دیکھنے لگا تھا۔ حقیقتاً اس کی شیرنگ فطرت نے اس کا بھی دل لے لیا تھا۔ جس طرح سب اسے سہا رہے تھے اسے اپنے انتخاب پر فخر ہو رہا تھا۔

جمنی کے بعد اسے بھی لنگن پہنانا کر ماہ پارہ نے کیس سمیٹ لیا تھا۔ فرہاد صاحب قدرے قریب آئے تھے۔

”آنسو بیٹا! عثمان میں میری جان قید ہے۔ سمجھو میں نے اپنی سب سے قیمتی چیز تمہیں دے دی۔ پھر بھی رسم دنیا کے لیے یہ بلیک چیک ہے۔ اپنی مرضی سے بھرو۔ اور ابھی تم نے جس اعلیٰ قدرتی کا ثبوت دیا وہ قابل تعریف ہے خوش رہو۔“

بلیک چیک اسے تھماتے فرہاد صاحب اس کے سر پر ہاتھ رکھ گئے تھے۔

”شکر ہے!“ وہ ہولے سے کہہ کر چیک تمام کر گئی تھی۔

”دل خوش کر دیا تم نے۔ ہمارے گھر کو ایسی ہی بچی کی ضرورت تھی۔“ فرہاد صاحب عثمان ولی کو گلے لگا گئے تھے۔ ماہ پارہ غصہ ضبط کر رہی تھیں۔

شاہ میر جمنی نے ڈائمنڈ کا سیٹ گفٹ کیا تھا۔

”بہت شکر یہ عثمان اتنی پیاری دیورانی کا تحفہ دینے کے لیے۔“ جمنی اسے سہا رہی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

”آؤ آنسو! کمرے میں چلتے ہیں۔ تھک گئی ہوگی تم۔“ جمنی سہارا دے کر آنسو کو اٹھا رہی تھی۔ ولید اور وریشہ بھی عثمان ولی سے رخصتی لے رہے تھے۔

☆.....☆

”چھٹناک بھر کی لڑکی نے آتے ہی سب کے سامنے نیچا دکھا دیا۔“

یہ تو جمنی سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔

ماہ پارہ اپنے کمرے میں آکر غصے سے ٹہل رہی تھیں۔ جمنی ان کی ناپسندیدہ بہو تھی تو آنسو کو بھی پسندیدگی کی سند نہیں تھی مگر وہ اپنے عمل سے پہلے ہی ان دونوں کے بیچ اک دیوار کھڑی کرنا چاہ رہی تھیں جمنی جس طرح دیورانی کے کن گارہی تھی اور آنسو جیسے بھابھی بھابھی کر رہی تھی یہ انہیں کھل رہا تھا اسی لیے انہوں نے یہ عمل کیا تھا مگر آنسو نے کدورت کی دیوار کھڑی کرنے سے پہلے ہی گرا کر جمنی کا دل شاد کیا تھا اس پر ماہ پارہ تملارہی تھیں۔

”آج تو اس نے بازی ماری لیکن اس کا واسطہ بھی ماہ پارہ سے پڑا تھا۔ ساری زندگی سر پر ہاتھ رکھ کر روئے

”قسم لے لو یا را! پھنسا رہا ہے۔“ شاہ میر جلدی سے صفائی دینے لگا۔ معصومانہ انداز پر عرشان ولی ہاتھ پر گونجا تھا۔

”ویسے کلک لی بھابھی کے سامنے کیسے گھگھی بندھ جاتی ہے آپ کی؟“ وہ چڑا رہا تھا۔

”تمہاری گھگھی بھی بند کرنے والی آگئی ہے۔“ شاہ میر نے بھی جواب دیا۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

”تم جاؤ عرشان ان کی باتیں تو چلتی رہیں گی۔ آپ چائے پیئیں۔“ شرارت سے کہتے شاہ میر نے کپ تھام لیا تھا۔

☆.....☆

ہاں آپ کو دیکھا تھا محبت سے ہم ہی نے
جی سارے زمانے کے گناہ گار ہم ہی تھے

عرشان ولی کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ٹرائی جوں کی توں بڑی تھی۔ اس نے کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ اس کی آہٹ محسوس کر کے وہ خود میں سمٹ گئی تھی۔ اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے وہ بیڈ تک آیا تھا۔

”السلام علیکم کیا حال ہیں مسز؟“ وہ شوخی سے کہتا اس کے سامنے براجمان ہو گیا تھا۔ آنسو کو بے طرح جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی قربت جو اس معطل کرنے لگی تھی۔

”یقین نہیں آ رہا کہ تم میری ہو چکی ہو اور میرے اتنے قریب ہو۔“ دھیمی سرگوشی کرتے وہ آنسو کا مخروٹلی انگلیوں والا ہاتھ تھام گیا تھا۔

”تمہارے ہاتھ کس قدر پکیا رہے ہیں۔ ابری ڈیزر ریلیکس ہو کر بیٹھ جاؤ بلکہ کچھ کھا لو۔“ عرشان ولی ٹرائی کو اپنی طرف کر کے اس کے لیے اسٹینکس نکالنے لگا۔

”صرف چائے۔“ وہ جھجکتی ہوئی کہہ گئی۔

”یار مسز! ایسا نہیں چلنے والا شرافت سے کھانا شروع کر دو۔“ اس نے اسٹینکس کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی اور اپنے ہاتھوں کھلانے لگا۔

”بس پلیز اور نہیں۔“ وہ دو تین بائیس کے بعد ہی پیچھے ہٹ گئی۔

”تھوڑا سا۔“ اس نے اصرار کیا اس کے ہر بار کے انکار پر وہ یہی کر رہا تھا۔

”تھوڑا تھوڑا کر کے کافی کھلا چکے ہیں آپ۔“ اسے دوسرا اسٹینکس اٹھاتے دیکھ کر اس نے اب کے معذرت کر لی۔

”اوکے چائے پی لو۔“ عرشان ولی نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ نہیں پیئیں گے؟“ وہ سب لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”تم پلاؤ گی تو ضرور پیوؤں گا۔“ عرشان ولی شرارت سے اس کے کپ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ آنسو نے اپنا کپ بے ساختہ اس کے طرف بڑھایا تھا۔ عرشان ولی نے جھک کر سب لی تھی۔

”چائے کا میٹ بہت ڈفرینٹ ہے۔“ وہ شرارت سے کہہ رہا تھا۔ آنسو شیر ماسی گئی تھی۔ باری باری سب لے کر دونوں نے چائے ختم کی تھی۔ کپ ٹرائی میں رکھ کر اس نے ٹرائی پیچھے کر دی تھی۔

”تم خوش ہونا؟“ عرشان ولی نے اس کے پیروں پر سر رکھ دیا تھا۔ آنسو کا اک ہاتھ تھام کر دل کی جگہ پر رکھ لیا تھا۔

گی۔ وہ ٹہل ٹہل کر خود کھائی کر رہی تھیں۔

”ماشاء اللہ! آنسو نے کس خوب صورتی سے تمہارے بھونڈے انداز کو کور کر کے تمہیں بھی معتبر کر دیا۔ کچھ کہنے سے پہلے سوچ تو لیا کرو۔“ حتمی کس قدر پیچھے پڑ گئی تھی۔ بڑی بہو ہے وہ اس گھر کی۔“ فرہاد صاحب بھی ریلیکس ہونے کے خیال سے کمرے میں آئے تھے۔ ان کی بات پر ماہ پارہ نے اک گہری نظر ان پر ڈالی۔ انہیں آنسو کی مدح سرائی ذرا اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

☆.....☆

”تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔۔۔۔۔ بیٹھے بیٹھے کمر اڑ گئی ہوگی تمہاری۔“ آنسو کو عرشان ولی کی خواب گاہ تک لے آئی تھی۔ آنسو کی آنکھیں گھر کی زیبائش و آرائش پر ششدر رہ گئی تھیں۔ جتنا وہ خود وجیہ تھا اتنی ہی اس سے بڑی چیزیں حسین تھیں۔

”شکریہ بھابھی! آپ بھی بیٹھیں۔“ حتمی اس کے آرام کے خیال سے اس کی بیک پر کشن لگا رہی تھی۔ آنسو اس کی اس درجہ محبت پر بے ساختہ اس کا ہاتھ تھام کر پھولوں سے سجے بستر پر اسے بھی بٹھائی۔

”آنسو! آج تم نے جتنے بڑے پن کا مظاہرہ کیا اس نے مجھے مزید تمہارے قریب کر دیا۔ تم بہت صاف دل کی ہو۔“ حتمی اس کے حنائی ہاتھ تھام کر بے ساختہ تعریف کر گئی۔ آنسو کی چنداں ملاقات ہوئی تھی حتمی سے۔ لیکن وہ اس کے اوصاف سے اچھی طرح آگاہ ہو چکی تھی۔ وہ بھلے شکل و صورت سے بہت خوب صورت نہیں تھی مگر اس کا دل بہت خوب صورت تھا۔ آنسو کو حتمی کا بیک گراؤ نڈا سے چٹا تھا۔ وہ خاصی امیر کیریئر کی سی تھی مگر اس کے انداز میں ذرا غرور نہیں تھا۔ وہ ماہ پارہ کی طرح نخوت کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔

”مجھے بھی آپ ہمیشہ بڑی بہن جیسی لگتی ہیں۔ عرشان آپ کی سچری بہت تعریف کرتے ہیں اور ان سے جڑا ہر شخص مجھے بہت عزیز ہے۔“

”تم بالکل عرشان جیسی ہو۔ تم دونوں واقعی اک دوسرے کے لیے ہی بنے ہو۔ They are made for each other! اللہ تم دونوں کو ہمیشہ خوش رکھے۔“ حتمی بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔ آنسو اس ممانعت پر ہنس پڑی تھی۔

”بھوک لگ رہی ہوگی میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ بھیجتی ہوں چائے کے ساتھ تھکن بھی ریلیز ہو جائے گی۔“ حتمی مسکراتی ہوئی چلی گئی تھی۔

آنسو تنہائی پاتے ہی کمرے کا جائزہ لینے لگی تھی۔ اس شخص کے زیر استعمال اک اک چیز کو وہ محبت سے دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

”تم یہاں کیا کر رہے ہو عرشان جاؤ آنسو اکیلے ہے۔ میں چائے کے ساتھ اسٹینکس بھی دے آئی ہوں۔“ جھجک میں بھوکی نا پیٹھی رہے جا کے کھلاؤ نئی نو لی بیگم کو۔“ حتمی چائے کی ٹرے لیے لاؤنج میں آئی تو عرشان کو شاہ میر سے جو گفتگو دیکھ کر بولے بناء نہ رہ سکی۔

”میں تو کب سے جانا چاہ رہا ہوں۔ آپ کے شو ہر نامداری دنیا جہاں کی باتیں لیے بیٹھے ہیں۔“ عرشان ولی نے شرارت سے شکایت بھرے انداز سے کہا تو شاہ میر کا منہ حیرت سے کھلتا چلا گیا۔ حتمی تھیکے چوتھوں سے اسے گھورنے لگی تھی۔

”بہت زیادہ۔“ آنسور کا دوسرا ہاتھ اس کے سر پر آگیا تھا جس شخص کو دیکھ کر ہر گھڑی جدا ہو جانے کا خیال ستاتا تھا اب وہ شرعی رشتے میں بندھ کر اس کے پاس تھا۔ اس کا تھا۔

”آنسور! میں نے بہت صاف ستھری زندگی گزار لی ہے۔ میرا ہمیشہ سے یہ یقین تھا کہ اس روئے زمین کے اک کونے میں وہ لڑکی میری منتظر ہے جسے خالق کائنات نے میری پہلی سے بنایا ہے۔ میں نے اپنے ہر جذبے ہر لفظ کی بہت حفاظت کی ہے۔ امین بن کر سنبھال رکھے تھے تمہارے لیے۔ اس میں ذرا برابر بھی خیانت نہیں کی ہے اور جب تم مل گئیں تو جیسے میرا وجود دوبارہ مکمل ہو گیا۔ تم سے ملنا تم سے باتیں کرنا تمہارے ساتھ گزارا ہر اک بل مجھے بہت خوشی دیتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جس طرح میں نے تمہاری امانت میں خیانت نہیں کی تم نے بھی نہیں کی ہوگی۔“

عرشان ولی دھیمے لہجے میں خود کو پرت در پرت کھول رہا تھا اور آنسور کے ذہن میں اک دم سے جھماکا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات آگئے تھے۔

”کیا نیشن ہے کھوئی کھوئی سی ہو۔“ عرشان ولی نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تھا اپنے سینے پر رکھے اس کے ہاتھ کو گرفت میں لے لیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے میں اس سے پہلے بھی یہ باتیں کہیں سن چکی ہوں لیکن یاد نہیں آ رہا ہے کہاں؟“ وہ ذہن پر زور دینے لگی تھی۔ اس کے ذہن سے کاشان اور اس سے جڑی ساری باتیں محو ہو چکی تھیں۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی جو کاشان نے عرشان ولی کا ذکر کرنا شروع کیا تھا تب ہی اس کے لاشعور میں گم ہوئی بات شعور پر نہیں آ پاری تھی۔

”میری باتیں تمہیں کون بتائے گا۔ میں تمہارے خوابوں میں تو نہیں آتا تھا؟“ وہ چیخ رہا تھا وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”مجھے تم سے آج تک ایک شکایت رہی ہے۔“ انداز پر سوچ تھا۔

”کیا؟“ وہ پریشان ہونے لگی۔

”میں نے ہمیشہ اپنے جذبات کا تمہارے سامنے اظہار کیا مگر تم نے آج تک نہیں بتایا کہ تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے۔“

اس کا گلہ نہ کر آنسور نے لمبی سانس لی۔ وہ تو ڈر رہی تھی کہ جانے اس نے کون سی غلطی کر دی۔

”محبت کو لفظوں میں بیان کرنے کی اہلیت مجھ میں نہیں ہے۔“ وہ جھینپ گئی تھی۔

”پھر عملاً بتا دو! کس نے روکا ہے۔“ وہ شریر ہو رہا تھا۔ آنسور نے اس کے بال کھینچ دیئے تھے۔ دونوں مسکرانے لگے تھے۔

”تم پہنچ کر لو پہلے۔ بہت ہیوی ڈریس ہے۔ تمہاری تحسین کا احساس ہو رہا ہے۔“

وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ آنسور اٹھنے کی کوشش میں ہیوی لیٹ کے باعث ڈول سی گئی تھی۔ عرشان ولی نے بے ساختہ اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھنے میں مدد دی تھی۔ وہ اسے لیے وارڈ روم تک آگیا تھا۔

”آؤ پہلے میں تمہیں تمہاری چیزیں دکھا دوں، یہ تمہارا وارڈ روم ہے۔ پہلے میں تمہارے ڈریس، دوسری میں جوتیاں اور تیسری میں بریس، جیولری اور دیگر چیزیں ہیں۔“ وہ ایک ایک وارڈ روم کھول کر دکھا رہا تھا۔ آنسور کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ہر چیز ہی خیرہ کرنے والی اور کثرت سے موجود تھی۔ جانے اس نے کب اور

کیسے اتنی ساری شاپنگ کی تھی۔ اب وہ لاکھول کر اس میں سے باکس دکھا رہا تھا۔

”یہ گولڈ اور ڈائمنڈ کی ساری جیولری تمہاری ہے۔ کیش بھی موجود ہے، یہ سب تمہارا ہے، تم جیسے چاہو! وائٹس استعمال کرو، تم سے کوئی پوچھ کچھ نہیں ہوگی۔ تمہارا اکاؤنٹ میں کل ہی کھلوادوں گا۔ کریڈٹ کارڈ اور اسے ٹی ایم بھی جلد مل جائے گا۔ اس گھر میں موجود ہر چیز تمہاری ہے۔“

وہ محبت سے ایک ایک چیز دکھا کر اس کا مان بڑھا رہا تھا۔ آنسور کو کسی بھی لمحے اس کی محبت پر شک تو کبھی نہیں ہوا تھا مگر اتنا کچھ یا کر اس کا دل عقیدت سے جھک ضرور گیا تھا۔

”اتنا سب کچھ میرا ہے اور آپ؟“ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی جس کی آج چھب ہی نرالی تھی۔

”میرے لیے یہ سب بے معنی ہے اگر آپ کے بناء یہ سب ملے آپ کے مقابل ان کی چمک بھی مانند ہے، میری نظر میں۔“

وہ صدق دل سے کہہ رہی تھی۔ پیسہ، رتبہ اس کی مانگ ضرور تھی اور وہ رب العزت نے اسے دان کر دیا تھا لیکن جس شخص کی بدولت اسے یہ سب حاصل ہوا تھا اس کی نظر میں اس کے ساتھ سے بڑھ کر ساری مادی دولت بچ نہیں۔ عرشان ولی اس کے اظہار پر شاعر ہو گیا تھا۔ وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسا اس نے ہمیشہ اپنی شریک سفر کو سوچا تھا۔

اس کی گردن کے گرد بازو حائل کر کے وہ ہولے سے اپنا سر اس کے ساتھ لگا گیا تھا۔

”اس میں بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ سویٹ ہارٹ..... میں بھی تمہارا ہی ہوں۔“ وہ برملا اظہار کر گیا تھا۔

”سب کچھ بہت اچھا بہت خوب صورت ہے۔“ وہ دل سے تعریف کر رہی تھی۔

”سب کچھ اچھا کرنے کی کوشش میں ایک کی رہ گئی۔“ وہ جیسے افسردہ ہوا۔

”کیا اتنا کچھ کے بعد اور کیا کی رہ گئی؟“ وہ حیران سی۔

”تمہاری منہ دکھائی ہزار سوچنے کے باوجود ایسی کوئی چیز ذہن میں نہیں آئی جو منہ دکھائی میں تمہارے شایان شان لگتی۔ تم ہی میری مشکل آسان کر دو۔“ وہ کچھ بے چین تھا۔

”میرے تصور سے بڑھ کر آپ نے اتنا کچھ کیا ہے۔ مان محبت دنیاوی ہر شے جیولری پیسے اور کیا رہ جاتا ہے۔ سب کچھ تو دے دیا آپ نے مجھے۔“ وہ مسکرائی۔

”پھر پھر ہر کچھ Perfect کرنے والا عرشان ولی اس لمحے خود کو تمہارے سامنے چھوٹا محسوس کر رہا ہے کہ اپنی ہیوی کو اس کے مقابل میں کچھ نہ دے سکا۔ جانے کیوں کچھ غلام سا ہے۔“ وہ منہ بسورنے لگا۔

”فضول باتیں نہ سوچیں۔ مجھے آپ مل گئے۔ سب مل گیا۔“ وہ سمجھانے لگی۔ عجیب دیوانا تھا اتنا کچھ کر کے بھی بے چین تھا۔

”چلو تمہیں ایک گریڈ آفر کر رہا ہوں۔ روٹمائی کے بدلے میں زندگی کے کسی بھی لمحے میں تم جو مانگو گی تمہیں دوں گا، بھلے میری جان ہی کیوں نہ مانگ لو۔“

”پلیز عرشان! ایسی باتیں نہ کریں۔“ وہ کھیرا کر اپنی گردن کے گرد حائل اس کا بازو سختی سے دبوچ گئی۔

”میں اپنی زبان کا پکا ہوں۔ اوپن آفر ہے تمہیں۔ جانے کیوں تم سے یہ کمیشنٹ کرنے کو دل چاہ رہا ہے۔“

آنسور پلٹ کر بے ساختہ سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ سخی، سنوری دلہنا پے کے روپ میں اسے اپنا دیکھ کر

عرشان ولی کے لبوں پر دلفریب آسودہ مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ وہ اس کے دونوں شانوں پر اپنے دونوں بازو داکر گیا تھا۔

”میں نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا لاچار محسوس نہیں کیا تھا جتنا ان تین دنوں میں کیا۔ جب مام نہیں مان رہی تھیں۔ اسی کمرے میں ہزار بار پتل کنپٹی سے لگا کر خود کو شوٹ کرنے کی کوشش کی مگر ہر بار تمہارا چہرہ سامنے آ جاتا تھا اور میری انگلی ٹریگر پر کا پٹنے لگتی تھی۔ میں مگر کبھی تم سے الگ ہونے کا تصور نہیں کر سکتا۔“ وہ دھستے سروں میں اپنے جذبات و محسوسات اس کی دھڑکنوں کے ساتھ باندھ رہا تھا۔ وہ تھیر تھی۔

”مجھ میں ایسی کوئی خاص بات نہیں عرشان، جو دنیا میں کسی اور لڑکی سے مختلف ہو۔ پھر آپ نے کیوں شدت سے میری خواہش کی؟“ اسے آج تک حیرت تھی۔

”I Don't know!“ کہا ناں میں تمہارے معاملے میں خود کو لاچار محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے، ولید کے آفس میں جب میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا۔ اس وقت تمہاری خاموشی پر مجھے اپنا دل بند ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ تم انکار کرتی تھیں تو نے لی مجھے ہارت ایک ہو جانا یا برین بھرج۔“ وہ بیٹا ہوا گل یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔

”کیا ہے کیوں بد فعلائیں نکال رہے ہیں منہ سے؟“ آنسوؤں نے اس کے بازو اپنے شانوں سے جھٹک دیئے۔

”ناراض ہو گئی ہو سزا؟“ اس کے وجود کے گرد بازو جھٹک کر کے قریب کیا۔

”مجھے نہیں کرنی آپ سے بات؟“ وہ زور دے ہوئی۔

”تو کیا باہر جا کر تارے گنوں؟“ وہ معصومیت سے استفسار کر رہا تھا۔

”مرضی ہے۔“ وہ روٹھ چکی تھی۔

”اجھا سوری نا!“ اس نے ہولے سے اپنی پیشانی اس کی پیشانی سے ٹکرائی۔

”پھر کریں گے ایسی باتیں؟“ وہ بے اعتباری دکھا رہی تھی۔

”سوچیں گے۔“ وہ شرارت سے مسکرا رہا تھا۔ آنسوؤں نے اس کے شولڈر پر دمکا مارا تھا۔ وہ مسکرا کر اسے خور میں سمو گیا۔

☆.....☆

تمہارے گرد دائرہ ہے میری دعاؤں کا

تم میرے انتخاب کی مقدس لکیر ہو

اس کی آنکھ خود ہی کھل گئی تھی۔ اس نے چند لمحے اجنبی ماحول کو سمجھنے میں لگائے تھے۔ وہ اپنے خستہ حال گھر

میں نہیں عالی شان خواب گاہ میں موجود تھی۔ صبح ہو چکی تھی مگر کمرے میں ابھی تک اندھیرا تھا کہ عرشان ولی کو روشنی

کی ایک کرن بھی ڈسٹرب کر دیتی تھی۔ اس نے دائیں جانب نگاہ کی تھی۔ سفید گرتے پا جاسے میں عرشان ولی

اس کی طرف کروٹ کے سورہا تھا۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے وجہ چہرے کے اک اک نقوش کودل

میں اتار رہی تھی۔ وہ شخص جتنا خوب صورت تھا اتنا ہی نفیس انسان تھا، اپنی عادات و اطوار کی بناء پر وہ دل میں

مزید گھر کرتا جا رہا تھا۔

”جو خواب میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا اللہ نے اس سے کہیں بڑھ کر نوازا۔ میں نادان تھی جو خود

قسمت بنانے کا دعویٰ کرتی تھی۔ قسمت تو جسے چاہے اس کا دامن موتیوں سے بھر دے اور جسے چاہے

ایڑیاں رگڑنے پر بھی کچھ نہ دے۔

”تم نے تمہارے جذبول نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں ہمیشہ تمہاری وفادار رہوں گی۔“ وہ اس پر انگریز

جھانے بے ساختہ اس کے قریب آ گئی تھی۔

”عرشان ولی! میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ تمہارے بناء نہیں رہ سکتی۔“ اس کے کان کے قریب منہ

لے جا کر اس نے دھیمی سی سرگوشی کی تھی۔ وہ سیدھی ہی ہونے لگی جب اس کے گرد عرشان ولی کا بازو حائل ہو گیا

تھا۔

”ذرا پھر سے کہنا۔“ اس نے شرارتی بچے کی طرح آنکھیں داکر دی تھیں۔ وہ بے طرح جھینپ گئی۔

”آپ جاگ رہے تھے؟“ وہ شرما گئی۔

”نالومت کہو نا۔“ اصرار ہوا۔

”جی نہیں۔“ اس نے اس کے بال بکھیر دیئے۔

”سوئے بندے سے اظہار محبت اور جاگتے کو ہری جھنڈی۔“

”That's not fair mrs!“ اس نے منہ بسورا۔

”Every thing is fair in love and war!“ وہ شرارت سے چڑ گئی تو وہ منہ پر ہاتھ پھیر

کے رہ گیا۔ وہ کھلکھلا گئی تھی۔

”شٹ لونچ گئے؟“ اس کی نظر وال کلاک پر بڑی توجہ تھ بیٹھا۔

”آفس جانا ہے؟“ وہ بھی سیدھی ہوتی استفسار کرنے لگی۔

”ایک ضروری ڈیلنگ ہے، بس دو گھنٹے لگیں گے۔ تم کہو گی تو کینسل کر دوں گا۔“ وہ اس پر چھوڑ گیا کہ شاید

اسے برا لگے اس کا جانا۔

”آپ جائیں، کام ضروری ہے میں تو یہیں ہوں اب۔“ وہ نفی میں سر ہلاتے اس کے کرتے کاٹن بند

کرنے لگی تھی۔ عرشان ولی نے دلچسپی سے اس کے عمل کو دیکھا تھا۔

”فوسوئیٹ! تم بھی تیار ہو جاؤ نا شے پر سب ویٹ کر رہے ہوں گے۔ میں بس دو منٹ میں آیا۔“

عرشان ولی پھر پٹی سے اٹھ کر واش روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ آنسوؤں نے بھی اٹھ کر وارڈ روم سے اپنا سوٹ

ٹکالا تھا۔ چیکنگ روم سے پنک ٹر کا سوٹ زیب تن کر کے آئی تو آئینے کے سامنے اسے اپنا وجود ہی نیا لگا۔ وہ

مسکرا کر لائٹ سا بے بی پنک میک اپ کر کے بال بنا رہی تھی۔ کف ٹکس لگاتا عرشان ولی آنسوؤں کے ساتھ

آکھڑا ہوا تھا۔ اسے تیار دیکھ کر وہ کف ٹکس لگانے لگی تھی۔ اس کا ہر عمل ہی محبت لیے ہوتا تھا۔

”یہ میری محبت کا کمال ہے، یام مزید حسین ہو گئی ہو۔“ وہ بے ساختہ اس کے کھلے بالوں کو چھیڑ گیا تھا۔

”آپ کی محبت کا۔“ کف ٹکس لگا کر اس نے اس کی کلائی میں روٹکس بھی ڈال دی۔

”لیٹ ہو جائیں گے۔“ وہ اس کی شرارتوں پر ہنس کر گئی تھی۔

”میں نہیں جا رہا آفس!“ آنسوؤں کے پرے دھکیلے بروہ ٹھک کر بولا۔ آنسوؤں کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”کیا اسکول بوائے والا جملہ اور انداز ہے۔ کام کیسے کرتے ہیں آفس میں؟“ وہ مذاق اڑا رہی تھی۔

”یار سزا! کام تو ہم ایسا کرتے ہیں کہ ساری دنیا تعریف کرتی ہے۔ بس تمہیں دیکھ کر ڈول ڈول ہو رہا ہوں۔“

وہ شوخی سے کہہ رہا تھا اور آنسوؤں سے پہلے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے بھاگنے پر وہ ہنس پڑا تھا۔

(جاری ہے)

کرن نعمان

ساتھ بہن کی رہائش

دروازہ کھول کر آذر اندھیرے گھر میں داخل
ہوئے تو دیکھا چند شاپرا اور مڑے بڑے اخباروں کے
ٹکڑے ہوا سے اڑتے پھر رہے تھے شاید وہ صبح کوئی
کھڑکی بند کرنا بھول گئے تھے لائٹ جلا کر دروازہ بند



کیا اور پھر گھر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہر چیز مٹی سے
اپنی ہوئی تھی بڑی بڑی چاروں سے ڈھکے صوفے
گندہ قالین گندے ڈانٹنگ ٹیبل اور گندے برتن
عموماً وہ صبح برتن دھو کر اور ٹیبل صاف کر کے جاتے
تھے آج چونکہ خاصی جلدی میں نکلے تھے اس لئے
ناشتے کے برتن ٹیبل پر ہی چھوڑ گئے تھے ایک آدمی
کے برتن ہی کتنے ہوتے ہیں چھوٹا تھرماس، ایک کپ
اور دو پیس ایک انڈے کی اور ایک ٹوس کی آج ان
کے گھر کو اس حال میں آئے پورا ایک سال، کیا تھا
ایک سال پہلے شام پانچ بجے تک ان کے گھر میں
زندگی تھی اور پھر اس کے بعد مستقل ایک مردنی سی
چھا گئی انہوں نے ایک سنگل صوفے پر سے چادر
جھاڑ کر اتاری اور کوٹ سمیٹے مائی ڈھیلی کرتے ہوئے
اس پر ڈھیر ہو گئے ان کی عمر کا تینا لیسواں سال رواں
تھا آج وہ سوچنے پر مجبور تھے کہ کیا اتنا طویل وقت
طویل جدوجہد اس لئے کی تھی کہ آخر میں صرف تنہائی



نصیب بن کر رہ جائے کیا تھا جو وہ میری کچھ بری باتوں کے ساتھ کپڑا ماز کر رہی تھی خواہ خواہ ہی مجھے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ باہر۔

☆☆☆☆

”شارب! اب اٹھ جاؤ بیٹا بارہ بجے اوپر ٹائم ہو گیا ہے۔“ صبیحہ نے اپنے بید سے چادر پٹپٹی اور پھر نکلے کا غلاف اتارنے لگیں۔

”کیا ہے ای! اسنڈے کو تو چین سے سونے دیا کریں۔“

شارب نے چہرے پر چادر پٹپٹی اور کروت بدل لی۔

”کیسے سونے دوں بیٹا سنڈے کو ہی تو کام زیادہ ہوتے ہیں میں نے تمہیں لگا لی ہے کھانا کانا ہے برتن بھی دھونے ہیں ماما کی پوسی ہے اس لئے صفائی بھی خود ہی کرنی ہے۔“

”امی دو چار کام اور بھی بڑھالیں مجھے اس نے چادر پر بے جھٹک دی۔

”اچھا اب جلدی سے اٹھو ناشتہ کرو اور پھر میرا کام میں ہاتھ بٹاؤ۔“ وہ برے برے منہ بناتی اٹھ گئی۔

”کہا ہے سچ اس سے اچھے تو اپنے گھر میں ہی تھاتے جھنجھٹ تو نہیں تھے۔“

”اپنے گھر میں۔“ داش روم سے اس کے کپڑے اتارتے ان کے ہاتھ رک گئے۔

”تو پھر یہ کس کا گھر ہے۔“ ان کا دل چاہا اس سے پوچھیں پر کیا پوچھتیں، دونوں ماں بیٹیاں ایک دوسرے کے حال سے واقف تھیں کنارہ تو انہوں نے

کیا تھا اور وہ بھی ان کے ساتھ کنارے تک آئی تھی پر وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس کی نگاہیں اب بھی دوسرا کنارہ ڈھونڈتی ہیں ایک سال پہلے وہ اس کے مستقبل کے لئے ہی تو آڈر کا گھر چھوڑ کر آئی تھیں پر

اکثر اس کی ایسی باتیں انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا کرتی تھیں کہ وہ کتنی سچ تھیں اور کتنی غلط۔

☆☆☆☆

”بڑے صبح وقت پر آئیں آپ فرمان بھائی ابھی

ابھی آپ کا پرافٹ دے کر گئے ہیں یہ لیجئے پورے پینتالیس ہزار ہیں گن لیجئے۔“ رجا آڈر کو دیکھ کر ادا سے مسکرائی اور گئے بغیر پیسے اٹھا کر پرس میں رکھ لئے۔

”آپ کے ہاتھ سے نکلے ہیں تو پورے ہی ہوں گے۔“ آڈر اس کی باتوں اور اداؤں کے شیدائی ہوتے جارہے تھے وہ ایک چھوٹے سے شادی ہال کے مالک تھے جس میں ڈھائی سو سے تین سولوگوں کی

گنجائش تھی پر اس کے آفس میں بیٹھ کر وہ پر اپنی کام بھی کرتے تھے کچھ عرصے پہلے انہوں نے اپنے محلے دار کا پلاٹ بکویا تھا جس میں اسے تیس پچیس ہزار کا منافع ہوا تھا اس کے بعد تو وہ آئے دن انوسٹ

کرنے لگی تین چار ماہ بعد اسے کچھ نہ کچھ مل ہی جایا کرتا تھا، زیادہ عمر نہیں تھی ماں باپ نے کم عمری میں

شادی کر دی تھی ایک دو سال بعد طلاق ہو گئی، اب وہ ماں باپ پر بوجھ بنے بغیر ادھر ادھر جوڑ توڑ کر کے اپنا

کاروبار کر رہی تھی۔

”آپ کی بیوی بیٹی واپس آئیں یا نہیں۔“

باتوں باتوں میں وہ ان کے تمام حالات جان چکی تھی۔

”ابھی تک تو نہیں۔“

”کیا آپ کو لگتا ہے کہ وہ واپس آجائیں گی۔“

اس کی بات پر وہ چند لمحوں کو سوچ میں پڑ گئے۔

”آپ سراب کے پیچھے بھاگ رہے ہیں آڈر! کب تک تنہا رہیں گے میرے پاس آپ کے لئے ایک آفر ہے سوچ کر بتائیے گا۔“ آڈر اس کی بات پر چونک سے گئے۔

”بتائیے۔“

”مجھ سے شادی کر لیں۔“

”جی۔“

”پر کیا؟“

”میری اور آپ کی عمر میں اٹھارہ بیس سال کا فرق ہے۔“

”تو کیا ہوا مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے بیچور مرد مجھے اچھے لگتے ہیں۔“ اس کی بات سن کر وہ تذبذب کا

شکار ہو گئے۔

”آپ گھبرا کیوں رہے ہیں اچھی طرح سوچ کر جواب دیجئے گا۔“ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں

کر کے وہ لوٹ گئی پر آڈر کی کیفیت عجیب سی تھی وہ جانتے تھے زمانہ بہت ایڈوانس ہو چکا ہے پر اس کے

باوجود رجا کا خود سے انہیں پر پوز کرنا اچھا نہیں لگا، مگر وہ آسانی سے اس کا خیال دل سے جھٹک بھی نہیں

پائے آخر کو مرد تھے اور ایک سال سے تنہا زندگی گزار رہے تھے۔ دل نے انہیں دوسرا گھر پر لاکھڑا کیا تھا

اب انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ادھر جا لیں یا ادھر جب کچھ نہیں سوچا تو جائزہ کے گھر کی راہ لی، وہ ان سے

تین سال چھوٹی اور بالکلونی بہن تھی ان کی غلطی اور ہمدردی گھر جان وہ غلط ہوتے وہاں انہیں کھری کھری

سنا بھی دیتی تھی سنگل بند ہونے کی وجہ سے ایک چورائے پر کر کے نظر گھا کر اسے برابر کھڑی گاڑی کی

طرف دیکھا تو چند لمحوں کو دیکھتے رہ گئے نظروں کا

ارکا ز محسوس کر کے صبیحہ نے بھی ان کی طرف دیکھا

کافی دنوں بعد دونوں کا آمناسنا ہوا تھا شارب بھی ان کے ہمراہ تھی پر اس نے باپ کو نہیں دیکھا اسی اثناء

میں اشارہ کھل گیا، پچھلی گاڑیوں نے ہارن بجانا شروع کر دیئے آڈر نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی مگر

صبیحہ کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکی آڈر نے بیک یو پو

ہر میں دیکھا کہ صبیحہ کی گاڑی میں کوئی پرالہم ہو گئی تھی ان کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی گاڑی اشارت

نہیں ہو رہی تھی پچھلی گاڑیوں کے ہارن چیخے جارہے تھے اور وہ دونوں ماں بیٹیاں گھبرائی ہوئی تھیں آڈر

لے آگے جا کر فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روکی اور

کریا بھاگتے ہوئے گاڑیوں سے بچتے بچاتے صبیحہ

کی کار تک آئے اور دھکا لگا کر گاڑی ٹریفک سے نکال کر اپنی گاڑی کے قریب لے آئے۔

”بونٹ کھولو۔“ وہ دونوں اس ساری صورتحال پر گھبرائی ہوئی تھیں، صبیحہ نے بونٹ کھولا تو وہ انجن پر

جھک گئے شارب باہر نکل آئی انہوں نے کچھ چیزوں کے ساتھ پیچھے چھاڑی پھر صبیحہ سے گاڑی اشارت

کرنے کے لئے کہا گاڑی اشارت ہو گئی۔

”تھینک یو بابا۔“ انہوں نے شارب کا سر تھپتھپایا اور ایک سر دنگا صبیحہ پر ڈالنے اپنی گاڑی کی

طرف بڑھ گئے۔

☆☆☆☆

آج وہ کافی دنوں بعد شاہ بانو چچی کی طرف آئی تھیں راستے میں انہوں نے پہلے شارب کو کچنگ

چھوڑا تھا، پھر چچی کی پسندیدہ پھیل پوری خریدی تھی،

خیر سے شاہ بانو چچی ٹھیانے کو تھیں، مطلب عمر میں

ساتھ کے قریب تھیں ہر زبان کو چٹا رہا ایسا لگا تھا کہ

جانتے پورتوں کو بھی مات کیا ہوا تھا۔

خیر سے بڑے دنوں بعد چکر لگا یا اس باز۔“

”کیا کروں چچی! مصروفیت اتنی زیادہ ہے کہ

ضروری کاموں کے علاوہ نکلنا ہی نہیں ہوتا، آپ

سنائیں طبیعت کیسی ہے چچا جان مجھے ہے۔“

”ارے کیا پوچھتی ہو بیٹا! طبیعت تو اس کے مرد جیسی ہی ہوتی ہے مرد تنہا ہوتا تو وہ بھی

ہشاش بنشاش ہوتی ہے چڑچڑاہو تو چڑچڑی ہو جاتی

ہے اور اگر بیمار ہو تو بظاہر تندست سہی پر اندر سے

اسے بھی خوف کی بیماری ہو جاتی ہے اپنا بھی بس

یہی حال ہے تم سناؤ تمہارے مرد کا کیا حال ہے

کچھ ہوش ٹھکانے آئے اس کے یا ابھی بھی وہی

رنگ ڈھنگ ہیں؟“ اسپرے گئے ہاتھ سے رکھ کر

انہوں نے بالکلونی میں رکھے پودوں کی صفائی کا

نقدانہ جائزہ لیا پھر ہاتھ چھاڑی ہوئی لاؤنج میں

آ گئیں وہ بھی ان کے پیچھے تھیں۔

”یہ نہیں چھی! فائزہ تو کہتی ہے اب کافی سنبھل گئے ہیں گھر میں لوگوں کا آنا جانا بھی برائے نام ہی رہ گیا ہے اور پینا پلا نا بھی چھوڑ دیا ہے پر میرے لئے تو اب بھی ویسے ہی لگتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے پتہ؟“ جواباً انہوں نے روڑ پر ہونے والی حادثاتی ملاقات کی روداد سنا ڈالی وہ دھیرے سے مسکرا دیں۔

”مرد کے معاملے میں عورت بھی بڑی ہی ناشکری چیز ہے اب یہی دیکھ لو تمہاری پریشانی پر نہیں اس کا پریشان ہونا نظر نہیں آیا ایک ذرہ تیوری چڑھا کر دیکھو تو تمہارے دل کو پتہ لگ گئے تمہیں کیا لگا تھا کہ گھر چھوڑ جائے والی بیوی کو وہ محبت پاش نگاہوں سے دیکھنا چھی کی بات اس کے دل کو بہت بری لگی۔“

”نادیکھتے محبت سے مگر کچھ شرمندہ تو نظر آتے آ خر کو میں نے گھر ان کی کرتوتوں کی وجہ سے ہی چھوڑا تھا ورنہ کس عورت کا دل چاہتا ہے کہ اپنی ہی سبائی جنت سے نکل کر دنیا کے جہنم میں جائے۔“ ملازمہ چائے لے کر آئی تو انہوں نے اسے اپنے لئے چائے بنانے کا کہا اور خود پھیل پوری کا پیالہ لئے صوفے پر پاؤں پیرا کر بیٹھ گئیں۔

”دیکھو صبیحہ! مرد کی انا کی دیواریں عورت سے کہیں زیادہ بلند ہوتی ہیں! اپنے اعمال پر نادم مرد بھی ایک حد تک ہی خود کو آزمائش کے لئے پیش کرتا ہے کہیں نہ کہیں عورت کو مصالحت کا دروازہ کھلا رکھنا چاہئے اگر وہ سنبھل رہا ہے تو بہتر ہے تم اسے سہارا دے کر پورا کا پورا استنبھال لو ورنہ ایسا نہ ہو وہ تمہاری طرف سے مایوس ہو کر کسی اور کا سہارا لے لے۔“ چائے میں چینی ملاتا ان کا ہاتھ تھام گیا۔

”کیا یہ کمزوری کی راہ نہیں اب جب میں اپنے بیروں پر کھڑی ہو رہی ہوں تو اپنے خیر کاٹ کر انہیں دے دوں ان کی خاطر ماں باپ کا گھر چھوڑا اولاد کی

خاطر ان کا گھر چھوڑا اور اب جب میرا اپنا ایک گھر ہے تو وہ کس کی خاطر چھوڑوں ایک عیاش انسان کی خاطر؟ جس کا کیا بھروسہ میرے وہاں جانے پر پھر ویسا ہی ہو گیا تو کیا بار بار آنا جانا ہی لگائے رکھوں گی جو ان بیٹی کے ساتھ؟“ وہ کچھ دیر چپ رہیں۔

”زندگی تو جوئے کی بازی کی طرح گزرتی ہے بیٹا! قدم قدم پر دواؤ لگانے پڑتے ہیں رسک اٹھانے پڑتے ہیں مرد کی ترجیحات مختلف ہوتی ہیں مگر عورت کی جی پہلی ترجیح اس کی اولاد بن جانی ہے شارب کی خاطر اٹھایا جانے والا تمہارا قدم غلط نہیں تھا پر اب ایک بار پھر اس کے مستقبل کی خاطر تمہیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی چاہئے۔“ ان کا اشارہ جس طرف تھا وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھیں اس لئے بات کو مزید طول دینے بغیر چپ چاپ چائے پینے لگیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

واپسی میں انہوں نے پہلے شارب کو پک کیا پھر گھر پر ضروری سامان لیتی ہوئی گھر آ گئیں شارب انہیں گھر آ جانے کے لئے بیٹھ سانی رہی اور وہ چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ بھارتی رہیں۔

”زندگی کے ایسے عورت بھی ایک ریل ایکٹرس ہی ہوتی ہے۔“ یہ ان کے اندر کا غلط فہم تھا کھانا کھا کر شارب جلد ہی سونے کے لئے لی گئی، کچن سیٹ کر وہ اپنے کمرے کے ساتھ ملحق بالکونی میں آ گئیں اور اپنا وجود آرام کرسی کی آغوش میں دے دیا، ہولے ہولے آگے پیچھے جھولنے ان کی نگاہ ٹیلیک پر کی جبکہ ان کا ذہن ماضی میں محو پرواز تھا رحمت علی پر برکت علی کے بڑے بھائی تھے صبیحہ ان کی اکلونی اولاد تھیں جبکہ برکت علی کے چار بچے تھے دو بیٹیاں اور دو بیٹے صبیحہ کا اپنا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا اس کا زیادہ تر بچپن شاہ بانو چچی کے کمرے میں گزرا، میٹرک کے بعد اماں کا انتقال ہوا تو لوگوں نے اسے شاہ بانو چچی کی ہی تیسری بیٹی سمجھنا شروع کر دیا رافعہ اور عافیہ بچوں کی طرح اس

نے بھی گھر میں ہی رہتے ہوئے پرائیویٹ ایم اے اسلامیات کیا، آذر کا رشتہ ابا جان کے ایک جانے والے کے توسط سے آیا، چٹ منگنی پٹ پیاء والا معاملہ ہوا، گھونگھٹ اٹھنے پر صبیحہ نے آذر کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، ان کا شمار حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا پر آذر مردوں میں حسین ترین تھے اور ان کا یہ وصف صبیحہ کے لئے ایک صدمہ ہی تھا، پہلی رات سے جو انہوں نے خود پر فدا ہونے والی خواتین کے قصے سنانے شروع کئے تو آخری رات تک یہ سلسلہ چلتا ہی رہا، ایک بار صبیحہ نے آذر کے دوست کی بیوی سے اس بات کا ذکر کیا تو وہ کافی دیر ہنسنے کے بعد بولی۔

”بھابی آذر بھابی! تو حق بجانب ہیں ذرہ میرے میاں کو دیکھئے خور کے بھائی میں گھور رہتی ہے دنیا پر ان کے عشق و عاشقی کے لئے قصے ہیں کہ دیوان کے دیوان ختم ہو جائیں مجھے تو حیرت ہوتی ہے تو بے پر جلی رونی جیسی رنگت اور عام سے لڑکیوں کے آنکھوں والی لڑکیاں کیسے فدا ہو جاتی ہیں۔“ وہ خاتون شاید اپنے دل کے جلے پیچھولے پھوڑ رہی تھیں اس کے بعد صبیحہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہ رہیں آذر کا ڈیڑوں کی سیل پر چیز کا کام کرتے تھے ان کا اپنا ذاتی کوئی شوروم نہیں تھا اس لئے گاڑیاں پسند کرنے لوگ گھر پر ہی آتے تھے اور جب آ جاتے تھے تو پھر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چائے شربت پی کر ہی جاتے تھے آذر تو باتوں میں لگے رہتے تھے مہمان داری صبیحہ کو ہی کرنی پڑتی تھی طرح طرح کے لوگوں کے سامنے آنا ان کے لئے ایک صبر آزمایہ مرحلہ ہوتا تھا ہر طرح سے نبھانے کے باوجود آذر بھی ان کی اس خدمت سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔

”یہ کیا تم سر جھاڑ منہ بھاڑاٹھ کر مہمانوں کے سامنے آ جاتی ہو؟“ بھی غوری صاحب کی بیگم کو دیکھا ہے کس طرح ٹپ ٹاپ سے رہتی ہیں سر سے لے کر پیر تک تک سب سے تیار ہو کر مہمانوں کے سامنے

آتی ہیں آدھی ڈیڑ تو ان کی مسکراہٹوں سے متاثر ہو کر ہی ڈن ہو جاتی ہیں غوری صاحب کی۔

”آذر! مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا، مردوں کو مرد ہی اینڈ کر سیں تو بہتر ہے بھلا عورتوں کا کاروباری معاملات میں کیا کام؟“

”وقت بدل گیا ہے بے وقوف عورت اب مردوں عورتوں کو مل کر زندگی کی گاڑی کھینچنا پڑتی ہے برتم جیسی جاہل عورتیں ان باتوں کو بھی نہیں سمجھ سکتیں۔“ کچھ وقت گزرا تو شارب دنیا میں آ گئی، تنہا ہونے کی وجہ سے وہ وقت صبیحہ کے لئے بہت کڑا تھا، شاہ بانو چچی رافعہ بچو کے سرال ان کی متوجہ ڈیوڑی کے سلسلے میں رہ رہی تھیں ایسے میں فائزہ نے ان کا بہت ساتھ نبھایا وہ صبیحہ سے دو سال بڑی تھیں تب سے صبیحہ کے دل میں ان لئے منونیت بہت زیادہ تھی اور پھر انہوں نے بھی منہ سے ہٹ کر دوست کی طرح نبھایا تھا زندگی کی اونچ نیچ میں اکثر انہیں سمجھاتی رہتی تھیں شارب منہ میں چاندی کا چچہ لے کر پیدا ہوئی تھی اس کی پیدائش کے فوراً بعد آذر کو سستے داموں ایک مکان کا مالک مل گیا ان کے پاس سرمایہ چونکہ کم تھا اس لئے انہوں نے ان سے زیور مانگ لیا، ازل سے لے کر آج تک زیور عورت کی کمزوری رہا ہے اور اپنی یہ کمزوری مرد کے ہاتھ دھتے ہوئے عورت ہمیشہ اندر سے کٹ مرتی ہے یہاں معاملہ اس سے کچھ زیادہ تھا، صبیحہ کا تمام زیور اس کی مرحومہ اماں کا تھا اماں کی نشانی دینا ان کے لئے دہرا گم تھا، پھر بھی سینے پر صبر کی سل رکھ کر انہوں نے اپنا آدھا زیور آذر کے حوالے کر دیا۔

”آسا نکات تو تمام کی تمام تمہیں پوری چاہئیں پر گھر کا روبرو کے لئے قربانی دیتے تمہیں موت پڑتی ہے کل کو اس کا سب سے زیادہ فائدہ تم ہی اٹھاؤ گی۔“ لاکھ باتیں سننے کے باوجود صبیحہ نے اپنا آدھا زیور نہیں دیا اور وہ بھی ایسے ڈھیٹ کے جو ہاتھ

لگالے کے چلتے بنے آنے والے چند سالوں میں انہوں نے اسی پلاٹ پر ایک چھوٹا سا شادی حال تعمیر کر لیا ساتھ ہی اس کے آفس میں پراپرٹی کا کام بھی کرنے لگے گاڑیوں کا کام بھی پارٹ ٹائم کے طور پر چل رہا تھا، اکثر پرانی گاڑیوں میں بٹھا کر صبیحہ کو ڈرائیونگ بھی سکھا دیا کرتے تھے گاڑی چلانا عورتوں کا ایک بڑا ارمان اور خواب ہوتا ہے، اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھنے شان فاخرہ سے ادھر ادھر نگاہ ہماتے وہ خود کو کسی اور ہی دنیا کی مخلوق سمجھ رہی ہوتی ہیں مگر بے وقوف عورت یہ نہیں سمجھتی کہ گاڑی عورت کے حوالے کر کے جہاں مرد اگلے انشان میں کرتا ہے وہاں بہت سی ذمہ داریوں سے ہاتھ دھوا کر موت کی جان باہر کے گھنٹوں میں پھنسا دیتا ہے صبیحہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا بازار جانا ہو ڈرائیونگ کے ٹھکانا ہو بل بھرانا ہو یا اسکول کی فیسیں سب کے لئے صبیحہ کو ہی پائل بننا پڑا تھا، بہر حال کام اچھا چل گیا تھا سو صبیحہ نے آڈرنے ایک گھر بھی بنالیا وہ گھر صبیحہ کی راجدھانی تھا شاید لوگوں کو ایسا ہی لگتا ہو پر اندر کا حول کون جانتا ہے گھر بنالیا تھا تو آڈر کا دماغ ساتویں آسمان پر تھا ادھر ابا کے انتقال کے بعد بیچانے آبائی مکان بیچنے کا فیصلہ کیا تھا ان کے بیٹے اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر جانا چاہ رہے تھے انہوں نے مکان بیچ کر صبیحہ کا حصہ بڑی ایمانداری کے ساتھ اس کے حوالے کیا اور خود بچوں کو بیچ کر ایک کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے عفیہ بھی اپنے سرال کی ہو چکی تھی سودو مہیاں بیوی کا دم غنیمت تھا، ادھر آڈرنے عجیب سلسلہ شروع کر رکھا تھا آئے دن گھر میں دوستوں کی محفلیں جمتی تھیں بلند بانگ قہقہے بے ہودہ مذاق رات گئے تک انڈین فلموں کے سلسلے صبیحہ کا دل گھبرا جاتا تھا، پر جب بھی وہ انہیں ٹوٹی توجو بالعن طعن سے بھر پور پکچر تیار ہوتا تھا کھانے پکایا کر اور رات گئے تک چائے بنا کر وہ بیزار ہو جاتی تھی یہ سب بھی انہیں گوارہ تھا اصل مسئلہ

اس وقت سے پیدا ہوا جب دوستوں کے ساتھ شراب بھی گھر میں آنے لگی اور جب دوست اور شراب نہیں آتی تھی تو وہ خود رات گئے لڑکھڑاتے ہوئے گھر آتے تھے ان کی ذات سے آڈر کی لاپرواہی بڑھتی جا رہی تھی یہ سب اب ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا سولہ سولہ جوان بیٹی کی نظروں سے اب بہت کچھ انہیں چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔

”آڈر یہ آئے دن کی پارٹیوں اور پینے پلانے کا سلسلہ اب ختم کریں بچی بڑی بوری ہے اس کے مستقبل پر ان چیزوں کے برے اثرات مرتب ہوں گے۔“

”تمام عمر جاہل کی جاہل ہی رہو گی معاشرے میں تعلقات بنانے اور فوائد اٹھانے کے لئے یہ سب ضروری ہے سب مائیں اپنی بچیوں کو اس سلسلے میں گائیڈ کرتی ہیں تم پتہ نہیں کیسی ماں ہو، انہی دنوں انہوں نے شارب کے سامنے اپنا ایک نیا جابلانہ روپ عیاں کر دیا تھا شارب کو کوئی نی یو نیفارم دلائے وہ قریبی مارکیٹ تک آئی تھیں بھی آڈر کا بیچ ہو چکا ہوا۔“

”اب تو میں کچھ خاص دوست آ رہے ہیں پر تکلف کھانا سیرا ہو گا وہ شارب کا روم سیٹ کروا دو رات وہ ہماری طرف من رہیں گے۔“ شام ہونے میں کچھ ہی دیر تو رہ گئی وہ جلدی جلدی گھر پہنچیں اور جاتے ہی کھانے کی تیاری میں جت گئیں ان کی پوری کوشش ہوتی تھی شارب کا آڈر کے کسی دوست سے سامنا نہ ہو رات آڈر آئے تو آفس کے چوکیدار کو بھی ساتھ لے آئے جس کے ہاتھ وہ کھانا اور چائے اندر بھجواتی رہیں رات گئے وہ تھک کر چور اپنے بیڈ پر شارب کے ساتھ آ کر لیٹ گئیں ابھی آٹکھ کی ہی تھی کہ ان کے چہرے سے چادر کھسک گئی، آنکھیں کھول کر دیکھا تو آڈر کو خود پرچھکا پایا۔

”کیا ہوا خیریت؟“ انہوں نے دہلی آواز سے پوچھا تا کہ شارب جاگ نہ جائے۔

”ہاں کچھ بات تھی شادی ہال کے پیچھے والا پلاٹ مناسب داموں مل رہا ہے اگر جو تم ابا میاں کے مکان کا پیسہ دے دو تو بات بن سکتی ہے ہال بڑا کر کے ٹینکویٹ بنالیں گے آمدنی میں تین سے چار گنا اضافہ ہو گا کیا کہتی ہو؟“

”وہ تو ٹھیک ہے آڈر پر۔“

”پر کیا؟“ معاملہ ان کے مطلب کا تھا اس لئے وہ زلزل بھی فوراً ہی چاہتے تھے اور وہ بھی اپنے مطلب کا، وہ برا سامنہ بنا کر خاموش ہو گئیں انہوں نے صبیحہ کا برا سامنہ دیکھ کر ان کے بال بھی میں جکڑ لئے۔

”میرا سب کچھ چاہتا ہے اختیار میں ہے اور خود اپنا زور پیسہ بھی دبا کر بیٹھیں ہو تو میں بھی اپنے ساتھ لے جانا۔“ بے دردی سے بال کھینچ کر وہ باہر چلے گئے شارب شاید پہلے ہی جاگ چکی تھی لیکن وہ ان کے کراہنے پر جاگتی تھی۔

”مت کھپا کریں ان کے لئے اتنا انہیں صرف آپ کے پیسے سے مطلب ہے اور کسی چیز سے نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ کروٹ بدل گئی وہ جانتی تھیں وہ سو نہیں رو رہی ہے اگلے دن انہوں نے تمام کام جلدی جلدی نمٹائے اور شاہ بانو بچی کی طرف آ گئیں۔

”بات تو بہت تشویش کی ہے صبیحہ! جیسا تم اس کا رنگ ڈھنگ بتا رہی ہو اس میں تو پیسہ اس کے ہاتھ دینا سیدھا سپدھا اپنے پیروں پر کھپاڑی مارنا ہی ہوگا، تم ماں بیٹی کے اور گھریلو اخراجات پورے کرتا ہے یا نہیں۔“

”کیا بتاؤں بچی جان کبھی بہت مہربان ہو جاتے ہیں اور کبھی اتنا دبا لیتے ہیں کہ پیسے کو محتاج کر دیتے ہیں ایسے میں انتہائی ضرورتوں کے لئے مجھے اپنے اکاؤنٹ سے ہی نکلوانے پڑتے ہیں۔“

”ایسے تو تم اپنا سارا پیسہ لٹا بیٹھو گی صبیحہ! جوان بیٹی منہ کو آ رہی ہے اچھا یہ بتاؤ تمہارے ساتھ ذاتی

طور پر کیسا ہے؟“

”عجیب پتھر پلا سا نصیب ہے میرا بیٹی جان جتنا خوش کرنے کی کوشش کرتی ہوں اتنا ہی وہ مطمئن نہیں ہوتے آئے دن لعن طعن گھر میں چیخا چلانا شارب بہت ڈسٹرب رہتی ہے ان باتوں سے ایک ضرورت کا رشتہ بھی واجب ہے کبھی خیال آ جائے تو قریب آ جاتے ہیں شکایت کروں تو کہتے ہیں جاؤ چھوڑ کر چلی جاؤ بہت مل جائیں گی مجھے۔“

”آئے ہائے کہیں دوسرا نکاح تو نہیں پڑھوایا؟“

”نکاح تو نہیں پڑھوایا پر آئے دن عشق و عاشقی ضرور فرمائی جاتی ہے کئی بار لو لیٹر اور موبائل میں تصویریں دیکھ چکی ہوں۔“

”اللہ بھی اپنی بنائی ہوئی اس مرد نامی مخلوق کی جبلت سے اچھی طرح واقف تھے جیسی تو چار چار نکاح جائز کر دیئے بہر حال بیٹا کیا کہہ سکتے ہیں سوائے اس کے صبر اور اچھی امید پر قائم رہو۔“ اور وہ دو دنوں دو دنوں چیزوں پر شروع سے ہی قائم تھیں پر اس رات کے آڈر اپنے دو دوستوں کے ساتھ گھر میں آئے اور آتے ہی انہیں سوتے سے اٹھا کر شارب کے کمرے میں لے جاتا وہ حیران پریشان اپنا دوپٹہ سنبھالتی شارب کے کمرے کی طرف چل دیں پر ڈرائنگ روم کے قریب سے گزرتے پر اندر سے آنے والی آوازوں سے پتہ چلا کہ دو لوگوں میں سے ایک عورت ہے کمرے میں آ کر انہیں اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو گیا ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی دماغ کی کوئی نس پھٹ جائے گی ان کی بے چینی محسوس کر کے شارب بھی جاگ گئی پر اس کے لاکھ پوچھنے پر بھی انہوں نے اسے کچھ نہیں بتایا صبح ہونے تک وہ شارب کے مستقبل کے لئے ایک قوی فیصلہ کر چکی تھیں نماز پڑھ کر وہ کمرے سے باہر آئیں تو دیکھا آڈر ڈرائنگ روم میں سو رہے تھے۔

”اوہ تو اپنی شفقت لگا کر اب یہاں آرام فرمایا جا رہا ہے۔“ انہوں نے آذر سے بات چیت بالکل بند کر دی اور اسی دن اخبار میں دیکھ کر ایک ذرہ نسبتاً سستے علاقے میں کم کرائے پر مکان حاصل کرنے کے لئے کافی جگہوں پر فون کر ڈالے چند دن بعد ہی انہیں کرائے پر ایک مکان مل گیا اور ایک اچھے اسٹینڈرڈ کے انگلش میڈیم اسکول میں جاب بھی مل گئی ان سب باتوں کا پتہ آذر کو اس دن چلا جب وہ اور شارب اپنا ضروری سامان باندھ کر گھر چھوڑنے کے لئے تیار تھیں۔

”یہ سب کیا ہے کہاں جا رہی ہو تم دونوں؟“ آذر حیرت کے ساتھ ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔ ”ہم جا رہے ہیں اب کچھ چھوڑ کر آذر! میں نے بہت برداشت کیا، آپ کی ٹھن ٹھن دھڑکار یہاں تک کے نشے کی حالت میں آپ کے لئے ہو گئیں بھی، پر اب عورتوں کا آنا جانا میری برداشت سے باہر ہے، بیٹیاں جوان ہوتی ہیں تو برے سے برے انسان بھی سنبھل جاتے ہیں پر آپ تو۔“

”میرا اس عورت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی میں اسے بے کر آیا تھا وہ میرے اس دوست کے ساتھ آئی تھی میں گھر آیا تو وہ دونوں باہر کھڑے ہوئے تھے میری غلطی یہ ہے کہ میں اسے منع نہیں کر سکا اگر میرا یقین ہے تو رک جاؤ اور اگر نہ آئے تو میں نہیں روکوں گا پر ایک بات یاد رکھنا صبیحہ عورت کا تنہا معاشرے میں رہنا کوئی کھیل نہیں ہے اسے مرد کے سہارے کی ضرورت ہر حال میں رہتی ہے۔“ وہ چند لمحے انہیں دیکھتی رہیں پھر چپ چاپ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆☆

مرد کے بغیر معاشرے میں رہنا صبیحہ کے لئے آسان نہیں تھا پر آذر کے لئے بھی عورت کے بغیر گھر میں رہنا آسان نہیں تھا، خاموش تنہا گھر انہیں کاٹنے کو

دوڑتا تھا، رات جب وہ گھر آتے تو ہر طرف سے ابھرتی سرسراہٹیں انہیں بے چین کرتیں، محلے کے گھروں سے آنے والی طرح طرح کے کھانوں کی خوشبوئیں انہیں اپنے مہکتے پکن کی یاد دلاتیں ان کی راتیں بے سکون اور دن برباد ہو گئے تھے گھر ویران ہوا تھا تو دوستوں نے بھی ادھر کا رخ کرنا چھوڑ دیا تھا اور کچھ انہوں نے بلانا بھی چھوڑ دیا تھا کہ کھانا تو وہ بازار سے لے آتے پر اس کے بعد چائے بنانے اور برتن دھونے کا کام انہیں خود ہی کرنا ہوتا تھا، پچھلے ایک سال سے سخت تنگی اٹھانے کے باوجود ان کی مارا لپی بڑی تھی کہ بس چاہتے تھے صبیحہ اور شارب خود ہی تنگ ہو کر واپس آ جائیں خور و مراد تنہا ہو تو جلد بری نظروں کی زد میں آ جاتا ہے آذر کے ساتھ بھی آج کل کچھ ایسا ہی معاملہ تھا، رجا کے التفات کچھ زیادہ ہی بڑھتے جا رہے تھے ان سب باتوں سے گھبرا کر انہوں نے فائزہ کے گھر کا رخ کیا۔

”ہائے بھائی جان! آپ کب آئے؟“ انہوں نے دیکھی میں کرم ہوتے تھے گھی میں ڈھیر ساری پیاز جھونک دی۔ ”جب کے تم ان ہسٹنڈوں سے نبرد آزما ہو۔“ انہوں نے چھری اس کے ہاتھ سے لے کر کھیرا چھیلنا شروع کر دیا۔

”کیا کروں احمد کو اتنی پسند ہیں کہ ہفتے میں ایک بار تو پکانا ہی پڑتی ہیں اور آپ سنا میں کیسے ہیں، بیوی بیٹی کیسی ہے؟“ پھر خود ہی اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر بویں۔ ”مت ماری گئی ہے ہر بار بھول جاتی ہوں کہ بیوی بچی کے بغیر تنہا جی رہے ہیں۔“ آذر نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہاں اب میں اس تنہائی سے تنگ آ گیا ہوں۔“

”پچاس دفعہ سن چلی ہوں۔“

”پر اب میں واقعی تنہائی سے بیزار ہو گیا ہوں“ صبیحہ نہیں آئی تو میں دوسری شادی کر لوں گا۔“

”ہائے بھائی جان! اس عمر میں کون کرے گی آپ سے۔“ نیاز براؤن کرتے ان کے ہاتھ ہم گئے۔ ”ایک ہے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنستے۔ ”چار چار کر لیں گی، کہو تو دو گھنٹے کے اندر اندر کر کے دکھا دوں۔“ ان کے پر یقین انداز پر وہ کچھ کھٹک سی گئی۔

”فائدہ شریف عورت تو کوئی ایسے کرے گی نہیں اور اگر کسی ایسی ویسی سے کی تو سوائے بربادی کھیلانے کے اور کچھ نہیں کرے گی۔“

”شریف اور بہت اچھے خاندان کی ہے۔“ ”اوہ تو اس کا مطلب ہے آپ نے کوئی دیکھ لی ہے، بھائی جان کچھ خد کا خوف کریں کیوں حق داروں کا حق مارتے ہیں جلد سے جلد جیں اور صبیحہ کو واپس لے آئیں وہ گھر کے ہاتھ سے بنا ہوا ہے وہی سنبھال سکتی ہے۔“

”ہرگز نہیں میں کیوں جاؤں وہ اپنی مرضی سے اپنی مرضی سے خود ہی واپس آ جائے میں نے کوئی اسے ہاتھ سے پکڑ کر نکالا نہیں تھا۔“

”کوئی عورت اپنی مرضی سے بسا بسا گھر نہیں چھوڑتی بھائی جان آپ اپنی غلطی مانیں اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو میں بھی شاید یہی کرتی۔“

”جی غلطی پر اعتراض کر کے وہ نکلی تھی وہ میری غلطی تھی ہی نہیں پھر بھی اسے میرے پینے پلانے پر اعتراض تھا سو میں نے چھوڑ دیا وہ پیسہ نہیں دینا جاہتی نہ دے اور میں کیا کروں، بہر حال تم اس سے بات کر کے دیکھ لو اگر آنا چاہے تو آ جائے ورنہ اب میں اور انتظار نہیں کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلے آئے اور فائزہ ایک ٹاگھر جوڑنے کی فکر میں غرق ہو گئی۔

☆☆☆☆

”آخر مجھے ہی کمزور بنا کر جھکانے کی کوششیں کیوں کی جا رہی ہیں اب جب میں اپنے پیروں کھڑی ہو گئی ہوں تو کیوں آپ لوگ چاہتے ہیں کہ

گھر کی چار دیواری میں بند ہو کر رہ جاؤں۔“ ”کوئی تمہیں کمزور نہیں بنا رہا صبیحہ! تمہاری مضبوطی سب نے دیکھ لی پر اب بچی کے مستقبل کا سوچو اور اس کے ہی نہیں اپنا مستقبل بھی سوچو ہر اور باپ سے الگ ہو کر رہنے والی عورتوں کے گھر لوگ رشتے لے کر نہیں آتے اور اگر بالفرض آ بھی جائیں اور تم اسے تنہا رخصت کر بھی دو تو پھر خود کیسے تنہا رہو گی مرد اور عورت گاڑی کے دو پیسے ایسے ہی نہیں کہلاتے یہ اللہ تعالیٰ کا بنا بنایا ہوا نظام ہے صبیحہ اور اب تو وہ ویسے بھی اپنی بری عادتوں سے کنارہ کش ہو چکے ہیں پکیز میری بات مان جاؤ گھر واپس چلی جاؤ۔“ فائزہ نے بڑے پیار سے صبیحہ کی ٹھوڑی چھو کر کہا تو وہ لاکھ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے انکار نہیں کر سکیں، پر واپس جانے کی حامی انہوں نے اس بات پر بھری تھی کہ آذر کو ان کی کچھ شرائط ماننی ہوں گی جس کے لئے واپس جانے سے پہلے وہ ایک بار آذر سے ملنا چاہتی تھیں پر ان کی قسمت میں ابھی کچھ قسم باقی تھے، فائزہ آذر کو بتا چکی تھیں کہ کل صبیحہ ان سے ملنے آئے گی اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ جب وہ خود آ جائے گی تو وہ اپنی مرضی سے منائیں گے اسی لئے وہ رات سے صبیحہ کی تنہائی تھرائی میں لگے ہوئے تھے اور اگلی صبح نہادھڑک کر اسے بتا رہے تھے ڈور بیل بجی تو بھاگے بھاگے دروازہ کھولنے پہنچے پر صبیحہ کی بجائے رجا کو ہاتھوں میں حلوہ پوری کے شاپر لے کھڑا دیکھ کر ان کے اوسان خطا ہو گئے پچھلے چند ماہ میں وہ ان سے کافی فری ہو گئی تھی اس لئے ان کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر بغیر مسکرائی ہوئی پورا دروازہ کھول کر اندر آ گئی وہ اس کے پیچھے لپکے۔

”ارے اب اندر کہاں جا رہی ہیں میں تو بس آفس کے لئے نکلنے لگا ہوں۔“ وہ چاہتے تھے کہ وہ جلد از جلد گھر سے چلی جائے پر اسے ان کے دل کی حالت کا کیا پتہ تھا۔

ی بوندنگ

ایک رات کے ایک لمحے کی بات
 سب سے پہلے
 زیادہ خوبصورت اور حسین!

دلچسپ
 دلچسپ
 دلچسپ

Filmstar
 Sana

Urdu Novels, Books and Magazines

پیش کشی: روز بیونی پائلر ڈسٹری بیوٹر ہے کورین ٹیکنالوجی کا شاہکار

ایجن گولڈ فیشل

ایجن گولڈ فیشل جلد میں ایک ایک رنگ متدہ کی اور ایک ایک رنگ کی دیکھیں
 اس کے ساتھ ہی ایک کے ذریعہ آپ کو مزید گاہک کرے
 سونے کی تیرہ ٹی کے ہاٹ پر اس کے دلے اور ان کے کام کرے
 کوہاٹ پر اس کے ہاٹ پر اس کے دلے اور ان کے کام کرے



گلشن اقبال 570-A
 34809011-34173921 34977970-34977972

35833929-35833930 36636824-36636825 36707479-36623234

www.roseparfour.com | facebook.com/Rosebeautyparlor

روز بیونی پائلر



منہ دیکھا جو اس کی بات سن کر اتر چکا تھا۔
 ”ہر بار ہر بار صرف عورت ہی کیوں نصیحتوں
 کے ٹارگٹ پر رہی جاتی ہے صرف عورت کو ہی جھکنے
 پر کیوں مجبور کیا جاتا ہے آذری جگہ اس وقت میں ہوتی
 میرے منہ میں کوئی غیر مردانہ ڈال رہا ہوتا تو تب کیا
 آپ لوگ انہیں اس بات پر فورس کرتیں کہ مجھے
 اپنائیں میری شرمندگی کا اسے یقین دلویا جاتا میرے
 وعدے پر وہ خوشی خوشی گھر بسانے کو تیار ہو جاتے نہیں
 ایسا نہیں ہوتا کیونکہ عورت کی بے وفائی بے وفائی ہوتی
 ہے مرد جو دل چاہے وہ کرتا پھرے۔“ وہ اپنی جگہ ت
 اٹھ کر کھڑکی کے پاس آ گئی۔
 ”صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے معاف
 کر دینا چاہیے صبیحہ!“ شاہ بانو چچی کی بات پر چہرے
 پر دکھ لئے وہ چلی تو دروازے میں آ کر کھڑے ہوئے
 تھے شاہ بانو چچی اور فائزہ کمرے سے باہر نکل گئیں وہ
 آہستہ آہستہ چلتے ان کے قریب آ گئے۔
 ”نہی انا کی دیوار توڑ کر میں آ گیا ہوں صبیحہ!
 اب اپنے گھر چلو کسی اور کا خیال دل میں ہوتا تو بھی
 نہ آتا۔“ صبیحہ نے اس کی صورت دیکھتی رہیں پھر
 ان کی سائید کے نکلے شارب کے کمرے میں چلی
 آئیں وہ بیک میں اپنے لئے کپڑے رکھ رہی تھی
 انہیں دیکھ کر ایک دم ہاتھ روک گئے۔
 ”وہ میں نے سوچا اگر آپ مان گئیں تو۔“ آنسو
 ان کی پلکوں کی باڑھ توڑ کر بہہ نکلے ماں کے آنسو کچھ
 کر شارب نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا، بھی صبیحہ کو
 اپنے کاندھے پر آ کر ڈر کے مضبوط ہاتھ کا دباؤ محسوس
 ہوا وہ انہیں اپنے بازو کے حصار میں لے چکے تھے۔
 ”سامان پیک کرو بیٹا ہم ابھی اپنے گھر واپس
 جائیں گے۔“ شارب نے صبیحہ کی طرف آس بھری
 نظروں سے دیکھا تو صبیحہ نے اثبات میں سر ہلا کر
 اپنا سر آ کر کے سینے سے لگا دیا۔

☆.....☆.....☆

”چلے جائیے گا آفس بھی پہلے ناشتہ تو کر لیں“
 یہاں کون ہے جو آپ کو اپنے ہاتھ سے حلوہ پوری بنا
 بنا کر کھائے۔“ وہ سیدھی پکن میں گئی اور برتنوں میں
 چنے بھاجی نکال کر لے آئی۔
 ”دیکھئے میں ناشتہ کر چکا ہوں۔“ پر وہ ان سنی
 کر کے ناشتہ بنانے لگی۔
 ”اب تو میں لے آئی ہوں اور یہ تو آپ کو کھانا
 ہی ہوگا۔“ آذرنا کر کرتے ہی رہ گئے اور اس نے بڑا
 سا نوالہ ان کے منہ میں ٹھوس دیا شامت اعمال
 اسی وقت صبیحہ اندر داخل ہوئیں اور سامنے کا منظر
 دیکھ کر شارب نے آذر کی وہ حالت سنی کہ نہ
 نوالہ نگتے بنے نہ لٹکتے لٹکتے میں صبیحہ کی حیرت
 غصے میں بدل گئی۔
 ”لگے رہیں لگے رہیں میں تو پتھر کر رہی ہوں کہ
 اس وقت آپ کی بیٹی میرے ساتھ نہیں ہوتی یہ
 ردمانوی سین ساری عمر بھلا نہ پاتی جس کا ہیرو وہ اس
 کا باپ ہے۔“ یہ کہہ کر صبیحہ جیسے آئی تھیں ویسے ہی
 چلی گئیں آذر منہ میں نوالہ پھنسائے ہوئے ہی ان
 کے پیچھے بھاگے پر وہ ان کی پھنسی پھنسی آواز سننے
 کے باوجود رکے بغیر گاڑی میں بیٹھ کر چلی گئیں رجا
 اس سارے سین پر حیران تھی جبکہ آذر شکست خوردہ
 سے وہیں گیٹ میں بیٹھ کر نوالہ چباتے رہ گئے جس کا
 ذائقہ انہیں اب نیم جیسا لگ رہا تھا۔

☆☆☆☆

غصے میں بھری بیٹی صبیحہ کی صورت دیکھ کر فائزہ
 اور شاہ بانو چچی دونوں تو ہی کچھ کہنے کی ہمت نہیں
 ہو رہی تھی بالآخر شاہ بانو چچی ہی بولیں۔
 ”غصہ تھوک و صبیحہ جو کچھ بھی ہو آذر اس کے لئے
 شرمندہ ہے۔“ ان کے بعد فائزہ نے بھی ہمت کی۔
 ”انہوں نے وعدہ کیا ہے آئندہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“
 ”اور اگر ہوا تو پھر کیا کروں پھر کیا کسی اور رکے
 دھکے کھاؤں جو ان بیٹی کے ساتھ۔“ اس نے دونوں کا

خمر و شہسب



میں شہر یار سب کے آنکھوں کا تارا ہاں، سب کا بابا کا ماما کا دادا کا دادی کا چچا، چچی کا سب کا، میں سب کو بہت پیارا ہوں اور اس کا اندازہ مجھے ہے سب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں مجھے بہت چاہتے ہیں تو ہوا ناں میں خوش نصیب نہیں آپ نے اب تک میری کہانی کب سنی ہے کہ جسے شہسب کا ناٹل دے دیا ارے سنو مجھ سے رشتہ پیار کرتے ہیں پر میں کیا سب سے پیار کرتا ہوں اس کا جواب آپ دیں گے مجھے میری کہانی سننے کے بعد۔ تو میری کہانی یوں ہے کہ میں سب کی آنکھوں کا تارا سب کا پیارا میری ایک بہن ہے کنزہ اور میرے چچا کے دوست ہیں، سحان اور فاطمہ کنزہ مجھ سے دو سال چھوٹی ہے اور سحان کنزہ سے دو ماہ بڑا ہے اور فاطمہ سحان سے ایک سال چھوٹی ہے میرے دادا دادی کے دو بیٹے ہیں میرے بابا اور میرے چچا ہم سب مل کر رہتے ہیں گھر میں سب بچوں سے بڑا میں ہوا تو سب بچوں پر میری حکومت ہوتی سب بچے مجھ سے دب کر رہتے۔ کنزہ اور سحان ایک کلاس میں تھے اور دونوں ساتھ ساتھ رہتے تھے کھلتے بھی ساتھ کھاتے بھی ساتھ جبکہ فاطمہ اکثر اکیلی ہوتی وہ خاموش طبیعت کی مالک تھی کوئی دوست بھی نہیں تھا اس کا اس لئے میں نے اس کی طرف توجہ دی اس کے ہوم ورک میں مدد کرتا اس کے ساتھ کھیلتا اس کا بہت خیال رکھتا اس طرح کھیلتے کودتے ہم جوانی کی منزل پر پہنچ گئے سحان اور کنزہ دونوں میڈیکل میں چلے گئے میں انجینئرنگ کے شعبے میں جبکہ فاطمہ آرٹس پڑھنے لگی

پڑھائی کے سلسلے میں ہمارے ماں باپ نے ہمیں آزادی دے رکھی تھی کہ ہم جس سبکیٹ میں اچھے ہوں اس کا انتخاب کریں۔ میں ایم فل کر رہا تھا سحان اور کنزہ میڈیکل کے آخری سال میں تھے جبکہ فاطمہ گریجویٹیشن کے بعد تعلیم چھوڑ چکی تھی وہ زیادہ وقت گھر کو دے رہی تھی دادا دادی بابا چچا سب کا خیال رکھتی تھی وہ سب کی لاڈلی تھی وہ بھی بہت پیاری سب کا خیال رکھنے والی۔ میں بھی زیادہ تر اپنی پڑھائی میں بڑی رہتا اور فاطمہ بھی اب مجھ سے ریزرور بننے لگی تھی زیادہ باتیں نہیں کرتی تھی وہ بس کام کی ہی باتیں کرتی تھی میرا بھی خیال اس طرف نہ گیا کیونکہ میری پڑھائی بہت ٹھٹ تھی اور میرے پاس ٹائم بالکل بھی نہیں ہوا تھا میں نے ایم فل پڑھے مارکس لے کر کیا پھر کچھ عرصہ صحت مند بننے لگا اور مجھے اچھی سی جاب بہت جلد مل گئی سب سے بڑوں کو میری شادی کی فکر ہونے لگی اور اس میں سب بڑوں کے باہمی مشورے اور سب کی رضامندی سے میری منگنی فاطمہ سے اور سحان کی کنزہ سے کر دی گئی میری اور سحان دونوں کی شادیاں ایک ساتھ ایک سال بعد رکھی گئیں میں بہت خوش تھا مگر میں اتنی جلدی شادی کے لئے تیار نہ تھا لیکن بات گھر کی تھی اس لئے چپ رہا میں فاطمہ کو پسند بھی کرتا تھا اس لئے خوش بھی تھا میں جلدی شادی کے موڈ میں اس لئے نہیں تھا کہ میرے کچھ خواب تھے جنہیں میں پورا کرنا چاہتا تھا وہ خواب کوئی انوکھے تھے میرے سر پر اک جتوں سوار تھا اپنے خوابوں کا میں ایک بڑا گھر چاہتا تھا اپنی

گاڑی ہو خوب سارا پینک بلیس ہو خیر جو بھی تھا میں نے اپنے خواب پورا کرنے کا وعدہ کیا تھا خود سے کہ اپنے خواب پورا کروں گا تب ہی آگے بڑھنے کا سوچوں گا میں نے کچھ سیونگ بھی جمع کرنا شروع کی تھی اور اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کیشیاں بھی ڈال رکھی تھیں مجھے پتہ تھا جو خواب میں نے دیکھ رکھے ہیں وہ یہاں اس ملک میں تو پورے ہونے سے رہے اس کے لئے میں امریکا یا سعودیہ جانے کے لئے تگ دو دو کر رہا تھا۔ میں فاطمہ سے بھی جاننا چاہتا تھا کہ وہ اس رشتے سے خوش ہے کہ نہیں لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہ اس رشتے سے بہت خوش ہوگی رات کو کھانے کے بعد میں پکن میں تھیں کافنی کی طلب ہو رہی تھی چہاں فاطمہ پہلے سے موجود تھی اور برتن دھو رہی تھی۔ فاطمہ نے مجھ سے پوچھا۔

”آپ کو کچھ چاہئے۔“

”ہاں مجھے ایک کپ کافی بنا کر دو ایسا کرو مجھے“

کمرے میں لے کر آؤ مجھے تم سے کچھ بات بھی کرنی ہے۔ وہ جی کہہ کر کافی بنانے لگی اور میں کمرے میں آ گیا دس منٹ بعد وہ کافی کے ساتھ حاضر ہوئی میں پیڈ پر بیٹھا ہوا تھا اس کو سامنے صوفے پر بیٹھے کا اشارہ کیا وہ کچھ نروس سی تھی صوفے کے کنارے پرے چین سی لگ گئی۔

”آپ کو کیا کہنا تھا مجھے ابھی برتن بھی دھونے ہیں۔“

”ہاں وہ میں۔“ میں تھوڑا ہلکایا۔

”وہ میں کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس رشتے سے خوش تو ہونا؟“ آخر میں نے کہہ ہی دیا۔

وہ پہلے تو مجھے دیکھتی رہی پھر یوں۔

”میں خوش کیوں نہیں ہوں گی۔“

”نہیں تمہارے بھی تو کچھ خواب ہوں گے نا۔“

”میرے سارے خواب آپ سے شروع ہوتے ہیں اور آپ پر ہی ختم ہوتے ہیں کیا آپ کو پتہ نہیں ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر ہوئے سے کہہ رہی تھی اور سیدھے میرے دل میں اتر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس طرح روز و شب گزرنے لگے اور میں بہت محنت کرنے لگا میں نے ایک اور کمپنی میں انٹرویو دیا تھا جس کی میری میری اس جاب سے زیادہ تھی پھر مجھے اپنا منہ لٹا کر لیا میں بہت خوش تھا فاطمہ کو بتایا وہ بھی بہت خوش ہوئی میں اس کو لے کر آئسکریم پارک لے گیا اور اس کو اس کی پیوریٹ آئسکریم کھلائی وہ زندگی کی میری بہت حسین سالہانہ لڑکی تھی مگر میری زندگی میں بھی آئی ہی نہیں یا میں نے اپنی خوشیوں کے تمام دروازے اپنے آپ ہی بند کئے اور ایسے بند کئے ہیں روشنی کی ہلکی سی لکیر کے لئے بھی رستہ نہیں چھوڑا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

میں جس کمپنی میں جاب کرتا تھا اس کا باس مجھ سے بہت خوش تھا میں کام بہت دل سے کرتا تھا اور اس طرح میں اپنے باس کے نزدیک ہوتا گیا ایک دن میرے باس نے مجھے اپنے گھر بلایا۔ میں کچھ پریشان بھی تھا کیونکہ پہلے باس نے بھی مجھے اس طرح گھر نہیں بلایا تھا لیکن حیرت میں شام 6 بجے ان کے عالی شان بنگلے میں کھڑا تھا۔ میرے باس نے خوش

دل سے میرا ویلکم کیا اور ڈرائنگ روم میں بٹھایا کچھ پر کے بعد ملازم چائے اور اس کے ساتھ انواع و اقسام کی چیزیں لایا اور ملازم کے واپس جاتے ہی میرے باس نے اس سے کہا۔

”کاشان اعلیٰزے بیٹے کو بھی بلاؤ۔“

”جی صاحب۔“ ملازم کے جانے کے بعد میرا باس مجھ سے مخاطب ہوا۔

”بیٹا! میں تمہیں اپنی بیٹی علیزے سے ملوانا چاہتا ہوں وہ میری اکلونی اولاد ہے اور مجھے بہت پیاری ہے تھوڑے نگرے والی ہے پر دل کی بہت اچھی ہے۔“ میں کچھ نہیں سمجھ رہا تھا کہ اس نے مجھے اپنی بیٹی سے کیوں ملوانا چاہتے ہیں۔ اسی لمحے میں میرے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی پینٹ شرٹ میں ملیو شالہ رکٹ بال تیز لپ اسٹک ہائی ہیملز میں وہ کوئی ماڈل لگ رہی تھی جیسا کہ سے اندر داخل ہوئی اور اپنے ڈیڈی کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”مجھے تھوڑا عجیب لگا نہ سلام نہ دعا خیر مجھے کیا۔“

”علیزے بیٹا! یہ شہر یار ہیں جس کے بارے میں میں نے تمہیں بتایا تھا اور شہر یار بننے یہ ہے میری پیاری سی بیٹی علیزے۔“ میں نے علیزے کو ہائے کہا جواب میں اس نے بھی ہائے کہا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی پھر اٹھ گئی۔

”اچھا ڈیڈی مجھے اپنے دوستوں کے ساتھ جانا ہے تھوڑی دیر سے آؤں گی۔“

”او کے بیٹا! خیال رکھنا۔“ علیزے جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی پھر میرا باس مجھ سے مخاطب ہوا۔

”بیٹا تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے وہ بیٹا اصل بات یہ ہے کہ میں علیزے کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو کریں ناں میں کیا آپ کو رشتے کرانے والی خالہ لگ رہا ہوں۔“ میں اب تک کافی تپ گیا تھا اور یہ بات محض سوچ کر رہ گیا۔

”خیر بیٹا! میں بہت دنوں سے قابل بھروسے لڑکے کی تلاش میں ہوں رشتے تو بہت ہیں مگر کوئی

میرے باس تک علیزے کے قابل نہیں ملا جسے تم میں لونی خاص بات محسوس ہوئی تم بہت لائق فرمانبردار اپنی شخصیت کے مالک ہو س چاہتا ہوں کہ تم علیزے کا ہاتھ تھام لو علیزے میں بچپنا بہت ہے اور تم کافی حد تک سو بر اور سنجیدہ شخصیت کے مالک ہو۔“ باس کی بات سے مجھے شدید دھچکا لگا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس بات کے لئے باس نے مجھے بلایا تھا مجھے ابھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ باس یہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔

”دیکھو بیٹا! میرا سب کچھ میری بیٹی کا ہے یہ گھر یہ بزنس بہت سے لوگ ہیں جو علیزے سے شادی صرف دولت کی وجہ سے کرنا چاہتے ہیں پر میں ایسے لاپچی لوگوں میں اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتا میرا امریکا میں اپنا بزنس ہے اور گھر بھی میں چاہتا ہوں شادی کے بعد آپ وہاں شفٹ ہو جائیں اور یہ سب بھی علیزے کے نام ہے دیکھو بیٹا آپ سوچو سوچنے کے لئے آپ کو جتنا وقت چاہئے لے لو لیکن بیٹا مجھے مایوس مت کرو۔“ میں نے اب تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا بات نہ کرنا کہ اس نے بیٹھا تھا مجھے یقین ہی نہیں ہو رہا تھا میرے لئے پچھلے کہا اور وہاں سے آ گیا۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

گھر لوٹنے پر فاطمہ میرے پاس آئی اور کہا۔

”کس لئے بلایا تھا باس نے آپ کو؟“ وہ ایکسا پینڈ تھی اسے گمان تھا کہ باس نے میری ترقی کے لئے کچھ کہا ہوگا یا میرا عہدہ بڑھایا ہوگا میں نے ناگواری سے فاطمہ کو کہا۔

”پلیز تم جلد جاؤ میں تھک گیا ہوں آرام کرنے دو۔“

یہ کہہ کر میں دروازہ بند کرنے لگا تھا کہ فاطمہ نے کہا۔

”چائے لاؤں آپ کے لئے؟“

”اس وقت مجھ پر یہ احسان کرو کہ تم یہاں سے جاؤ۔“ اور میں نے دروازہ اس کے منہ پر بند کیا میں خود بھی اپنی اس حالت پر حیران تھا میں نے بھی ابھی اس سے پہلے فاطمہ سے ایسے بات نہیں کی تھی مجھے کیا ہو گیا

ہے میں سوچنے لگا تھا کہ مجھے اس وقت باس کو منع کرنا چاہئے تھا میں کیوں بت بنا بیٹھا تھا اور کیوں بنا کچھ کہے چلا آیا میں فاطمہ کے علاوہ کسی اور سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ لیکن ان کی بات اتنی غلط بھی نہ تھی میرے دماغ نے خیال ظاہر کیا اور میں دنگ رہ گیا پھر میں سوچنے لگا اور ایک فیصلے پر پہنچ کر فاطمہ کے پاس گیا۔

☆☆☆☆

وہ اپنے کمرے میں گم صم بیٹھی تھی مجھے دیکھ کر وہ بے اختیار اٹھ گئی میں نے اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔

فاطمہ مجھے حیران سے دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ میرے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”فاطمہ کچھ دیر پہلے کے بدلے اپنے کمرے کے لئے تم سے معافی مانگتا ہوں“ آخر میں اس نے بات شروع کی میں نے فاطمہ کے چہرے کو اپنی نظر میں لے کر رکھا تھا وہ ایک دم نارمل ہوئی۔

”کوئی بات نہیں پریشانی میں لوگ اپنوں پر ہی غصہ نکالتے ہیں آپ پریشان مت ہوں میں بالکل بھی خفا نہیں ہوں“ فاطمہ میرے لئے مشکل بڑھا رہی تھی اب میں اسے کسے سمجھاتا۔

”فاطمہ! مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے پلیز تم مجھے کی کوشش کرو“ فاطمہ پھر پریشان نظر آنے لگی۔

”کہو میں سن رہی ہوں آپ کو جو بھی بات کرنی ہے اطمینان سے کریں۔“

”وہ بات یہ ہے کہ فاطمہ میرے پاس نے مجھے امریکا جانے کا موقع دیا ہے انہوں نے کہا ہے کہ میں ان کی بیٹی سے شادی کر لوں بدلے میں وہ مجھے امریکا بھیج دیں گے ادھر ان کا اپنا بزنس اور گھر ہے فاطمہ مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ میرا خواب اتنی جلدی پورا ہو جائے گا امریکا جانا میرے لئے اتنا آسان ہوگا پہلے تو میں باس کی بات سن کر پریشان ہو گیا پھر بہت

سوچنے کے بعد مجھے باس کی بات غلط نہیں لگی فاطمہ میں جتنی بھی محنت کرتا بھی امریکا نہیں جاسکتا تھا اور اگر چلا بھی گیا تو جاب ڈھونڈوں گا اچھی جاب آسانی سے نہیں ملتی اور اب مجھے لگ رہا ہے کہ اللہ نے مجھے موقع دیا ہے تو کیوں نہ میں اس سے فائدہ اٹھاؤں مجھے ان کی بات مان لینی چاہئے۔“ فاطمہ کا رنگ ہلکی کی طرح زرد پڑ گیا تھا مگر میں اتنا اپنے خوابوں کے پورا ہونے میں مگن تھا کہ اس کی طرف خیال ہی نہیں کیا کہ اس پر کیا بیٹی ہوگی وہ تو مجھ سے بہت کرنی تھی مگر اس وقت میں بہت خود غرض بن گیا تھا مجھے صرف اپنے خواب نظر آ رہے تھے اور کچھ بھی نہیں مجھے کسی کے احساسات اور جذبات کی قدر نہیں تھی کبھی تو بس اپنے خواب پورا ہونے کی اور وہ بھی اتنی جلدی اتنی آسانی سے۔ فاطمہ بہت خاموشی سے مجھے دیکھ رہی تھی میں نے فاطمہ کو کہا۔

”فاطمہ تمہارا کیا مشورہ ہے؟“ فاطمہ ایک دم چونکی۔

”آپ جو کرنا چاہتے ہیں کر لیں میری خوشی آپ کی خوشی میں ہے میں فاطمہ کے کچھ کا ٹوٹا پن بھی نہ سمجھ سکا۔

سب کو منانا میرا کام ہے۔“ میں اس لمحے اس بل اتنا خود غرض بن گیا تھا کہ نہ سمجھا کہ کچھ دن پہلے میں اسی لڑکی سے محبت کا دم بھرتا تھا اس سے میری ملتی ہوئی تھی پر نہیں مجھے اپنے خواب عزیز تھے پیار تو کسی سے بھی ہو سکتا ہے ہے ناں؟“

”فاطمہ کو مجھ سے اچھا مل جائے گا یہ تو کچھ لمحوں کی تکلیف ہے پھر وہ بھی خوش رہے گی۔“ میں نے فاطمہ کو چپ دیکھا تو کہا۔

”کہو ناں فاطمہ سب کو منالو گی؟“ فاطمہ نے میری طرف دیکھا اور معمول کے انداز میں مسکرائی۔

”ہاں منالو گی۔“ اس نے ایسا جواب چسپے میں نے کہا ہوا جائے بالوں کی ناں اور اس نے کہا ہاں کیوں نہیں مجھ سے اچھی جائے تو کوئی بنا ہی نہیں سکتا میں بہت سرشار

منا اپنے کمرے میں آیا اور مستقل کے پلان کرنے لگا۔

☆☆☆☆

پھر فاطمہ نے سب کو منائی لیا سب میری شادی کی تیاریاں کرنے لگے میں اپنی خود غرضی میں اتنا ڈوبا ہوا تھا کہ فاطمہ سے یہ بھی نہ پوچھا کہ تم نے سب کو کیسے منایا پھر میری شادی ہو گئی اور میں اور علیرے امریکا شفقت ہو گئے امریکا میں علیرے کے نام بہت خوبصورت ایک چھوٹا سا گھر تھا اور آفس بھی بہت شاندار تھا۔ ایسے ہی خواب تو میں نے دیکھے تھے۔ بالکل ایسا شاندار آفس اور اس کا مالک میں علیرے اور میرے تعلقات میں نہیں تھے وہ مجھ سے کبھی کبھی ملتی تھی پر میں نے کوئی تو نہیں دی ابھی میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا میں خوش و خرم ملائے خوابوں کے دورے ہونے پر میں خوابوں کی دنیا میں تھا کہ ایک دن علیرے میرے پاس آئی اور کہنے لگی۔

”آپ میرے ڈیڑکی پسند ہیں میری نظر میں میں نے میری زندگی میں بھول سے بھی دخل اندازی کر کے گا تو بہتر رہے گا تمہارے لئے بھی اور میرے لئے بھی میرے ڈیڑنے اپنے کاروبار کے لئے میری شادی تم سے کی ہے تاکہ تم ان کا کاروبار آگے بڑھاؤ تاکہ تم وہی کرو جو تمہارے لئے بہتر ہوگا۔“ یہ کہہ کر میرے چلی گئی اور میں اپنے خوابوں سے نکل آیا جس لمحے میرے اندر کچھ ٹوٹ گیا پر میں نے خیال نہیں کیا۔

☆☆☆☆

پھر روز و شب گزرنے لگے اور مجھے اپنے قید خانے کا احساس ہونے لگا میں سارا دن آفس میں لپکتا رہا پر میں ایک روپے کا بھی مالک نہیں تھا مجھ کو چھوٹے سے چھوٹے چیک کیش کرنے کے لئے علیزے کے سائن درکار ہوتے ہیں اب جا کے علیزے کو آکھیں کھلیں پر اب بہت دیر ہو گئی تھی اب میرے پاس کچھ بھی نہیں سوائے بچھڑانے کے۔ اور ان کے اب مجھے فاطمہ شدت سے یاد آنے لگی پر

اب کیا اب تو وہ بھی پرانی ہو گئی ہوگی پر اگر اس کی شادی نہ بھی ہوئی ہو تو کیا میں اس کا سامنا کر سکتا ہوں نہیں کبھی بھی نہیں میں اب ایسی زندگی جینے پر مجبور ہوں جو میری اپنی چوٹا سٹی میں نے اپنے سارے راستے خود اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہیں اور مجھ میں ہمت نہیں ہے اس سب کا سامنا کرنے کی پر مجھے فاطمہ بڑی شدت سے یاد آتی ہے۔

☆☆☆☆

میں فاطمہ ہوں مجھے بہت دکھ ہوا جب شہر بار نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے خوابوں کو پورا کرنے کے لئے اپنے پاس کی شرط ماننے کو تیار ہے پر پھر میں نے خود کو سنبھال لیا جو شخص اپنے خوابوں کے پیچھے دیوانہ ہے کہ اسے میرا خیال نہیں آیا میرے ساتھ پیار کے وعدے بھول گیا کیا وہ مجھے بھی زندگی میں خوشی دے سکے گا نہیں کبھی نہیں پھر میں نے سب کو منالیا دادا دادی کو تاپا پاپا کو میرے کہنے پر سب مان بھی گئے میں نے سب کو چپ رہنے کے لئے کہا اور وہ سب میرے کہنے پر بھی گئے۔ پر مجھے اب بھی آس تھی امید تھی کہ وہ سب میرے لئے اہم ہو میرے خواب نہیں۔“

☆☆☆☆

پر اسے اپنے خواب سے مجھے فاطمہ نہیں مجھے بہت تکلیف ہوئی پر میں نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

☆☆☆☆

پھر تاپا نے میری شادی اپنے دوست کے بیٹے سے طے کی جو اب مجھ سے تھا۔ میں نے کچھ نہیں کہا اور میں شادی کر کے مصطفیٰ کے گھر آ گئی جو مجھ سے بہت پیار کرتا ہے صبح اٹھ کر پہلے مجھے دیکھتا ہے میں خود کو دنیا کی سب سے خوش نصیب لڑکی تصور کرنے لگی ہوں مجھے لگتا ہے مجھے اس سے پیارا ہونے لگا ہے شہر یار تو کہیں پیچھے رہ گیا ہے بہت پیچھے میں بہت خوش ہوں اور آپ بھی میرے خوش رہنے کی دعا کیجئے گا۔

☆☆☆☆

ایک سو سو سال کی شہزادی



اگر سنو وائٹ شاہی اعلیٰ خاندان کے کسی بادشاہ کی بیٹی تھی تو میری ایک سو سو سال کی سنو وائٹ بھی ملک کے لاکھ بچی کروڑ بچی شخص کی اکلوتی لاڈلی اولاد تھی۔ پر یہ ظلم ہی ہوا تھا ناں اس کے ساتھ بھی کہ اس کے والد بھی دوسری شادی کے مرتکب ٹھہرے تھے مگر یہاں بالکل مختلف رد عمل مظر عام پر آیا بالکل متضاد بات ہوئی وہ سنو وائٹ جس کی بچہ بچہ اب بھی شوق سے کہانی سنتا ہے اس کے باپ یعنی بادشاہ محترم کی ملکہ تو بہت حسین تھی۔ الٹی پڑ گئیں سب تدبیریں کے مصداق سنو وائٹ کی دوسری ماں بالکل گندی سرمی رنگت، اس پر گول کٹور ابوی بڑی آنکھیں لیے ہوئے تھیں۔ اس پر قدرے حد نظر سراپا دیکھنے کے لائق تھا۔ از حد ملک صاحب کی دلدادہ بھی تھی۔ آئینے کو ایسے سنہال سنہال کر ساتھ رکھتی گویا محبوب شدید عالم فریفتگی میں سینے سے لپٹ جائے۔ میری ایک سو سو سال کی شہزادی کی دوسری ماں یعنی بیویتی ماں زائرہ کا تعلق بھی جاگیر دار گھرانے سے تھا۔ سودولت کی حد درجہ بہتات و کثرت نے اور خود اس کی نزاکتوں نے بھی اسے بناء گوری رنگت کے بھی دودھ ملائی سی شادابی اور رخ روشن پر طلوع سحر سا نکھار عطا کر دیا تھا۔ کوٹھی نما محل میں قدم رکھتے ہی سنو وائٹ اس کی اولین دشمن بنی۔ جنگل، خونی درندوں سے ڈراوے دینے کی حکمت عملیاں اور شکاریوں والی تہاویز کہیں

”سنا ہے آپ کی آنکھیں بادشاہ آنکھیں نظر اٹھائیے، ہم کو غلام کیجیے نا!“ وہ ایک سو سو سال کی کوئی عام لڑکی نہ تھی۔ نہ وہ کوئی ساحرہ تھی جو سحر میں رہنے پر ذی روح کو مدغم کر لے نہ زمانہ قدیم کی کوئی حسین و جمیل دوشیزہ تھی جس کی بچپن میں کہانی سن کر بچے بالے خوش ہوتے ہوں یا کسی انٹل کردار کی صورت وہ ابھی تک لوگوں کے دلوں میں امر، زندہ جاوید یادگار تھی مگر اس کی مادرانی ذات میں کچھ ایسا مخفی ضرور تھا۔ بالخصوص آنکھوں میں، شہد آگئیں نیلگوں آنکھیں سرنگوں آنکھیں.....! میں سنجیدہ سا جاذب جب خیل کے پردے پر اس کی سحر آگئیں آنکھوں کو جب عین کے پیانے پر چار کرتا، وہ تاباں ستاروں کی چمک سا تماشا دکھانے لگتیں۔ میں جب سبک ہوتے خرام سبک روی سے ٹھہر ٹھہر کر قدم رکھتا، شوخیاں اس کی دیو مالائی دیوی کا سا حسن لیے مجھے چھیڑنے لگتیں۔ جب نیند میں ہوتا عالم خواب میں، اس کی آنکھیں بیداری لیے خواب میں حقیقت بن جاتیں۔ جب شب کی خاموشی میں مجھے وہ بوسہ دیتیں، میں محبت کی گہرائیوں سے ابھر کر جل پر یوں سمیت رقص کرنے لگتا۔ علاوہ آنکھوں کے سبھی تھے نقش اس کے سبب بے عیب سرخ و سفید، برف جیسی رنگت لیے، کلیشہیروں کے تو دوس سے ہلکے اور نرم، پھر میں اسے کیونکر نہ سنو وائٹ کہتا

دور بہت دور رہ گئیں تھیں۔ زائرہ بیگم کو چونکہ شراکت داری گوارہ نہ تھی پس سر بازار سر عام سنووائٹ کو نیلام کرنے کا منصوبہ عمل میں لیا گیا۔ وجہ تو یہ وہی تھی۔ اس کا حد سے بڑھتا حسن، چاند سورج کی کرنوں کو ماندرتا ہر ایک کو خیرہ کر دینے والا حسن..... زائرہ بیگم کے دل کے نہاں خانوں پر کڑکڑاتی بجلیاں گراتا ہوا حسن۔ از حد ملک صاحب کی ذرا سی بھی توجہ بارالغات سنووائٹ کے لیے ہوتا تو وہ وقت زائرہ بیگم پر کڑا امتحان بن کر گزرتا۔ چاہتی تو وہ بھی یہی تھی کہ ملکہ کی طرح اسے بھی کسی شکاری کے ہاتھ جنگل میں پھینکا کر قتل کروا دے مگر وہ اکیسویں صدی کی عورت، امیر زادی لومڑی سی عیاری رکھتی تھی اسے آسان حربے نہیں بلکہ شیطانی حکمت عملی کا گر کرنا تھی۔ اسے اپنا جہاز ساز بیڈ چھوٹا لگنے لگتا جب شہزادی (اسے سب نے شہزادی) کا لقب دے ڈالا تھا کہ سب گن ہی اس کے اندر تھے مح حسن شہزادیوں والے تھے۔ اپنے بستر پر خوبوا ستراحت ہوتی۔ وہ سوتی تو اسے یوں لگتا جیسے سوئے ہوئے محل کی کوئی شہزادی جھماکے سے سامنے آگئی ہو اور یہ وہ وقت ہوتا جب اس کے دل میں شدت سے یہ خواہش ابھرتی کہ شہزادی ہمیشہ کے لیے سو جائے۔ ساری مخلوق جب وقت شب نیند کی مسکور کن دیوی کو بانہوں میں لیے، خواب و خرگوش کے مزے لوٹنے لگتی تو زائرہ بیگم عرف ملکہ شہزادی سے جان چھڑانے کی منصوبہ بندی کے کار ہائے نمایاں سرانجام دینے لگتی۔ آخر کو اس نے انتہائی چاہنے والی ماں کا روپ دھار لیا تا کہ موقع تاک کر محبتوں کا ناکہ رچا کر شہزادی کے جسم سے زندگی نکال کر اس کے سر میں، موت کی کیل ٹھونک سکے۔ اکیسویں صدی کی سنووائٹ اکثر خاموشی کے اوقات میں اپنی لطیف انگلیوں سے کھڑکیوں کے شیشے کھٹکھٹاتی اور اس سے جو موسیقی پیدا ہوتی اس دل آفریں ردھم

سے اپنا دل بہلاتی۔ پہلے ہی دن وہ زائرہ بیگم کی حاسدانہ طبیعت سے واقف ہو چکی تھی مگر ملک از حد اس کی کل متاع جاں اپنے بادشاہوں جیسی آن بان رکھنے والے باپ کی خاطر اسے یہ سب برداشت کرنا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اپنی منہ دیکھے کی محبت کے سبب زائرہ بیگم نے شہزادی کے لیے الگ محل نما گھر بنوا ڈالا۔ جس میں گھنے، تاریک، فسوں خیز جنگل کی سی خاموشی تھی۔ بالکل خالی، بالکل اس جنگل میں مکان جیسا جہاں سنووائٹ بھٹک کر جا پہنچتی تھی پر وہاں تو اس سے محبت کرنے والے کئی بونے تھے جب کہ یہاں شہزادی کے لیے سات نوکروں کے لیے ایک لمبی قطار ملکہ کی چاہ یہی تھی کہ شہزادی کو باپ کے گھر سے نکال کر ادھر منتقل کر دیا جائے مگر ملک از حد کو یہ منظور نہ تھا آخر کو حتمی فیصلہ یہ ہوا کہ بعد از شادی شہزادی اپنے شہزادے کے ساتھ وہاں رہنے آئے گی۔ نوکروں کے دل بھی اسی محبت سے لبریز تھے۔ شہزادی کے لیے جو یوں کی سنووائٹ کے لیے تھی۔ وہ اس کا ہر کام شوق سے کرتے تھے آخر کو ملک از حد کے پرانے نمک خوار ملازم تھے۔ شہزادی اب کبھی کبھی چہل قدمی کرنے سیر کی غرض سے وہاں الگ تھلک محل میں چلی جایا کرتی تھی۔ یہی تو زائرہ بیگم عرف ملکہ کا منصوبہ تھا کہ شہزادی کو کسی طرح تنہا کیا جائے بلکہ کبھی بکھار تو وہ آئینے کو رو برو رکھ کر اپنا اور شہزادی کے عکس کا تقابل کرتی تو اسے سنووائٹ کا جھٹکے سے کرنٹ لگتا وہ بھی سنووائٹ کا، اتنی بیش بہا دولت ہونے کے باوجود بھی وہ حسن کے مقابلے میں غریب نہیں بلکہ بے حد غریب تھی۔ بالآخر موقع پا کر بادشاہ ملک از حد کو قابو کر کے (چکنی چڑی باتوں سے) شہزادی کو اغوا کر لیا گیا۔ حسن آفندی جسے اغوا کے ہر کارے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا وہ شہزادی کے حسن تقدس پر ایسا فریفتہ ہوا جیسے سنووائٹ کے شکاری نے اس کے حسن کی تاب

ہلاتے ترس کھا کر اسے چھوڑ دیا تھا۔ حسن نے بھی ہیرا رادی طور پر اس کی تقلید کرتے شب کا اندھیرا ہونے سے قبل ہی اسے محل نما کوٹھی کی چار دیواری کے حوالے کر دیا۔ وہ جو اپنے پیروں پر پانی نہ پڑنے دینا چاہتی تھی خود اس کے پیروں پر پانی پڑ گیا تھا۔ بلکہ کو خوب تاؤ آیا ہیرکف اب اگلے منصوبے پر عمل شروع کیا گیا۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے، شہزادی پھر سے بچ گئی کہ ایک دفعہ بچپن میں بھی شدید چاہنے کے باوجود وہ اسے قتل نہ کر سکی تھی کہ ملک از حد ہمہ وقت شہزادی کا سایہ بنا رہتا۔ ہوا کچھ یوں کہ ملکہ نے حسن کو شکاری کی طرح سزائے موت تو نہیں بلکہ اپنے ذاتی ہتھکنڈے استعمال کر کے اسے جیل میں ڈلوادیا اور دوسری جانب اپنی لچھے دار گفتگو سے شہزادی کو اپنا بنانے کی سعی کرنے لگی۔

”بیٹی! تمہاری خوب صورتی دیکھ کر مجھے اپنی مری ہوئی بیٹی یاد آتی ہے۔ تم روز میرے ہاتھ سے دودھ پیا کرو۔ اس عمل سے مجھے خوشی اور اس کی روح کو سکون ملے گا۔“ ملکہ جس قدر لچھے میں ملاوٹ پر دست تھی اتنی مری ہوئی۔ شہزادی کو دل ہی دل میں شک، وہم بھی ستاتے مگر کبھی یہ سوچتی کہ شاید ملکہ واقعی بدل گئی ہے۔ جب ملک از حد بھی مطمئن اور خوش ہوتا تو ملکہ خوب بلند و بالا تہنہ لگاتی۔ اپنی فتح کا جشن مناتی۔

”حاسد حد کی آگ میں خود ہی جلا کرے وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے!“

روز دیے جانے والے دودھ میں زہری تھوڑی سی مقدار سے شہزادی کی دن بدن صحت گرنے لگی چونکہ ملکہ کو شائینگ کا بھی حد درجہ کربز تھا آخر کو اکیسویں صدی کی پیداوار تھی۔ ادھر ہر طرف سے مطمئن وہ خریداری کے لیے گئی۔ ادھر شہزادی جو خاموش محل میں چہل قدمی کرنے کے لیے گئی کہ سب ظرام ہواؤں کے جھونکے طبیعت پر اچھا اثر ڈالتے۔

ایک دم چکر کر گر پڑی۔ اس کا ہاتھ کٹنے سے پاں ہی پائیدان پر رکھا گلدان کرچی کرچی ہو گیا۔ سات نوکروں کی فوج سرعت سے عزیز از جان شہزادی کے پاس پہنچی کہ ایک لخت آنے والی پٹاخ کی آواز نے سب کو ہی چونکا کر رکھ دیا تھا۔ سو وہ فوری طور پر اسے شہر کے مہنگے ترین اسپتال میں لے گئے۔ ڈاکٹر ہمدرد میچا سنووائٹ کا شہزادہ ثابت ہوا۔ جاذب نے نہ صرف نوکروں سے ساری تفتیش کی بلکہ مکمل علاج اور بعد از تفتیش ملک از حد کو قتلے وقت سے دیے جانے والے زہر سے بھی آگاہ کیا۔ اس بات کو ملکہ سے مخفی رکھا گیا مگر کب تک.....؟ آخر کو ملک بھی تو اکیسویں صدی کا بادشاہ تھا فوری سہہ حریفی لفظ کہہ کر ملکہ کو فارغ کیا۔ ملکہ کا سر قلم کرنے کی نوبت ہی نہ آئی کہ سانپ بھی مر گیا تھا اور لائچی بھی نہ ٹوٹی تھی۔ خادموں کو بہترین معاوضے سے نوازا گیا اور پھر یوں ہوا کہ شہزادی اور شہزادہ خوشی خوشی اپنے خاموش محل میں رہنے لگے۔

ہوتی ہے یہ شہزادی
معصوم بھی
مکرم بھی
مظلوم بھی
مغرور بھی
دلکش حسین بھی
خوبصورت کینس بھی

بہادراتی کہ..... سر راہ آنے والے طوفانوں سے
نہیں ڈرتی
تن تنہا مشکلات کا ہے مقابلہ کرتی
سنوگوں کو!
زہر لیے سب سے ”شہزادی“
اکیسویں صدی کی نہیں مرنی.....!

انتی اختر

ہمدرد قریبیں ملنے والی

”یہ کیا تم ہر وقت یہ گانا سنتے رہتے ہو کہیں پتا ہے ناں مجھے یہ سوگ پسند نہیں ہے۔“ ہریرہ جو بڑے مکن انداز میں درخت سے ٹیک لگائے گانا سن رہا تھا۔

ابرش اس سے موبائل چھیننے ہوئے بولی۔

”یار! تمہیں اس سوگ سے کیا پر اہلہم ہے۔“

”پتا نہیں پر مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”پر مجھے تو بہت پسند ہے پتا ہے جب میں اور تم جدا ہوں گے ناں تو میں یہی سوگ سنا کروں گا۔“

ہریرہ شرارتی لہجے میں بولا۔

”ہریرہ! کبھی کوئی اچھی بات مت کرنا ہمیشہ بوٹگیاں ہی مارتے رہتا۔“ ابرش جل کر بولی تھی۔

”تو محترمہ آپ اچھی بات سناؤں میں تو آئی نہیں۔“

”اچھی بات یہ ہے کہ یہ جو تم فضول کاموں میں اپنا وقت ضائع کرتے ہو کبھی نماز بھی پڑھ لیا کرو۔“

ہریرہ کے چہرے پر اک سا یہ سا آ کر گزر گیا۔

”ہیلو یار تم لوگ یہاں بیٹھے ہو اور میں نہیں پوری یونی میں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں۔“ حائقہ ان دونوں کے پاس بیٹھے ہوئے بولی۔

”وہ ہریرہ کو یہاں دیکھا تو میں ادھر ہی چلی آئی۔“ وہ دونوں آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں مگر ہریرہ ان دونوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی نہیں تھا۔

☆☆☆☆

ہریرہ اور ابرش نے یونیورسٹی میں ایک ساتھ



تھا کیا۔ وہ ٹالتے ہوئے بولا۔

”ہاں ہریرہ! بہت ضروری بات کرنی ہے تم سے۔“
”کوئی پریشانی ہے؟“

”ہاں۔“
”کیوں کیا ہوا؟“

”ہریرہ میرے لئے پوئل آ یا ہے اور مجھے یقین ہے کہ بابا ہاں کر دیں گے تم اپنے مئی ڈیڈی کو۔“
”ایکسکیوز می۔“ ابھی اس نے بات مکمل نہیں کی تھی کہ اس کے فون نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔
”ہیلو جی ماما! اوکے میں ابھی آئی آئی ایم سوری ہریرہ مجھے جانا ہوگا، ماما کو چیک اپ کے لئے لے کر جانا ہے میں اس بارے میں تم سے بعد میں بات کروں گی۔“ وہ غلت میں موبائل بیگ میں ڈالتے ہوئے بول رہی تھی اور بت بنا ہریرہ اسے بائے بھی نہ بول سکا۔

☆☆☆☆

وہ اپنی سے واپس آئی تو ماما کو چیک اپ کے لئے لے کر اور اب جب سے ہاسپٹل سے واپس آئی تھی ایک ہی لمحہ اسے ہکان کر رہی تھی کہ اس نے ہریرہ سے یہ کہہ دیا یہ بات تو ہریرہ کو کہنی چاہئے تھی کیا وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے سوچ سوچ کر اس کا دماغ پھٹ رہا تھا اب تو یونی جا کر ہی سب پتا چلے گا، وہ دل ہی دل میں تنہی کرنی ہوئی نماز کے لئے اٹھ گئی۔

☆☆☆☆

صبح وہ غلت میں یونی پہنچی تو ہریرہ اسے گراؤنا میں ہی مل گیا اس نے اپنے قدم اس کی طرف بڑھا دیئے نا جانے کیوں آج اسے ہریرہ کی طرف بڑھتے ہوئے قدم اتنے بھاری کیوں لگ رہے تھے ہریرہ ہمیشہ کی طرح آج بھی خلاؤں میں گھم رہا تھا، ابرش نے یہ بہت بار محسوس کیا کہ جب وہ اکیلا ہوتا ہے الجھا الجھا اور کسی چیز میں کھوسا جانا

ایڈیشن لیا اور اب وہ دونوں یونیورسٹی کے لاسٹ ایئر میں تھے اپریش یونی میں سب سے ایک حد میں رہ کر بات کرتی تھی، وہ کسی سے اتنی فرینک نہیں ہوتی تھی مگر جب ہریرہ نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تو نا جانے کیوں وہ انکار نہ کر پائی ہریرہ ایک ڈیسنٹ سا انسان تھا اس نے کبھی کسی سے بدگیزی سے بات نہیں کی اور نہ ہی کبھی کسی کا دل دکھایا۔ وہ بس اپنے ہی من کی سنتا اور کرتا ابرش کو اس کی یہ عادت بہت پسند تھی ان دونوں کی یہ دوستی دن بہ دن گہری سے گہری ہوتی گئی اور یہ کب محبت میں بدل گئی ان دونوں کو خود بھی معلوم نہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے لئے محبت کی جگہ کھینچتے تھے لیکن نا جانے کیوں اپنی اپنی محبت کا نظریہ اپنے من کی ہمت دونوں میں نہیں تھی ابرش تو لڑکی تھی اس کی شرم و حیا آڑ سے آجاتی لیکن ہریرہ کی ایسی گلیاں پھوٹتی تھیں کہ بات بھی ابھی ابرش کو اچھے پر مجبور کر دیتی لیکن ابرش کو دیکھتے ہی ہریرہ کی آنکھوں کے جلتے دیئے سب کچھ فراموش کرنے پر مجبور کر دیتے مگر وہ بھول گئی تھی کہ محبت میں اظہار ضروری ہوتا ہے جس طرح پھولوں کے لئے خوشبو ضروری ہوتی ہے محبت کے لئے اظہار ضروری ہوتا ہے۔

☆☆☆☆

وہ یونی آئی تو نظریں ہریرہ کو ہی ڈھونڈ رہی تھیں لیکن وہ اسے کہیں نہ ملا اور ایک گھنٹہ جھان بین کے بعد وہ کینٹین میں ملا تھا دونوں بازو ٹیبل پر رکھے نہ جانے کن سوچوں میں غلطاں تھے۔

”ہریرہ! کن سوچوں میں ہو میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھے ہو۔“ وہ سامنے والی چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بس! بھوک لگی سوچا کچھ کالوں۔“ وہ آہستگی سے بولا۔
”کچھ پریشان ہو۔“ ابرش اس کے بچھے بچھے چہرے کو دیکھ کر بولی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں تم بولو کوئی ضروری کام

ہے آج بھی وہ ایسے ہی بیٹھا تھا۔

”ہریرہ۔“ اس نے چونک کر ابرش کی طرف دیکھا تھا۔
”ہوں۔“

”یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو۔“ وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

”بس ایسے ہی کچھ دیر اکیلے بیٹھے کومن کر رہا تھا۔“

”ہریرہ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ وہ ہمت جمع کرتے ہوئے بولی۔

”ابرش! مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔“ ہریرہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔

”پہلے تم بولو گی یا میں؟“

”ہریرہ! پہلے تم بولو۔“ ابرش نے کیوں ابرش کا دل ڈول رہا تھا۔

”ابرش۔“ ہریرہ نے اس کا نام کھینچتے لے لیا تھا۔
”بولو ہریرہ!“

”مجھے بھول جاؤ ابرش۔“ کہنے کو یہ چند لفظ تھے لیکن کوئی ہریرہ سے پوچھتا کہ اس کے لئے یہ لفظ کس کرب سے کم نہ تھے۔ کوئی ابرش ابراہیم سے پوچھتا جنہوں نے اس کے پیروں تلے سے زمین صحیح کی تھی وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی نہ تو وہ کچھ بول رہا تھا اور نہ ہی ابرش میں ہمت تھی۔

”میری منت پوری نہیں ہوئی میرے دھاگے موڑ دے سلا میں“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی بے شک ناغیں کانپ رہی تھیں قدم من من کے ہو گئے تھے مگر وہ اب مزید یہاں رک کر اپنے جذبات کی توہین نہیں کرنا چاہتی تھی بغیر کچھ کے بغیر کچھ گلہ شکوہ کرے اٹھ کھڑی ہوئی اور گلہ شکوہ کرتی بھی تو کس بات پر اس نے تو بھی کوئی وعدہ ہی نہیں کیا نہ ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائیں وہ تو بس اس کی آنکھوں سے دھوکا کھا بیٹھی تھی۔

”ابرش۔“ ابھی وہ بڑی مشکلوں سے چند قدم آگے بڑھی ہوئی کہ ہریرہ کے پکارنے پر اس کے قدم

جکڑ گئے۔ وہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا تھا ابرش نے ایک نظر اسے دیکھا اور نظریں جھکا لیں اس ایک آنکھ میں کیا کچھ نہیں تھا بے اعتباری دھوکا غریب سب کچھ ہریرہ تڑپ ہی تو اٹھا تھا یہ سب دیکھ کر۔

”ابرش! میں نے وفا نہیں ہوں۔“ اس کے ایک ایک لفظ میں تڑپ واضح تھی۔

”ہریرہ میں نے تمہیں بے وفا نہیں کہا، مگر تمہاری آنکھیں سب کچھ کہہ رہی ہیں ہریرہ! آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں آنکھیں دھوکا دیتی ہیں۔“ وہ حلق کے بل چیخ رہی تھی۔

”اور ہاں مسٹر ہریرہ آئندہ اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں ہوگی کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ میں جان چکی ہوں۔“

”نہیں ابرش! یہ ٹاپک ابھی ختم نہیں ہوا تم پورا سچ نہیں جانتیں تم مجھے بے وفا کا لقب دے کر کہیں جا سکتیں۔“

”میں نے کہا ناں ڈونٹ ریپٹ اےگین دس ٹاپک۔“ اس نے قدم آگے بڑھا دیئے تھے۔

”رکو ابرش! تم ایسے نہیں جا سکتیں۔“ ہریرہ نے اس کا بازو پکڑ لیا تھا۔

”ایڈیشن! سچ ہی۔“ اس نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑایا تھا۔

”ابرش! کیا تم میری حقارت جانتی ہو اگر تم میری حقیقت جان لینے کے بعد میری سزا خود کوگی تو میں خود کو بے وفا کہہ دوں گا، پر تم میرا چہرہ تو کیا تم مجھ سے دوستی بھی ختم کر دو گی۔“ اب وہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

”ابرش میں نے لفظوں سے کبھی تمہارا حوصلہ نہیں بڑھایا تم کہتی ہو آنکھیں جھوٹ بولتی ہیں لیکن میری آنکھیں تمہیں دیکھتے ہی خود ہی سچ بولنے لگتی ہیں ابرش میں اور تم بھی ایک نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہم سمندر کے دو کنارے ہیں جو کبھی نہیں مل سکتے ابرش میں سراب ہوں اور اب تک تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھیں میں تمہیں یہ سچائی بھی نہیں بتانا

چاہتا تھا لیکن میں چاہتا ہوں تم خوش رہو مجھے بھول کر ابرش! میں مسلم نہیں ہوں۔“ آخر اس نے سچ بول دیا تھا ابرش کو ایسا لگا جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں اندیل دیا ہو وہ بالکل ساکت کھڑی تھی۔

”ابرش! کچھ تو بولو۔“ وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔

”مگر..... مگر تمہارا نام۔“ وہ انتاہی بول سکی تھی۔

”میرا نام میرے بابا کے بہت کلوز فرینڈ تھے جو مسلم تھے انہوں نے رکھا اور بابا انہیں منع نہیں کر پائے مجھے معاف کر دو ابرش پہلے پہل تو میں یہ سمجھتا رہا کہ میں چاہتا ہوں لیکن جب تم مجھے نماز کے لئے کہتیں تو مجھے پتا چلا کہ میں نہیں جانتیں اور تب تک مجھے میں ہمت کہاں رہی تھی میں سب بتانے کی بہت بار کوشش کی لیکن ناکام رہا۔“ وہ شاید اپنی بات مکمل کر چکا تھا ابرش ابھی بھی خاموش تھی۔

”ابرش کچھ بولو۔“

”ہریرہ تم اسلام قبول کر لو میرے لئے نہیں اللہ کے لئے ہریرہ تم تو بڑھے لکھے ہو پھر بھی گمراہی کے راستے پر چل رہے ہو۔“

”ابرش! میں ایسا نہیں کر سکتا میں اپنی ماں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اگر میں نے اسلام قبول کر لیا تو میرے بابا مجھ سے ہر تعلق توڑ دیں گے اور میں اپنی ماں کے بغیر مر جاؤں گا۔“ ہریرہ کی آنکھوں میں جو اذیت تھی ابرش سے دیکھی نہ تھی اس نے زور سے آنکھیں بند کر لیں اور قدم اپنی منزل کی طرف بڑھادیے کیونکہ ہریرہ اس کی منزل نہ تھا۔

☆☆☆☆

آج ابرش ابراہیم کی شادی تھی وہ بہت بار ٹوٹی تھی لیکن وہ سنہل گئی تھی کیونکہ اس کا رب اس کے ساتھ تھا وہ اپنے باپ کی اکلونی اولاد تھی اپنے بابا کا مان تھی غرور تھی اور سب سے بڑی بات ایک مسلمان تھی وہ بھلا کیسے بھٹک سکتی تھی وہ پوری

ایمانداری سے سعد عبداللہ کی زندگی میں قدم رکھ رہی تھی وہ اس انسان کے لئے کیوں بھتیجی جو ”اللہ اکبر“ کی صدا پر رب کے سامنے سجدہ نہیں کرتا وہ اپنے رب سے پیار کرتی تھی وہ ایک نئی مسلمان تھی وہ حضرت محمد ﷺ کی امت میں سے تھی وہ نہیں بھٹک سکتی تھی۔

☆☆☆☆

پوئیشن ابھی ابھی اسے تیار کر کے باہر گئی تھی موبائل کی بجٹی یون نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی تھی ہریرہ کا نمبر دیکھتے ہی وہ ساکت ہو گئی تھی اس نے اس دن سے کوئی کال یا میسج نہیں کیا تھا لیکن آج پھر نا جانے اس نے کیا سوچتے ہوئے اس کی کال اینڈ کر لی تھی۔

”ہیلو ابرش! میں باہر کھڑا ہوں بس آخری بار تم سے ملنا چاہتا ہوں پلیز انکار مت کرنا۔“

”مگر۔“

”میں جانتا ہوں تمہاری شادی ہے لیکن پلیز

مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“

”تھک ہے تم گھر کے پچھلے کراؤنڈ میں آؤ میں بھی آتی ہوں۔“ اس نے اپنے گرد بڑی سی براؤن چادر لپیٹی تھی اور کمر باندھ رہا تھا۔

”ہریرہ۔“ وہ اس کے گھر سے کھڑی ہوئی تھی

ہریرہ نے مڑ کر اسے دیکھا تو اس کا جیسے ہر سو چاندنی بکھر گئی ہو وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا اور پھر خود ہی

شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لی تھیں ابرش نے نا چاہتے ہوئے بھی اس کو غور سے دیکھا نا جانے کیوں آج اس

کے چہرے پر ایک الگ ہی نور تھا خوبصورت تو وہ پہلے

ہی تھا لیکن یہ کیسا نور تھا۔

”ابرش! کیا دیکھ رہی ہو یہ میرے رب کے کلام

کا نور ہے یہ میرے رب کے نام کا نور ہے ابرش

میرے دل کو سکون مل گیا میں ہر چیز سے مالا مال ہو گیا

ہوں مجھے میرا رب مل گیا اس نے مجھے پناہ دے دی ہے اس نے مجھے اپنا بنالیا ہے اس نے مجھے اپنے نبی کا

امتی بنالیا ہے اب نا تو میں تھکتا ہوں نہ الجھتا ہوں میری الجھنیں یہی تھی کہ میرا رب مجھ سے ناراض تھا مجھے خوشی ہے کہ ایک لڑکی کی وجہ سے مجھے میرا رب مل گیا ابرش جس دن تم مجھ سے آخری بار ملی تھیں اس دن سے میں بہت ٹوٹ گیا تھا بکھر گیا ایک دن میں لاہریری سے باہر آ رہا تھا اذان کی آواز پر میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا میں آنکھیں بند کر کے اذان سن رہا تھا اور میرے قدم میرے اور میرے رب کے درمیان فاصلے کو تہہ کر رہا تھا جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں مسجد کے سامنے کھڑا تھا اور میرے قدم اندر کی طرف بڑھنے لگے سب لوگ باجماعت نماز پڑھنے کے لئے کھڑے تھے میں ایک کونے میں بیٹھ گیا امام صاحب نے نماز شروع کرادی امام صاحب کے الفاظ میرے کانوں میں رس گھولنے لگے مجھے لگ رہا تھا کہ برسوں سے تھکا ہوا تھا اب

ساری تھکان اتر گئی میں نماز مکمل ہونے تک وہیں بیٹھا رہا باب مولوی صاحب دعا مانگ رہے تھے۔

”اے اللہ! میں خاکی ہوں خطا کار ہوں میری

خطاؤں کو معاف فرما ایسی میں سیاہ کار ہوں میری سیاہ

کاریوں کو معاف فرما اے مولا میں مجرم ہوں گناہ کار ہوں تو میرے گناہوں کو معاف فرما اے آقا! مجھ

سے تیرا حق عبادت ادا نہ ہو سکا تمام عمر غفلت میں پڑا

رہا اور تیری نمک حرامی کرتا رہا اور اپنی من مانی کرتا رہا

اور تیری نافرمانی کرتا رہا الہی میرے اس جرم عظیم

اور قصور کو معاف فرما اے کریم! میں اپنے گناہوں اور

قصوروں پر نادم اور شرمسار ہوں تو میری اس شرم

ساری کو قبول فرما اے اللہ معاف فرما معاف

فرما۔“ دعا ختم ہو چکی تھی ہریرہ اپنے رب کے سامنے

ہاتھ اٹھائے پھوٹ پھوٹ کر رہا تھا وہ اب تک

گمراہ لیا ہی اور پیچھتاوے کی آگ میں جل رہا تھا تب اسے اپنے کندھے پر کسی کا لمس محسوس ہوا تو اس نے آہستہ سے آنکھیں کھولی تھیں امام صاحب

آنکھوں میں مسکراہٹ لئے اسے دیکھ رہے تھے۔

”کیوں رو رہے ہو؟“ مولوی صاحب اسے پہلے سے جانتے تھے۔

”میرا رب مجھ سے ناراض ہے۔“

”نہیں وہ کبھی کسی سے ناراض نہیں ہوتا وہ رب ہے وہ ستر ماؤں جتنا پیار کرنے والا وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کر لیتا ہے اور اس نے تو تمہیں اپنے

خاص بندوں میں چنا ہے جو تم اس وقت اس کی بارگاہ میں بیٹھے اس سے معافی کے طلب گار ہو اور پھر

مولوی صاحب نے مجھے کلمہ پڑھایا اور مجھے ایسا لگا

جیسے میں اندھیرے کنوئیں سے نکل کر اجالے میں

آ گیا ہوں میرے دل کو سکون آ گیا میرے رب

نے میری توبہ قبول کر لی۔“ ہریرہ نے اپنی بات مکمل

کر کے ابرش کی طرف دیکھا تھا جس کی آنکھوں

میں آنسو اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”ابرش! میں نے اسلام قبول کر لیا صرف اپنے

اللہ کے لئے اسلام قبول کر لیا میرا یہاں آنے کا

مقصد صرف اتنا تھا کہ تمہیں یہ سب بتا سکوں تاکہ

تمہیں اپنی ندامت نہ ہو کہ تم نے جس انسان سے

پیار کیا وہ رب کریم کو نہیں ماننا ابرش میں ہمیشہ تمہاری

خوشیاں رب سے مانگوں گا کیونکہ مجھے کوئی ملال نہیں

اس میں بھی اللہ کی بہتری ہوئی اور میں جانتا تھا جدا تو

نہیں ہونا ہے اب تمہیں جانا چاہئے جب تمہارا انتظار

کر رہے ہوں گے۔“

”ہریرہ! میں بھی ہمیشہ تمہارے لئے دعا گو

رہوں گی۔“ اور ابرش نے قدم اندر کی طرف بڑھا

دیئے جہاں اس کے ماں باپ اس کے منتظر تھے

ہریرہ نے بھی قدم اپنی منزل کی طرف بڑھا دیئے اس کے دل میں کوئی ملال کوئی دکھ کوئی پیچھتاوا نہیں تھا کیونکہ وہ اللہ کی رضا میں راضی تھا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆

شہرت لکھٹ

”پاکستان کی مشہور فی میل رائٹرز میں ایک دن

میرا بھی شمار ہوگا یہ جو میں افسانہ لکھ رہی ہوں یہ میری شہرت کا پہلا زینہ ثابت ہوگا۔“ عصفہ چند ہی ثانیوں میں بہت آگے کا سوچنے لگی تھی۔

”میری چار بیٹیاں ہیں میں بھی یہ چاہتی ہوں کہ تم ترقی کرو لیکن تم کب تک سٹاٹ کٹ کا سہارا لیتی رہو گی؟ ایک دن تم پکڑی جاؤ گی ڈائسٹ کے قارئین بہت باریک بینی سے کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تمہارا راز کھلنے کے بعد کوئی بھی اداۃ بھاری کہانی شائع نہیں کرے گا اور ارج کل تو ویسے بھی سوشل میڈیا کے ذریعے ایسی باتیں جنگل میں آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔“ شیرہ نے ممکنہ انکشاف کا اظہار کر دیا تھا۔

”میری بہن یار تم ایسی باتیں کر کے مجھے ڈراتی کیوں ہو؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا میں بڑی مہارت سے یہ کام کروں گی۔“ عصفہ نے بڑے اطمینان کے ساتھ جواب دیا شیرہ عصفہ کی خود اعتمادی پر عالم حیرانی میں گرفتار بیٹھی تھی۔

”السلام علیکم عصفہ! میں نے کل آپ کا افسانہ پڑھا تھا۔“ آدھا سچ“ نجانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ ایسی ہی کہانی میں پہلے بھی پڑھ چکا ہوں اور جس فی میل رائٹر کی یہ کہانی ہے وہ میری فرینڈ لسٹ میں ایڈ بھی ہیں۔“ رائٹر ساحل احمد کی جانب سے موصول ہونے والے اس پیغام سے عصفہ گڑبڑا سی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہو پانی عصفہ نے رائٹر ساحل احمد کو ان فرینڈز کرنے کے بعد بلاک کر دیا عصفہ کی بلاک لسٹ میں فرینڈ لسٹ سے زیادہ آئی ڈیز

موجود ہیں۔

☆☆☆☆

”عصفہ آج تم کالج کیوں نہیں جا رہی ہو؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں میری بیٹی کی؟“ عنادیہ بیگم نے عصفہ کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی کی کہ کہیں اسے بخار نہ ہو۔

”امی جان میں ٹھیک ہوں وہ دراصل میں نے عرصہ کے ساتھ آج پبلک لائبریری جانا ہے تارن میں ایم اے کی ڈگری حاصل کرنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے ناں بس میں اسی سلسلے میں جا رہی ہوں۔“

عصفہ نے تفصیل کے ساتھ ساری بات سمجھا دی تھی۔

”حق جاؤ گی کس کے ساتھ؟“ عنادیہ بیگم عصفہ کے لپٹائیک لے گئے فیصلوں سے پریشان ہو جاتی تھیں۔

”میں لپٹائیک کے ساتھ جانا ہے ہم نے عرصہ تو پہنچ بھی گئی ہے لیکن کوئی ضروری کام نمٹانا تھا دس منٹ تک وہ مجھے لپٹائیک لے جائے گا عصفہ کے پاس ہر بات کا تسلی بخش جواب ہوتا تھا۔“

”مجھے لگتا ہے کہ جیسے آپ نے آنٹی سے کوئی جھوٹ بولا ہے آپ کے چہرے پر سب صاف لکھا ہوا ہے۔“ سلیمان نے اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی عصفہ سے وہ سوال کر ہی دیا جو اسے حیرت میں مبتلا کر رہا تھا۔

”سلیمان آپ تو بچپن سے ہم سب کو جانتے ہیں آپ کا ہمارے گھر آنا جانا بھی ہے آپ قابل بھروسہ ہیں عرصہ نے صبح بتایا مجھے کہ وہ آج اپنی خالہ کے گھر جا رہی ہے جبکہ میرا آج لائبریری جانا بہت ضروری تھا۔“

کہ سلیمان نے اس کا ہاتھ تھام کر تمام شکوے اور کرنے کا ارادہ کر لیا، سلیمان نے عصفہ کو شانوں سے تھام رکھا تھا۔

”میں بہت محبت کرتا ہوں تم سے، میں نے تمہیں تمہارے کزن کے ساتھ مارکیٹ میں دیکھا تھا، مجھے تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب میں تمہارے متعلق اتنا حساس ہو گیا تھا، یہ جتنے دن بھی تمہاری جدائی میں گزارے ہیں مجھے یوں لگتا تھا کہ جیسے مسلسل آگ میں کھڑا ہو کر جل رہا ہوں، مجھے عرشفہ نے بتایا تھا کہ تمہارے کزن کا ایک بار پروپوزل آیا تھا لیکن کچھ وجوہات کی وجہ سے وہاں رشتہ نہیں ہو پایا، تمہارے کزن جمال کو میں بڑے اچھے طریقے سے جانتا ہوں وہ صحیح لڑکا نہیں ہے، میں تو بس یہ چاہتا تھا کہ تمہیں کسی بھی قسم کا نقصان نہ پہنچے، تم خوش رہا کرو پلیز تم پر مسکراہٹ بہت جیتی ہے۔“ سلیمان نے عصفہ کی آنکھوں سے ہستے ہوئے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں کی دوٹی پر جذب کرتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا ہیں آپ نے بھجوائی تھیں ناں؟ عرشفہ نے مجھے بتایا تھا لیکن ایک کتاب پر آپ کا نام لکھا تھا۔“ عصفہ کو اچانک اس کی کتابوں کا تحفہ یاد آ گیا۔ ”جی محترمہ وہ کتاب میرا ہی تھا میں نے سوچا کہ ایک شارٹ کٹ آپ نے لایا ہے جس سے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا پھر ایک شارٹ کٹ میں نے آپ کو دیا کیسا لگا میرا آئیڈیا؟“ سلیمان کے لبوں پر چٹکی مسکراہٹ نے ماحول کو خوشگوار کر دیا تھا۔

”بہت اچھا لگا میں آپ کے اس بہترین عمل کو کبھی فراموش نہ کر پاؤں گی۔“ عصفہ کی آنکھیں اپنی محبت کو سامنے پا کر تمام اداسی بھول گئی تھیں کچھ وقت کی جدائی نے چاہت کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆

بھی وہیں آ جائے۔

☆☆☆☆

عصفہ کی والدہ کے اسکول میں آج عید ملن پارٹی تھی عید سے چند روز قبل ہی تمام بچے رزخوشیوں کو دوبارہ کر لیتے تھیں عناد یہ بیگم نے آج دوپہر چار بجے گھر آنا تھا، عصفہ اپنا افسانہ پڑھنے میں مصروف تھی جو کہ اس بار ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ اک بے نام سی اداسی نے عصفہ کو شاعری کے ہنر سے بھی روشناس کروا دیا تھا، ڈوریل کی آواز سننے کے بعد عصفہ کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی، اسے یوں لگا کہ جیسے وہ سالوں سے اپنی والدہ کا انتظار کر رہی تھی جب دروازہ کھلا تو سامنے عرشفہ کھڑی ہوئی تھی۔

”بے وفا لڑکی یہی ہو، مشرک لڑکے بننے کے بعد تو تم مجھے بھول ہی گئی ہو آج میں لڑکی میں آئی ہوں سلیمان صاحب بھی ساتھ آئے ہیں۔“ سلیمان کو اپنے روبرو کھڑا دیکھ کر عصفہ کو یوں لگا جیسے اس نے بولنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ عصفہ ان دونوں ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔

”آپ دونوں گپ شپ کریں میں تھوڑی دیر میں واپس آ جاؤں گی، کافی دن گزر گئے عصفہ کا کمر نہیں دیکھا ہے میں نے۔“ عرشفہ کے جانے کے بعد اب وہاں صرف عصفہ اور سلیمان موجود تھے۔

”دبی ہے جس نے درد کی دولت اسے میں کیسے بتاؤں؟ تیرا ساتھ ہی تھا میری راحت اب لگتا ہے پاس میرے کم ہے مہلت“ سلیمان نے عصفہ کی نظم کے کچھ شعر پڑھے۔

”میں بری لڑکی ہوں ناں کیوں پڑھتے ہیں آپ میرے الفاظ؟ زندگی کی ہر مشکل میں آپ نے میرا ساتھ نبھایا پھر اچانک نظروں سے اوجھل ہو گئے، آپ جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں۔“ عصفہ یہ کہنے کے بعد ابھی واپس جانے کے لئے چلی ہی تھی

ہے؟ وہ تو گم صم سے ہو گئے ہیں۔“ عرشفہ حقیقت معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔

”یہ تو تم اپنے بھائی سے ہی پوچھو اور دوسری بات یہ ہے کہ میں پبلک لائبریری نہیں گئی میں اب لوگوں کو مزید دھوکہ نہیں دے سکتی ہوں، احساس ندامت نے میرے اندر شکن سی پیدا کر دی ہے میں دوبارہ کبھی بھی کچھ لکھنے کے لئے قلم نہیں اٹھاؤں گی۔“ عصفہ کی آنکھوں کے کنارے ہجک گئے تھے۔

”عصفہ ایسی باتیں تو نہ کرو میں تمہیں دکھی نہیں دیکھ سکتی ہوں، اچھا ٹھیک ہے تم نہیں لکھنا چاہتی ہو تو کچھ وقت کے لئے بے شک نہ لکھو لیکن پڑھ تو سکتی ہو ناں میں تمہارے لئے بہترین کتابوں کا تحفہ لے کر آئی ہوں، ان کا مطالعہ کرو تم یقیناً خود میں ایک واضح تبدیلی محسوس کرو گی، اس طرح لکھنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔“ عرشفہ نے کتابوں سے بھرا بیگ عصفہ کے سامنے رکھ دیا گزرتے وقت کے ساتھ عصفہ کی زندگی بھی بدل رہی تھی اس میں اب کافی حد تک سنجیدگی آئی تھی اس دوران سلیمان ایک بار بھی عصفہ کے سامنے نہیں آئے، عصفہ نے فی اے کے امتحانات میں ٹاپ کیا تھا، جس کی بہمن کی شادی کے بعد گھر میں خاموشی کا راج تھا والد کا بہت عرصہ قبل انتقال ہو گیا تھا والدہ اسکول بچہ نہیں سرکاری نوکری کے باعث زندگی اچھی گزر رہی تھی، پچاسی مالی طور پر مستحکم تھیں یونیورسٹی میں داخلہ لینے سے قبل ایک دن یوں ہی عصفہ نے قلم اٹھانے کی پھر سے ہمت کی لیکن اب کی بار عصفہ نے ایماندار سی سے کام لیا کہانی کا عنوان بنا تھا جسے قارئین نے بے حد پسند کیا، عصفہ کی کھوئی ہوئی خود اعتمادی بحال ہو گئی تھی عرشفہ کی چھوٹی سی فیملی تھی گھر میں بس تین افراد رہائش پذیر تھے وہ سلیمان اور ان کی والدہ شرمین بیگم والدہ کی میں رہتے تھے وہاں کام کے سلسلے میں گئے تھے اور جب کامیابی ملی تو وہیں رہنے کا پروگرام بنالیا، اور اب وہ چاہتے تھے کہ سلیمان

”میں مانتی ہوں میں نے اپنی والدہ سے جھوٹ بولا لیکن آپ پر تو میں آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتی ہوں۔“ عصفہ نے روانی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

”آپ کو کتنے فیصد یقین ہے کہ میں آپ کو پبلک لائبریری ہی لے کر جاؤں گا؟ کہیں اور بھی تو لے کر جاسکتا ہوں۔“ سلیمان نے حاضر جواب لڑکی کو بل بھر کے لئے خاموش کر دیا تھا۔

”سلیمان یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ مجھے آپ سے یہ امید ہرگز نہ تھی۔“ عصفہ کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی نمایاں ہو رہی تھی۔

”میں نے اپنی بات کی ہے جو عموماً لڑکے کسی اکیلی لڑکی کو اپنے دل سے کر کرتے ہیں، میرے نزدیک تو کسی غیر محرم پر بھروسہ کرنا سراسر حماقت ہے۔“ سلیمان نے کسی غلط ارادے سے بچاوت نہیں لی تھی وہ تو بس عصفہ کو اچھے اور برے کے درمیان فرق بتانا چاہتا تھا۔

”سلیمان مجھے اب کہیں نہیں جانا ہے بہت زحمت دی میں نے آپ کو اس کے لئے میں بہت شرمندہ ہوں، مجھے یہیں اتار دیجئے۔“ عصفہ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔

”پلیز عصفہ مجھے معاف کر دیجئے، میرا مقصد آپ کو تکلیف پہنچانا نہیں تھا، آپ کو آپ کے گھر تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے میں سڑک کے چچ آپ کو تنہا چھوڑ کر نہیں جاسکتا ہوں۔“ سلیمان عصفہ کی آنکھوں میں آنسوؤں کی موجودگی سے پریشان ہو گیا تھا باقی کا سفر خاموشی سے طے ہوا۔

☆☆☆☆

”اللہ جانے میرے بھائی کو کیا ہو گیا ہے یا عصفہ سلیمان بھائی ساری رات جاگتے رہے ہیں رات دو بجے بھی میں نے ان کو میرس کے قریب دیکھا اور صبح جگر کی اذائوں کے وقت بھی وہ وہیں تھے اس بجس نے میری نیند بھی اڑادی، تم ہی بتا دو ناں کہ کیا ہوا

شہلا گل سحر صالح

جہیز لگیں اور اعتبار لگیں دو ستر

”تم سے کوئی کام ڈھنگ سے بھی ہوتا ہے یا نہیں۔“ شہیر نے سرخ آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔
”کیوں پھر کیا ہوا؟“ کیونکس پرستاش

لگاتے ہوئے ایشال نے تیلیسی چتون سے اس کی طرف دیکھا مگر پھر دوسرے لمحے لگا ہیں پھیر لیں کہ اسے اپنے کزن کے غصے سے ویسے ہی ڈر لگتا تھا۔
شہیر کا مزاج دوستانہ تھا مگر زرا جو کام اس کی مرضی

کے خلاف ہو جاتا اس کا بی پی شوٹ کر جاتا اور ایصال سدا کی لالہ اور کھنڈری کام سے تو ویسے بھی اس کی جان جاتی تھی۔ تانی اماں کو کہیں جانا ہوتا تو وہ دعا کرنی رہتی کہ شہیر کے لفتنگے دوستوں کی آمد نہ ہو پھر ان کی خاطر رات اسے کرنا پڑتی تھی۔ اور آج بھی اتفاق سے ایسا ہوا تانی اماں کی بیوی کے ساتھ کسی کی مزاج پر سی کے لیے گئی تھیں کہ شہیر کے دوست آگئے۔ ابھی پانچ منٹ پہلے ہی اس کے

چائے لوازمات کے ساتھ بھیجی تھی کہ شہیر سا۔۔۔ دندنا تے ہوئے اس کے سر پر کھڑے ہو گئے۔
”مختصر مدہ! آپ کو سچے سنور نے سے فرصت ملے تو معلوم ہو کہ جس رفتار سے آپ نے چائے میں چینی ڈالی ہے اس سے چینی کا بحران پیدا ہو جائے گا اور ساتھ ساتھ ہم بے چارے بھی بھری جوانی میں شوگر کے مرض کا شکار ہو جائیں گے۔“
شہیر کا غصے کے مارے برا حال تھا۔ دوستوں کے

ناراضی



ریمارکس الگ سے سننے تھے۔

”ویسے یہ شکایت آپ کے لمبی ناک والے دوست عامر رضا نے کی ہوگی۔ ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ وہ زبان سے پکھنے کے بجائے ناک سے ہی سونگھ کر بتا دیتا ہے کہ ذائقہ کیسا ہے؟“ ایثال نے ہنوز اپنے کام میں مصروف رہ کر سکون سے جواب دیا۔ شہیر کو تو گویا پینٹے لگ گئے۔

”تم ڈھیٹ لڑکی ہو کوئی کام تم سے ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔ پورے ڈھنگ پٹنگ فیشن اور موبائل پر گپ شپ لگاتے کے میں آتا ہی کیا ہے۔ تم کو غلطی کا احساس دلانا چاہتا ہوں پھوڑنے کے مترادف ہے۔“ وہ اس کی ڈھنگ پر کھولتا کہتا باہر چلا گیا۔

”ایثال۔“ کمرے میں آئی امی کے شہیر پاؤں دھوئے باہر نکلتے دیکھا تو سنبھلی نظروں سے اسے دیکھا۔

”اوہ ماما! آپ کے یہ لاڈلے ہمارے قومی رہنما سے بہت متاثر ہیں۔ کام کام اور یہ ہی کام جو نہ کر پاتے اس کا جینا کر دے حرام، اور میں پڑوسی ملک کے رہنما سے متاثر ہوں کہ برانہ کو برانہ سنو۔ برانہ دیکھو۔“ ایثال نے مضحکہ انداز میں ایکٹ کیا تو ماما کو ہنسی آگئی۔

☆.....☆

”چھپو آپ بابا سے سفارش کریں کہ مجھے کچھ رقم دیں میں نے کالج کے فیسز ویل کے لیے بوتیک سے اسٹائلش سوٹ اور لاگ شوز لینے ہیں۔“ وہ چھپو کے پاس بیٹھی ان کے پاؤں دبا رہی تھی۔

”مگر گڑیا پچھلے ہفتے ہی تو آپ نے شاپنگ کی تھی۔“

”وہ تو میری فرینڈ کا کالج تھا اس فنکشن میں سب نے میرا سوٹ دیکھ لیا تھا اور میں نے پارٹی کے فنکشنز میں حصہ بھی لیا ہے۔ سب فرینڈ بوتیک

ایٹائل کے سوٹ بنار ہیں ہیں پلیز چھپو۔“ اس نے باجی انداز اپنایا تو چھپو نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

☆.....☆

سراج الحسن کا تعلق سید فیملی سے تھا۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔ ناصر حسین، طاہر حسین اور صائمہ حسین اس خاندان کا المیہ بھی عجیب تھا۔ ناصر حسین کا ایک ہی بیٹا تھا شہیر عباس، میڈیکل فٹ ہونے کے باوجود دونوں میاں بیوی پھر سے والدین کا رتبہ نہ پاسکے۔ طاہر حسین کی بیٹی ایثال کی پیدائش کے بعد ان کی بیوی نامہ خاتون ایسی پیچیدگی کا شکار ہوئی کہ دوبارہ ماں بننے کی سعادت نہ حاصل کر سکیں۔ صائمہ کی شادی رشتے داروں میں ہوئی مگر پانچھ پن کا لیل سچائے چند سالوں کے بعد بھائیوں کے لیے بڑا بھائی بنی اور دوبارہ گھر نہ بسا سکی۔ شہیر اور ایثال ان کی ساری آنکھوں کے تارے تھے اور کچھ اپنی سادہ طبیعت اور سادگی کی وجہ سے بھائیوں کے ساتھ ساتھ بھائیوں کی جتنی بھی نظر تھی۔ اس نے بقیہ زندگی کی خوشیاں اپنے بھائیوں کے لیے ڈھونڈ لی تھیں۔ شہیر عباس ایم بی اے کرنے کے بعد باپ کے ساتھ بزنس سنبھال رہا تھا۔ جب کہ نٹ کھٹ ایثال بی ایس سی فائنل ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی۔ سب کی باہم رضا مندی سے دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا مگر دونوں کو ایک دوسرے سے گویا چڑھی۔ اس رشتے کا تو گویا انہیں احساس بھی نہیں تھا۔ چھپو ایثال کے لیے سسلی بالوں میں تیل ک مساج کر رہی تھیں۔ وہ اپنے تیل پر اپنی فرینڈز کے ساتھ sms میں مصروف تھی۔

”یہ مومنے نیلے پیلے لڑکا کرتم نے اپنے بالوں کا سٹائیاں کر دیا ہے۔ بچپن سے تم بالوں کے ساتھ میں کتنی خواری کر رہی ہو۔“

”پلیز چھپو یہ کلر آج کل بہت ”ان“ ہے۔

میری سب دوستیں کہتی ہیں کہ یہ مجھ پر بہت سوٹ کرتا ہے۔“ ایثال ہنسی۔

”کیا خاک سوٹ کرتا ہے۔ بال ہمیشہ اپنے اصلی رنگ میں اچھے لگتے ہیں سرسوں کے تیل یا گھر بلوٹوٹے بھی ان کی خوبصورتی کا علاج ہیں۔ باقی مصنوعی چیزیں بالوں کی جڑوں کو کمزور کرتی ہیں اور وقت سے پہلے بال بھی سفید ہو جاتے ہیں۔“ چھپو نے اس کو باقاعدہ لکچر دے کر اس کے بال سلجھائے۔

”صائمہ! یہ ہے بیٹا یہ چیزیں وقتی چمک دکھ دیتی ہیں مگر کیمیکلز وجہ سے ان کا رزلٹ اچھا نہیں ہوتا۔“ پاس بیٹھی تائی امی جب جبری کاٹ رہی تھیں گفتگو میں حصہ لیا۔

”امی امی۔“ شہیر آوازیں دیتا ایثال کے جواب ایثال کے منہ میں ہی رہ گیا۔ اس کے ہاتھ جتا رہے تھے۔

”کہ پھر کوئی بات لاٹ صاحب کے مزاج کے خلاف ہوگئی ہے۔ اس نے پیچھے کیا ہوا ہاتھ سامنے کیا تو اس کی شرٹ دیکھ کر ایثال کے ہوش اڑ گئے اور اپنے بھولنے والی عادت پر بھی غصہ آیا۔ اپنی شامت کو اس نے خود ہی آواز دی تھی۔

”یہ کیا ہے؟“ تائی امی نے اس کی جلی ہوئی شرٹ دیکھ کر رعب سے پوچھا۔

”یہ ہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ جلنے کی بو یہ میں آئرن اسٹینڈ کے پاس گیا تو میری شرٹ آئرن کے نیچے مل رہی تھی۔“ اس نے چاچا کر جملہ کیا۔ یہ اس کی فیورٹ اور ہنگی شرٹ تھی۔

”میں پریس کر رہی تھی کہ ایثال نے آکر میری مدد کی کہ کچھ کپڑے میں پریس کر دیتی ہوں مگر بیٹا آپ نے تو پریسنگ مکمل کر لی تھی۔“ تائی امی نے ایثال کی طرف دیکھا جس کا زرد رنگ ہو رہا تھا۔ شہیر کی تو گویا تیوری ہی چڑھ گئی تھی۔

”جی تائی امی! بس ایک ہی شرٹ زنی تھی۔“ لائٹ بھی چلی گئی تھی۔ شاید میں آئرن آف کرنا بھول گئی تھی۔“ ایثال نے شرمندگی سے کہا۔

”اف اس جنگلی بی نے ڈھنگ سے کام کیا ہے اور مجھ سے تو اسے جہنم جہنم کی پر خاش ہے۔ یہ اس نے جان بوجھ کر کیا ہے تاکہ مجھے ٹینشن ہو برائے مہربانی میرے کام اس اجڈ گنوار سے مت کر دیا کریں۔“ شہیر کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا مگر دوسری طرف محترمہ ایثال صاحبہ بھی جس کی رگوں میں اسی خاندان کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے سلجھے بالوں کو بے دردی سے فولڈ کر کے کچر لگایا اور اس کی مد مقابل آگئی۔

”اجڈ گنوار کیسے کہا، غلطی انسان سے ہو جاتی ہے آئے دن تمہارے لیے لگتے دوستوں کی خاطر مدد کرتی ہوں نظر نہیں آتا۔ انتہائی احسان فرائضی ہو۔ تمہاری بیٹیں تو نہیں چرائی ایک شرٹ ہی جلی ہے۔ وہ بھی غلطی سے کون سا تمہاری کٹی شرٹ تھی۔ غرض استعمال سے ویسے بھی بوسیدہ ہوگئی تھی۔ اسے ترمیم ہی چاہیے تھا۔“ کمر پر ہاتھ رکھے وہ باقاعدہ لڑنے لگے۔

”میرے ساتھ بحث کرنے کی کوشش بھی مت کرنا ایک تو چوری اور اوپر سے سینہ زوری۔ بس میری چیزوں سے دس فٹ کے فاصلے پر رہا کرو۔“ شہیر نے اٹھی اٹھا کے وارننگ دی۔

”مجھے بھی کوئی شوق نہیں مفت میں بے گار پالنے کی نوکر نہیں ہوں کسی کی۔“ وہ تن من کرتی کمرے سے چلی گئی۔

”لڑکی نہیں پورا عذاب ہے یہ۔“ شہیر بھی بڑبڑاتا ہوا شرٹ ادھر ہی پھینک کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور چھپو اور تائی امی کا سارا سین دیکھ رہی تھیں کہ جہاں دونوں اکٹھے ہوئے جنگ کا محاذ بن جاتا۔ ایک یورپ تھا تو دوسرا چچم۔ جانے

ان کا ملن کیا رنگ لائے گا۔

☆.....☆

ان کا لاسٹ پریڈ فری تھا۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے فری ہو جانا تھا۔ اس وقت بھی چاروں سر جوڑے فیرویل کے ڈریس کے بارے میں ڈسکس کر رہے تھے۔ موسم سہانا ہو رہا تھا۔ کئی دنوں کے جس کے بعد ابر رحمت جوش میں آگئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی بوند باندی اور تیز جلتی ٹھنڈی ہوا روح کو سکون دے رہی تھی۔

”ہم جولیوں کا کھانا کھا رہے ہیں، ہم جانے کدھر پرواز کریں گے۔ کس ڈال پر ہمارا کھانا ہوگا۔ کچھ دنوں کے بعد ہم کبوتر اپنے ڈار سے بچنے جائیں گے۔“ ماریہ نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ”تو سب کے دل اداس ہو گئے گزشتہ چار برسوں سے ان کا ساتھ تھا۔ ان کا گروپ پورے کالج کا جانا مانا تھا۔“ جب جوان ہوں گے جانے کہاں ہوں گے مگر جہاں ہوں گے فریاد کریں گے تمہیں یاد کریں گے۔“ ماحول سے اداسی کم کرنے کے لیے امین نے اپنی بے سری آواز میں راگ الاپا۔ ”پاٹھوں کی ملکہ! اس کے بعد ہم جوان نہیں بوڑھے ہوں گے۔“ گل رخ نے اسے دھپ رسید کی تو وہ تینوں ہنس پڑیں البتہ ایشال گم سم سی تھی۔ ”کیا بات ہے ایشال؟ بہت کھوٹی کھوٹی سی ہو۔ کہیں پھر سے شہیر سے بھگڑا تو نہیں ہو گیا؟“ امین نے ایشال کو کہنی ماری۔

”نہیں وہ تو معمول ہے۔ بھگڑے کے بغیر انہیں نیند نہیں آتی۔ میرا دل اس لیے خفا ہے کہ تم لوگوں کے بغیر میں بالکل تنہا ہو جاؤں گی تم لوگوں کے ساتھ نے میری بہن کی کمی پوری کر دی تھی۔“ ایشال کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ تینوں اس سے لپٹ گئیں۔

☆.....☆

چھپو کے توسط سے اس نے پایا سے اچھی خاصی رقم ایٹھ لی تھی اور اسی کے ساتھ جا کر بہترین شاپنگ مال سے اس نے پارٹی کے لیے بہت خوب صورت سوٹ اور میچنگ چیزیں لیں تھیں۔ اپنی مطلوبہ چیزیں پاکے وہ بے حد خوش تھی۔ اسے پارٹی میں سب سے منفرد اور پیارا لگنا تھا۔ پارٹی سیکنڈ ٹائم تھی اور اس کو لے جانے کی ذمہ داری پایا نے شہیر کو سونپی تھی جو خلاف توقع اس نے خوشی سے قبول کر لی۔ فنکشن والا ڈریس اس نے پریس کر کے پنگ کیا اور نہانے کے لیے چلی گئی۔ صبح سے اس کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ پڑوس کے پارلر سے اس نے فیش وغیرہ بھی کر دیا تھا۔ شہیر سر درد کی وجہ سے آج گھر پر ہی تھا اور اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ وہ نہا کے بال کھانے کے بعد ڈریس لینے آئی تو مارے دکھ کے اس کی جینس نکل گئیں۔ اس کے ڈریس پر جگہ جگہ ”انکھ کے داغ“ تھے۔ تا صرف شرٹ بلکہ ٹراؤزر اور دوپٹے بھی بچھکاری سے لائن بنی ہوئیں تھیں۔ اس کی پیٹھ پر چھوٹا اور ماما جی اس باخستہ بھاگی آئیں۔ اب وہ زیادہ قتلارو میس کی اور جی بھر کے شہیر کو کوس رہی تھی۔ جو دوست سے ملنے کے بہانے نکل گیا تھا۔ پچھو کے لاکھ اصرار پر کہ کوئی دوسرا سوٹ پہن لو مگر دل جیسے مر گیا تھا۔ وہ بیڈ پر اندھی پڑی روتی رہی اور سیل آف کر دیا کہ وہ کسی فرینڈ سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسے شہیر سے حد درجہ نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ شام کو شہیر کو خوب ڈانٹ پڑی۔ بتایا بونے اسے نیا سوٹ دلانے کا شہیر پر جرمانہ عائد کیا مگر وہ بالکل خاموش رہی۔ اس کا سنا ہوا چہرہ دیکھ کر شہیر کو بھی ندامت ہوئی۔ کھانے کے بعد اس نے اسے روک کر معذرت کرنی چاہی مگر وہ اسے پیچھے دھکیل کر نم آنکھوں سے کمرے میں چلی گئی اور وہ چپ

چاپ اس کی پشت کو دیکھتا رہ گیا۔

☆.....☆

کچھ دنوں کے بعد وہ بھی سب بھول بھال کے نارمل ہو گئی۔ ایگزام کی ڈیٹ شیٹ آتے ہی وہ ایگزیم کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ ایسی گوشہ نشین ہو گئی تھی کہ اس کا کھانا پینا بھی کمرے میں پہنچا دیا جاتا۔ شہیر نے بھی ان دنوں اسے نہیں چھیڑا تھا۔ بی ایس سی کا آخری پریکٹیکل دے کر وہ نکلی۔ موسم ابر آلود ہوا تھا۔ شام کے چھ بن رہے تھے اور بارش ہونے والی تھی۔ کالے بالوں نے تاریکی سی پھیلا دی تھی۔ سڑکوں والوں سے آنکھ پجولی کھیلنے کے بعد تھک ہار کر اس کی آنکھ میں چھپ گیا تھا۔ ایگزام سے فارغ ہونے کے بعد یہ موسم اسے انتہائی سہانا لگ رہا تھا۔ فکر سے آزاد اس کا دل خوشی سے بلا وجہ جھوم رہا تھا۔ منہ بھی بوندیں گویا امرت کا روپ لگ رہیں تھیں مگر اس کی یہ خوشی اس وقت رنچر ہو گئی۔ جب شہیر کو اس نے بانیک سے ٹیک لگائے ہوئے اپنا انتظار کرتے دیکھا۔ اس کے پاؤں من من بھر ہو گئے۔ ”یہ کہاں سے آگیا کوئین کی گولی جیسا کڑوا نہیں کر لے جیسا اور اب پورا راستہ ہدایات کا دفتر کھولے رکھے گا۔ بابا کی گاڑی کو بھی آج ہی خراب ہونا تھا۔“ اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔ ایک دو دفعہ وہ پہلے بھی اس کے ساتھ گئی تھی مگر اس کا تجربہ سخت خراب تھا۔ وہ سو سو احسان جاتا تھا۔

”محترمہ یہ ریمپ نہیں ہے کہ آپ کیٹ واک کرتی ہوئی تشریف لا رہی ہیں بارش ہونے والی ہے گزشتہ آدھے گھنٹے سے خوار ہو رہا ہوں۔ پلیز تشریف رکھیے کہ مجھے اور بھی بہت سے ضروری کام ہیں۔“ لائٹ بلیو کمر کے کلف شدہ کپڑوں میں اکتایا اکتایا بیزار سی سے بولتا آزمائش بن کے اس کے لیے کھڑا تھا۔ مرے مرے قدم اٹھانی اور دل

ہی دل میں اسے کوئی وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے ہنست ہی بانیک ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے اس کا کندھا مضبوطی سے دبوچا ہوا تھا اور آنکھیں خوف سے بند تھیں۔

”محترمہ! میرے کندھے پر ہاتھ ہولا رکھیں۔ یہ آپ کا پہلوان ہاتھ سنے کی طاقت نہیں رکھتا۔“ شہیر نے چلا کر کہا۔ ایک تو رش اوپر سے بارش کی تیز بوندوں نے منٹوں میں ماحول کو جل کھل کر دیا تھا۔ اس نے غصے سے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا مگر ایک جگہ بانیک تھوڑی پھسلی تو پھر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ گھر پہنچ کر اس سے پہلے وہ تیزی سے اندر بھاگی مگر برا ہوا اس کے جوتے کا جس نے عین ٹاکم پر اسے دھوکا دیا اور وہ زمین بوس ہو گئی۔ اس کے پیچھے آتے شہیر نے زبردست قہقہہ لگایا مگر اس کی ہنسی کے مارے اس نے بے ہوش ہی رہنا بہتر سمجھا۔

اور شہیر دماغی چوٹ آئی ہے۔ اس لیے بے ہوش ہو گئی تھی۔ نہیں دیکھو مرنا تو نہیں گئی یہ کاش اپنی غلطیوں کی عافی ہی بانیک لیتا محترمہ سے۔“ اس کی نبض تھامے ہوئے راک تبصرہ کرنے میں مشغول تھا۔ اسے دل ہی دل میں گالیاں دیتی ایشال آنکھیں سختی سے میچیں چاروں شانے چت پڑی تھی۔ شہیر نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تو پلٹنا ہی بھول گئی۔ بیگیا ساسرخ و سفید معصوم چہرہ بڑی بڑی پلکوں کی باڑھ اوڑھے ہرنی جیسی آنکھیں، گلابی لرزتے ہونٹ گلابی عارض ہے پھسلتے بارش کے قطرے اور ہو شرابا سا اس کا پورا سراپا۔ ایک لمحے کے لیے وہ بھٹکا تھا مگر پھر نظریں چراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ حالانکہ وہ اس کی جائز متکود تھی۔ اس نے جلدی خود کو سنبھال لیا۔

”جاؤ پچھو کو بتاؤ کہ ان کی لاڈلی گزر گئی ہے مگر یہ مینڈک جو اس کے قریب آ رہا ہے اس کو تو

پہلے بھاگے۔ وہ خود کے ساتھ بڑبڑایا۔ نشانہ سوا آنے اپنی جگہ پر لگا۔ ایٹال چیختی ہوئی آگئی۔ ارد گرد دیکھا اور پھر ہنستے ہوئے شہیر کی طرف تو شرمندگی کے مارے نزدیک جو ہڑ سے گدلا پانی ہاتھ میں لے کر شہیر پر اچھالا اور اندر بھاگ گئی۔ یہ دیکھے بغیر کہ پانی سیدھا اس کے منہ کے اندر گیا تھا۔ اور وہ تیزی سے واش روم کی طرف بڑھا تھا اسے کوستے ہوئے۔

ایگزیم کے بعد کچھ دن تو آرام کرتے اور کھاتے پیتے گزارتے مگر جلد ہی فراغت نے اسے یور کر دیا۔ بجے کے دن اسے کاٹ کھانے لگے۔

”مما پلیز بابا سے اجازت دلو اور میں اس کے ساتھ ساتھ ہی کوکنگ کلاسز اشارت دیتی ہوں۔ میں دن بھر یور ہوئی رہتی ہوں۔ کچھ سیکھ لوں گی۔“ وہ بھی باس ہوگا اور مجھے سکھڑ بنانے والا آپ کا سہارا بھی حل ہو جائے گا۔“ شہیر نے سنا تو خوب اس کا مذاق اڑایا۔

”لو کی اپنے کورس کے تجربات ہم غریبوں کے معدوں پر نہ آزمائے سم سے ہم بہت معصوم ہیں۔ بھی کسی کا براندہ چاہا۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا اس لیے بطور سزا آپ پلیز بچن میں جانے کی جسارت مت کیجیے گا۔ بھری جوانی میں مرنا مجھے بالکل منظور نہیں۔“ شہیر کی دہائی پر اس نے ترجیحی نظر سے اسے دیکھا اور شن اٹھا کر تاک کر مارا مگر شانہ وہ پہلے ہی تیار تھا اس لیے کشن سے بچنے کے لیے وہ نیچے ہو گیا اور کشن ایٹال کے ماموں زاد عباس کے چہرے پر لگا۔ جو اپنی پچھو سے ملنے آیا تھا۔ اس پر تیاک استقبال پر اس نے تنبیہی نظروں سے ایٹال کو دیکھا تو وہ شہیر کو کھوڑی خانہ لگ رہی تھی۔ مماسے ڈانٹ الگ سنی پڑی تھی۔

”اس شہیر بندر سے سارے بدلے سود سمیت

ناں لیے تو میرا نام بھی ایٹال نہیں۔“ وہ تصور میں شہیر کو تاپا ابو سے ڈانٹ پڑتا دیکھ رہی تھی۔ بس اسے موقع کی تلاش تھی۔ ایٹال کو اجازت ملی تو پڑوس کی نیناں کے ساتھ وہ زرش آئی کے گھر کوکنگ کلاسز لینے جانے لگی۔ زرش کا گھر ان کی گلی سے الگ گلی میں تھا۔ گھر اسٹائش سا تھا۔ ایٹال دچپی سے اس سے سیکھے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے تکی ہی لڑکیوں نے ایڈیشن کروالیا اور ہر گروپ کو روزانہ ڈش سکھائی جاتی تھی۔ ایٹال سیکھ کر گھر جاتی اور پوری دوپہر بنانے کی پریکٹس کرتی۔ اس کی لگن رنگ لائی اور گھر والوں سے خوب داد ملتی۔ سوائے شہیر کے جو سب سے زیادہ کھاتا اور اس کا ریکارڈ لگتا۔ دو ہفتوں میں ہی اس نے کافی کچھ سیکھ لیا۔ شامی کباب، کلس، چکن رول، پیزا اور سو۔ سے بنا کر اس نے فریزر کر لیے۔ تاکہ وقت بے وقت کے مہمانوں کے لیے آسانی ہو۔ مما اور تانی خوش اور مطمئن تھیں کہ کھلندری سی لڑکی نے بچن سنبھال لیا تھا اور وہ بہت خوب صورت اور اسٹائش کھانوں سے بچے لگتا۔

آج اس نے کسی گہنے اور مصالہ بھری بھنڈی بنائی تھی اور اس کے ساتھ ویرہ واٹس ایپ پر اپنی فرینڈ کو بھیجا جانتی تھی مگر براہ واس نیٹ ورک کا جو وقت بے وقت کی لوڈ شیڈنگ کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ وہ میل لے کر بچن سے باہر آئی۔ شہیر تخت پر بیٹھا پچھو کے ساتھ گپ شپ کر رہا تھا اور کیلے بھی کھا رہا تھا۔ اس نے بچن سے شکلی ایٹال کو ایک نظر دیکھا جو میل اوپر اٹھائے اس پر نظریں جمائے تھی۔ ایک لمحے اس کے دل میں خیال کوئدا۔ اس نے کیلا کھا کے چمکا اس کے راستے میں پھینک دیا اور نتیجہ اس کی توقع کے مطابق نکلا۔ نیٹ ورک کے سگنل تلاش کرتی ایٹال کیلے کے چمکے پر دھڑام سے گر گئی۔ شہیر نے زور زور سے ہنسا شروع کر

دیا۔ پچھو نے جلدی سے اس کا پاؤں چپک کیا۔ وہ ٹانگر پر بہت زور سے گری تھی۔ پاؤں اور کمر میں سخت درد ہو رہا تھا۔ اس کی ہیکل آنکھیں دیکھ کر پچھو نے غصے میں گھور کر شہیر کو دیکھا۔ تو وہ جلدی سر بس ہو گیا۔

”سوری پچھو! کہہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ خیر میں تو پانی پینے بچن جا رہا تھا۔ آپ اسے ادھر بٹھا کر پاؤں مالش کر دیں۔“ اس نے ہمدردی جتا کر کہا۔ تو اس نے غصے بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ اور جیسے ہی وہ دیکھ سے گزرا اس نے ٹانگ آگے کر دی اور اب وہ ام سے گرنے کی باری شہیر کی تھی اور ہنسنے کی ایٹال کی اور پچھو بے چاری سر پڑے پاک بھارت کے مجاز پر فخر مند تھے جس کے مستقبل میں ان کی اولاد کس ٹاپ سپر کر والدین کا یہ حال ہے۔

☆.....☆

وہ بچن میں ماش کا اور میں ک حلوہ بنانے کی ریکش کر رہی تھی۔ پورے گھر میں زبردست خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ آج بچن کے وہ جانے کے لیے بادام اور کاجو کاٹ رہی تھی۔

”دو کب چائے اور جو بنائی اشاء فریق میں پڑی ہے فرانی کر کے ڈرائنگ روم میں بھیج دو۔ میرا بیٹ فرینڈ بہت عرصے کے بعد مجھ سے ملنے آیا ہے۔“ شہیر حکم صادر کر کے جا چکا تھا۔ ایٹال کو غصہ آیا۔

”ضرورتاً کہاں ادھر مصروف ہوں گی اس لیے اس نے کہا۔ کام بھی کروانا ہے اور باتیں بھی سناتا ہے۔“ خیر اچانک سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ حلوہ دونوں پیمیل کے مراحل میں تھے۔ اس نے ڈش میں نکال کے انہیں ڈیکوریٹ کیا اور کیتلی میں چائے کا پانی رکھ دیا۔ دوسرے برز پر اس نے فریز شدہ لوازمات فرانی کیے اور شہیر کی دوبارہ

واپسی تک اس نے ٹرائی سارے لوازمات۔۔۔ ریڈی کر لی تھی۔

”واؤ۔“ بچن میں داخل ہوتے شہیر نے سٹائش انداز میں ٹرائی کا جائزہ لیا۔ اس نے ساری چیزوں کو فرانی کرنے کے ساتھ آلوؤں کے پکوڑے بھی بنا لیے تھے اور دو پلیٹوں میں حلوے بھی ڈال دیے تھے۔ شہیر کے جانے کے بعد اس نے اپنی پلیٹ بھی لی جس میں ہر آئٹم کا تھوڑا تھوڑا رکھا تھا اور پیٹی کے لے کر کمرے میں آگئی اور کنڈی لگا دی۔ کان باہر لگے ہوئے تھے۔

”یار تم نے کچھ زیادہ تکلف نہیں کر لیا۔ آنٹی کو تکلیف دی۔“

”ارے نہیں یار امی نے نہیں یہ تمہاری ہونے والی بھائی کی کرامات ہیں۔“ نعمان شہیر کا بچپن کا دوست تھا مگر پھر غم روزگار کے لیے اسے سڈی جانا پڑا۔ بہت عرصے بعد چھٹی پر آیا تو اس نے ملنے چلا

ایا۔ حلوہ اب تمام دیکھ کر شرمندہ ہو رہا تھا۔ ”اوہ بچو! تمہاری بہت سکھڑ ہیں بھائی مبارک ہو۔“ نعمان نے دلی چمک سے لگا کر جیسے ہی منہ میں رکھا۔ کچھ گڑ بڑی۔ مگر جلدی سے چائے کی پیالی منہ کو لگائی گھونٹ تو لگتا سگلی ہو گیا۔ تقریباً ہر چیز کی شکل جتنی زبردست تھی ڈانٹے میں بہت عجیب و غریب تھے۔ اس کے چہرے کے بگڑے زاویے دیکھ کر شہیر کا ماتھا ٹھنکا اور پھر بیڑے کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے کے ساتھ اسے ابکائی آئی۔ کدھر چینی زیادہ کدھر نمک جی بھر کے اٹھایا گیا تھا۔ تو کدھر کالی اور سرخ مرچ کا استعمال زیادہ تھا۔ شہیر کا بارہ ہائی ہو گیا تھا اور غصہ سوا نیزے پر۔ بہت مشکل سے خود کو قابو کر کے اس نے نعمان سے معذرت کی اور بے حد اصرار کے اسے ایک ریسٹورینٹ میں لے گیا۔ ورنہ دل تو کر رہا تھا کہ ایٹال کو جاکے کچا چبا جائے۔ ایٹال بہت ناظم تک

ہنگامے کے انتظار میں رہی اور آخر روم سے باہر آگئی۔ اسنے بڑے واضح کاشمیر کے نوٹس نہ لینے پر اسے سخت تعجب ہوا تھا اور اس کی خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو رہی تھی۔ رات کے کھانے پر اس نے کن انگیوں اسے دیکھا مگر وہ نارمل بات کر کے کھانا کھا رہا تھا۔ البتہ اس ٹائم سے ابھی تک اس کو مخاطب کیا تھا ناں الٹا نام لے کر پکارا تھا مگر اس کی عادات سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔ اس لیے اب اسے اسے محتاط رہنا تھا کہ وہ کسی وقت بھی بدلہ لے سکتا تھا۔

☆.....☆

چند دن سکون سے گزرے تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ گویا اس کی شرارت کو اس نے فائدہ نہیں کیا تھا۔ اس اثناء میں اس کی دوست ماریہ کا نکاح طے ہوا تو ان کا پورا گروپ گرم جوش سے تیاری کرنے لگا۔ بہت دنوں بعد انہیں ایک دوسرے سے ملنا بھی تھا۔ ڈھیروں باتیں کرنی تھیں۔ ایثال نے اپنی شائینگ کرنے کے ساتھ اس کے لیے کرشل کا پیش قیمت گفٹ بھی خریدا تھا۔ وہ بہت ایکساٹینڈھی۔ نکاح والے دن وہ پچھو کے ساتھ نیو بلیو ہال وقت پر پہنچ گئی تھی۔ سب سہیلیاں ایک دوسرے کے ساتھ مل کے بہت خوش تھیں۔ پچھو تو ایک جگہ بیٹھ گئی تھیں وہ اپنے گروپ کے ساتھ دلہن بنی ماریہ کے پاس اسٹج پر چلی گئی۔ لائٹ پر پل ٹکر کی آرگنزا شرٹ اور ٹاجامے میں اس کا سر اپا نمایاں لگ رہا تھا۔ دوپٹہ کنٹراس میں تھا اور باڈ پر ہلکا پھلکا کام تھا۔ نازک سی سینڈل اور میچنگ گلوں والی جیولری پہنے گھنے بالوں کا اسٹائلس جوڑا بنائے وہ کسی کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ اچانک دلہن سے ہٹ کر کسی کے سیل کا رخ اس کی طرف ہو گیا تھا۔ دوہلا دلہن سے چھیڑ چھاڑ کرتی وہ یکسر بے خبر تھی کہ

اس کے ایک ایک نقش اور وجود کے ایک ایک حصے کی ویڈیو بن رہی ہے۔ دلہن کو گفٹ حوالے کر کے وہ اسٹج سے اتر آئی کہ کچھ ٹائم میں کھانا شروع ہونے والا تھا۔ واپسی پر پچھو کے ساتھ جاتے ہوئے وہ خوشی سے چپک رہی تھی اور کسی کی ہوس بھری نظریں ابھی بھی اس پر جمی تھیں۔

☆.....☆

ٹی وی لائونج میں کاؤچ پر لیٹی وہ جینل سرچ کر رہی تھی۔ نزدیک ہی پچھو کروشے کا رومال بنانے میں مصروف تھیں۔ اس نے نزدیک پڑی کا جوکی پلیٹ سے کا جوتا کمرہ میں رکھے اور پچھو کو مخاطب کرنا ہی چاہتی تھی کہ اس کے موبائل پر ایمن کی کال آنے لگی۔ اس نے جلدی سے ریسیو کی۔

”ہال ڈیز کیا حال ہے؟“ وہ چپکی۔

”خیر ہے میں ہوں اپنی ساؤمونی۔“ ایمن نے اسے پھیرا۔ ”کیا وائی میں مسئلہ ہوگئی ہوں؟“ صدے سے اس کی آواز نہیں مل رہی تھی۔ ”تو اور کیا؟ سوئے اور کھانے کے علاوہ کام ہے کیا تمہارا؟“ ایمن ہنوز اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھی۔

دیکھو میرے لیے شہیر بننے کی کوشش مت کرو۔“ ایثال نے منہ پھلا کے کہا۔ ”سوری یار جوک کر رہی تھی۔ خیر تم نے ماریہ کا نوٹویشن دیکھا۔ زبردست اسٹیپ آئی ہیں؟“ ایمن نے جوش سے کہا۔ تمہیں کیسے پتہ؟ کیا تم اس کے گھر گئی تھیں؟“ ایثال نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس نے وائس اپ پر بھیجی تھیں سارے گروپ کو اور۔“

”مگر مجھے تو نہیں سینڈکیں۔“ ایثال نے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

”دراصل وہ تم سے ناراض ہے۔“ اس نے جھپکتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا کیا میں نے؟“ ایثال حیرت سے پوچھا۔

”یار! وہ گھر والوں کے سامنے گفٹس کھول رہی تھی اور جب اس نے تمہارا گفٹ کھولا تو.....“ وہ تھوڑا سارکی۔

”بکو بھی اب۔“ ایثال نے بے چینی سے اسے جھڑکا۔

”دراصل گفٹ تو اس نے بڑے ارمان سے کھولا تھا پر اس سے بڑھ کر ہونے کے مینڈکوں نے پرچھائیں لگا میں تو وہ کرشل کا گفٹ بھی اس کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا اور گھر والوں کے سامنے شرمندگی الگ۔ بقول اس کے تم نے اس کے اسٹیکل ڈے کو پریل فول میں بدل دیا۔“

”اوہ میرے خدا!“ ایثال بے اختیار چیخی اور کمال ڈسکٹ کر کے وہ پچھو کے پاس آئی۔ جنہوں نے ہاتھ روک کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”پچھو! شہیر کے بچے نے میری ناک کٹوا دی جانے کس وقت اس نے گفٹ کار پر کھول کر اس میں مینڈک ڈال دیے۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ اس نے دانت پیستے ہوئے شہیر کو روکنا ہی تصور ہی تصور میں چایا۔

”ایثال بس بہت بچکانہ پن ہو گیا۔ مجازی خدا ہے تمہارا نکاح ہوا ہے تمہارا اس سے بس اب میری بس ہو جاؤ اور یہ بچپنا ختم کرو۔“ پچھو نے اسے لٹاڑا چند لمحوں کے بعد وہ پچھو کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔

”پچھو آپ لوگوں نے میرے ساتھ بہت برا کیا۔ نفرت ہے مجھے شہیر سے ساری عمر مجھے رلائے گا ستائے گا، تنگ کرے گا۔ یہ شخص میرے لیے

وبال جان ہے۔ میری زندگی آپ لوگوں نے تباہ کر دی۔“ زار و قطار روتے ہوئے وہ مسلسل بول رہی تھی۔

”ارے میری چندا میری جان ہمارے ہوتے وہ تمہارے ساتھ ایسا کر سکتا ہے؟ پھیلی کا چھلا بنا کے رکھے گا۔ اور اگر ڈانٹنے کا تو پہلے ہم سب کے سامنے جوابدہ ہوگا۔“ پچھو نے اس کا آسوپو نہتے ہوئے بھلایا۔

”نہیں، نہیں آپ لوگوں نے صرف اپنا مفاد سوچا کہ اگر کوئی لڑکی آئے گی تو شہیر پر قابض ہوگی اور آپ لوگ تمہارا جانیں گے۔ قربانی کا بکرا میں ہی نظر آئی۔ ابھی وہ میرے ساتھ کتنی زیادتی کرتا ہے۔ مذاق اڑاتا ہے۔ ذلیل کرتا ہے کبھی کسی نے کچھ کہا اسے بس میری زندگی اس کے ہاتھوں کھلونا بن کر رہ گیا۔“ وہ روتی ہوئی تن فن کرتی تھی۔ ”میرے کمرے میں چلی گئی۔ پچھو جتنی معنوں میں پریشان ہوئیں کہ بات بہت بڑھ گئی تھی۔ اور ساتھ بدگمانی۔“ ماریہ کی کام سے آئے شہیر کے کانوں نے سب سنا اور غصے سے اس کے دل کو بوجھل کر دیا تھا۔

”hay“ sms کی بہ بی اس نے ایک نظر un known نمبر پر ڈالی اور sms ڈیلیٹ کر دیا اور پھر مطالعے میں مصروف ہوگئی۔

”میڈم ایثال صاحبہ مزاج کیسے ہیں؟“ اسے جھکا لگا۔

”یہ کون ہے جو اسے جانتا ہے۔“ مگر reply پھر بھی نہیں کیا۔ دوسرے لمحے اس کی کتی pic وائس اپ پر جگلائے لگیں۔ ماریہ کے کھانے کے فٹکشن کی اس کی pic تھیں۔ اسٹج پر ہتے ہوئے۔

کھانا کھاتے ہوئے۔ بالوں کو سنوارتے ہوئے بہت زبردست کلوز اپ تھے۔ اس کے تو ہوش اڑ گئے۔ پھر کال آنے لگی۔ اس نے کال اٹینڈ کر لی کہ

یہ کس کا کارنامہ ہے۔

”ہائے سویٹ ہارٹ۔“ دوسری طرف وہ آواز گونگی۔

”کون ہو تم؟“ ایصال نے تڑخ کر کہا۔

”ہم ہیں آپ کے وہ.....“ ایک قہقہہ گونجا تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”مسٹر حد میں رہو۔ آپ مجھے جانتے نہیں ہو۔“ ایصال نے اپنی گھبراہٹ پر ناکام قابو پاتے ہوئے غصے سے کہا۔

”ارے آپ کے حسن کو خراج پیش کرنے کے لیے تو ہم حد سے بھی گزر سکتے ہیں۔“ دوسری طرف بے شرمی اور ڈھٹائی عروں چوکی ایصال نے جھٹ سیل آف کر دیا۔

”اف.....“ اس نے سر ہٹام لیا۔ شہیر نے پورے کھر سے اس کی ناراضی چل رہی تھی۔ ادا

یہی مصیبت۔

”اب اس سے کیسے جان چھوٹے گی۔“ وہ جان چھڑانے کے پلان پر غور کرنے لگی۔ وہ واقعی اس کی جان کو آگیا تھا۔ وقت بے وقت sms یا کانگ۔ اس کی سیل بیٹری ڈاؤن کرنے لگی۔ تب اس نے سیل سائیلنٹ اور آف رکھنا شروع کر دیا کہ اور کوئی حل نہیں تھا۔

☆.....☆

اس کا کانگ کورس ختم ہو چکا تھا اور زلزلہ بھی ان ہی دنوں میں متوقع تھا۔ اس دن صبح ہی صبح کام ختم کر کے وہ نہانے کے لیے گھسی کہ گرمی اپنے عروج پر تھی مگر شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ ایک خوش خبری اور بدخبری ایک ساتھ شدت سے اس کی منتظر تھی۔ نہادھو کروہ باہر نکلی تو کافی فریش تھی۔ لیکن رنگ کا چکن کا سوٹ پہنے وہ بال سلجھانے میں مصروف تھی کہ ہلکی سی دستک سے دروازہ کھلا اور شہیر کود کچھ کر اس کی تیوری چڑھ گئی۔ جلدی سے

بیڈ پر پڑا اور پشہ اوڑھا۔

”کب سے کانگ کر رہا ہوں میں کہاں ہے۔ تمہارا موبائل۔“ اس نے آتے ہی غصے میں اس گھورا۔ بہت دنوں کے بعد وہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ ورنہ ایصال اس واقع کے بعد گوشہ نشین ہو گئی تھی۔

”ایسا کیا کام آپ کا پڑا جو مسلسل کال کر رہے تے میں نے تو تیل نہیں سنی۔“ ایصال نے لٹھ مارنے والے انداز میں کہا۔

”تو تمہارے ناقص خیال کے مطابق میں بکواس کر رہا ہوں۔“ اسے گھورتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل سے اس کا سیل اٹھایا اور جیسے سائنلر سے ہٹایا تو کتنے ہی sms کی بپ بجی۔ ok

بٹن دباتے ہی شہیر کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ایصال بے حیائی سے کسی لڑکی کی بانہوں میں بائیں ڈالے کھڑی تھی اس کے کندھے پر رکھنا تھا۔ شہیر کا تنس تیز ہو گیا۔ اس نے اسکرین ایصال کے سامنے کر کے pic دکھائیں۔

”دو بجے سپر سیل۔“ ایصال کا رنگ فق ہو گیا تھا مگر شہیر کے زمانے دار گھر سے اسے دن تارے دکھادیے۔

”کون ہے یہ بولو۔“ اس کی آنکھوں چنگاریں نکل رہیں تھیں۔

”میں نہیں جانتی رنگ نمبر ہے۔“ اس کی گھسی آواز نکلی۔ تب ایک اور زوردار پھپھر۔ صوفے پر گرگی ہونٹوں سے خون نکل آیا تھا۔

”فیک ہیں یہ pics میں بے گناہ ہوں۔“ چینی۔

”بکواس بند کرو۔“ شہیر نے اس کی دیوچی جب ہنگامہ سن کر پھپھو، تائی اماں اور بی بی میں آئیں۔ اس پر گویا خون سوار تھا۔ پچھلے ایصال کو گلے لگا یا اس کا چہرہ ٹشو سے صاف کیا

نے شہیر کو قابو کیا۔

”اس لیے یہ مجھ سے نفرت کرتی ہے۔ اس لیے مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتی کہ باہر دوسرے کے ساتھ رنگ رلیاں مناتی پھرتی ہے۔“

”شہیر قابو رکھو زبان پر۔“ تائی نے بے ساختہ اٹھے ہوئے ہاتھ کوروکا۔

”تو پھر یہ کیا ہے؟“ تصویریں دیکھ کر تینوں عورتیں ششدر رہ گئیں۔

”ایصال.....“ شہیر کی نظریں اس پر تھیں تو وہ زمین میں گر گئی۔ شہیر کو تائی سمجھتے ہوئے باہر لے گئیں اور شہیر سیل بھی سامنے لے گیا۔ وہ پھپھو سے چوکی تھر تھر کانپ رہی تھی جسے پھول سے تاج پہنوا گیا تھا آج شہیر نے اسے نفرت اور شک کے طعنے لگائے تھے گویا زعمہ قبر میں اتار دیا تھا۔

☆.....☆

بات بڑوں تک پہنچ گئی تھی مگر ہنوز خاموشی تھی۔ اس کا کھانا پینا کمرے تک محدود تھا۔ اس کے گھر سے کی ویرانی پھپھو کو اندر تک دھکی کر رہی تھی۔

لوڈن بعد خوب ماتم کرنے کے بعد رات کے کسی گھر وہ باہر نکلی تو شہیر لان میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کا دل جیسے رو رہا تھا۔ بے اعتباری کا دکھ اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ اس کا وجود اندر ہی اندر تجسم ہو رہا تھا۔ اپنوں کی بے اعتباری اور بے اعتنائی نے اسے توڑ پھوڑ دیا تھا مگر یہ اعتبار اس نے واپس قائم کرنا تھا۔ سو بہت سے قدم اٹھاتے وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئی جس کی بیانی اسے دیکھ کر شکن آلود ہو گئی تھی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے۔“ سنائے میں اس کی آواز گونگی شہیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”نکلن آلود میلے کپڑے کھرے بال سو جی آکھیں، بے رونق چہرہ اور سپاٹ آواز ایک لمحے کو اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”مگر وہ سب؟“ دل میں بدگمانی کے کانٹے پھر سے اگ آئے۔

”میرا سیل دو۔“ اس نے ہاتھ پھیلا لیا۔

”کیوں کوئی کسر اور باقی ہے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں گویا ہوا۔

”ابھی پتہ چل جائے گا سیل دو۔“ وہ بضد تھی۔ جانے کیا سوچ کر شہیر نے اسے سیل دیا۔ تب اسی کے پاس کھڑے ہو کر اس نے کال ملائی اور اسپیکر آن کر دیا۔

”ہیلو محترمہ ایصال صاحبہ از بے نصیب، زہے نصیب کہ آپ نے ہمیں یاد کیا۔“ دوسری طرف لوفرائے آواز گونگی۔

”میرا نمبر اور تصویریں آپ کے پاس کیسے آئیں۔“

”ارے ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ آپ کی فرینڈ کے نکاح میں، میں نے pics بنائی تھیں۔ بہت شاندار لگ رہی تھیں۔ تم خدا کی پوری آفت منوں میں یہ بیان خراب کر دیتی ہو۔“ وہ پڑی سے اتر رہا تھا۔

”اور میک پکچر کیوں لہجواں؟“ اس نے جلدی سے بات کا لی۔

یارتہم لفٹ ہی نہیں کرا وہی تھیں۔ اکثر سیل آف ہوتا تھا۔ مجبوری تھی۔ دیکھو ایک بار مجھ سے ملنے آ جاؤ نزدیکی پارک پھر تنگ نہیں کروں گا۔“

”اور نہ آؤں تو۔“ اس نے بات کا لی۔

”تو ایسی بے ہودہ فیک وڈیو سٹل میڈیا پر بھی ڈاؤن لوڈ ہو سکتی ہے۔“ وہ خباثت سے ہنسا۔ اس نے شہیر کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے کل 5 بجے میں چلڈرن پارک آؤں گی مگر میں تمہیں پہچانوں گی کیسے؟“

”اس کی فکر مت کرو میں خود ہی تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“ دوسری طرف خوشی سے معمور آواز

سنائی دی۔ ایصال نے کال کاٹ دی اور سائیکس کھڑے شہیر کے ہاتھ میں سیل تھمایا اور اسے کمرے کی طرف پلٹ گئی۔ کمرے میں آکر بیڈ پر گر کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

”انتا پالا لپسا اتنے سب کے قریب رہی۔ میری ہر پسند ناپسند سے باخبر ہے میری زندگی اس کے سامنے کھلی کتاب ہے پھر بھی صرف ایک بے اعتباری کے کنگڑے اس پر سے اعتماد کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ ایک کی نگاہوں میں شکوہ تھا۔ اور لب خاموش اور شہیر نے اس کے زندہ وجود کو مردہ کر دیا تھا۔ روح تک اس کے گفتگوں سے چھٹی ہو گئی تھی۔ لفظ آشنا نے تو اسے زہر قہر میں گاڑ دیا تھا۔

☆.....☆

دوسرے دن وہ معمول کے مطابق نہادھ کے باہر آئی۔ ممانے خاموشی سے ناشہ اس کے سامنے رکھا مگر اس نے فریج سے بریڈ نکال کے جیم لگایا اور بغیر چائے کے کھانے لگی۔ پچھو کا دل تڑپ اٹھا۔ ان کی لاڈلی ایسا ناشہ کب کرنی تھی۔ تب باہر لان میں آکے وہ مینا کے پیچھے کے پاس آکھڑی ہوئی۔ خوب صورت سی مینا ادھر ادھر پھرنے لگی۔

”یہ مردوں کا معاشرہ ایسے ہی عورتوں کو اپنے روایات کی قفس میں قید رکھتا ہے اور اپنی سن مانی سے اس کو اپنی خواہشات کا قیدی بنا کے رکھتا ہے۔“ بی ایس سی میں A+ گریڈ نے بھی اسے کوئی خوشی نہ دی۔ ورنہ اس نے کتنا سوچا تھا اور اس دن شہیر اس کا رزلٹ بتانے کے لیے ہی کال کر رہا تھا کہ وہ ہولناک حادثہ ہو گیا۔ جو اس کی زندگی کی ساری رعنائی کو تاریکی میں بدل گیا تھا۔

☆.....☆

صبح سے اسے شام کا سخت انتظار تھا۔ وہ اللہ

تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔ ایسے فنکشنز پر جانے سے اس نے توبہ کر لی تھی۔ جہاں لڑکیاں شگے سر تیار ہو کر مردوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہیں اور جہاں اہلیس کے طور طریقے ہوں وہاں گناہ کا جنم لینا اور غیر شرعی رشتوں کا قائم ہونا لازم و ملزوم ہوتا ہے۔ اس میں اس کی بھی غلطی تھی کہ وہ ہر ہتھیار سے لیس ہو کر گئی تھی اور کتنی ہی ہوس بھری نظروں نے اس کے چہرے اور وجود کو آلودہ کیا ہوگا پھوٹ پھوٹ کر وہ رو رہی تھی۔

☆.....☆

شام تک سب کا رویہ اس کی توقع کے مطابق تھا۔ ہر کوئی اپنی بدگمانی کا دوا کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ گویا پتھری ہو گئی تھی۔ سورج ڈوبنے کا منظر اسے دیکھ کر بھی بہت پسند تھا۔ ٹیس پر وہ کرسی پر براجمان تھا شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ روشنی پرستوں کی حالت آری تھی مگر چند لمحوں بعد جب آکاش پر کچھ اندازے ستاروں کے جھرمٹ سمیت قبضہ کرنے کا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو سکا تھا۔ گی۔ رب کریم کو روشنی اور نیکی دونوں پسند ہیں۔ تاریکی اور گناہ دونوں ناپسند ہیں۔ یہ تاریکی تو ایک آزمائش ہے اور یہ آزمائش اس کی زندگی میں بھی آئی تھی مگر سچائی کی روشنی نے اس بدگمانی کی تاریکی کو تار دیر تک نہیں دیا تھا۔ شہیر اسے ڈھونڈتا ہوا چھت پر آیا۔ تو وہ فضا میں نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ شاید اپنی بے گناہی جو ثابت بھی ہو چکی تھی۔ وہ لڑکا اس کی دوست ماریہ کا کزن تھا۔ جس کا کام فیک پیکر ز اور وڈیو بنا کے لڑکیوں کو بلیک سیل کرنا اور اپنی ہوس پوری کرنا تھا اور جو شہیر اور اس کے دوست ایس پی ایاز کے زیرِ لیے کیفر کردار تک پہنچ چکا تھا اور اس واقعے نے شہیر کو اندر تک جھنجھوڑ دیا تھا۔ ایصال اس کے لیے کیا تھی اب اس کی سمجھ میں

آیا تھا۔ اس کی محبت پورے فتنے لے کر بیدار ہوئی تھی۔ وہ بچے تلے قدم اٹھاتا ایصال کے پاس آ گیا۔ اپنے سامنے اسے دیکھ کر وہ جھٹکے سے نیچے جانے کے لیے اٹھی مگر وہ ہاتھ جوڑ کر اس کے سامنے ایسے کھڑا ہو گیا۔ اس کے جانے کی ساری راہیں مسدود ہو گئیں تھیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر اپنی متاعِ حیات کو دیکھا پر اس نے ناراضی میں کتنا غم کیا تھا۔ اس کے بند ہاتھوں پر ایصال کے آنسو ٹپ ٹپ برس رہے تھے۔ شہیر نے تڑپ کر اس کے آنسو صاف کر کے ایک دوسرے کو ستانے والے اور چڑانے والوں کو مل و تھق کے بعد ہی ادراک ہوا تھا کہ وہ کس قدر ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ شہیر نے خاص جملے کے تحت اسے قریب کیا تو اس کے کندھے سے لگ کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”کندی لڑکی میری ساری شرٹ گئی۔“ اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ سوسوس کرتی پیچھے ہٹ گئی۔ لب خاموش تھے مگر دل نے دل کو بے چینی کی ساری داستان سنا دی تھی۔ کہ ایصال کے ساتھ ساتھ وہ بھی تو سلگتا تھا تڑپا تھا۔ کئی بار اپنے ہاتھوں کو لائٹ سے جلانے کی کوشش کی جس سے اس کے پھول جیسے چہرے پر پھپر لگائے تھے۔ آنسوؤں نے ساری کشافوں کو دھو ڈالا تھا۔ ”سوری“ شہیر نے کان میں سرگوشی کی تو اس نے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کے لہجے میں سر بلایا۔

”کیا زخموں پر پیار کا مرہم رکھنے کی اجازت ہے۔“ اس کے نزدیک سے سرگوشی ہوئی۔ ”نہیں بالکل نہیں۔“ وہ بدک کر پیچھے ہٹی تو شہیر نے بے ساختہ ہتھ پر لگایا اور پھر جیب سے مٹی ڈبیہ نکال کے اس کی طرف بڑھائی مگر وہ اب بھی مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی کہ کچھ عرصہ

پہلے اس کی ساگرہ پر شہیر نے خوب صورت بیانیات میں اسے تھم دیا تھا۔ جسے اس نے بے چینی سے کھولا تو ایک زندہ کاروچ نے اس پر چلا ٹنگ لگائی اور گھر اس کی چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ شہیر نے اسے شش بچ میں دیکھ کر ڈبیہ کھولی تو ایصال فاصلے پر کھڑی ہو گئی جیسے خود شش بچہ والا ہو مگر اندر سے اسٹامش گولڈ کی چین تھی۔ جسے شہیر نے بڑے پیار سے اس کی گردن کی زینت بنا دیا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور چہرہ لودینے لگا۔ اس نے اس کا ہاتھ نرمی سے تھاما اور ہاتھ پکڑ کر نیچے اترنے لگا۔ تاریکی اور خاموشی بتا رہی تھی کہ لائٹ نہیں ہے وہ اسے لے کے سیدھا لان کی طرف آ گیا۔ جہاں چھوٹے چھوٹے برقی قندیلوں سے بہت شاندار روشنی کی گئی تھی اور سامنے ٹیبل پر بڑا سا کیک بڑا تھا۔ جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ سب کے ہاتھ اسے بھلے لگ رہے تھے کہ لاکھ چاہتے تھے باوجود بھی انسان اپنے چاہنے والوں سے کدورت نہیں بٹا سکتا۔ سب نے گا کر اسے ساگرہ اور کامیابی کی میلہ کباد دی اور تحائف دیے۔ رات کی رانی کی خوشی سے ہارے ماحول کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ایک کاٹ کے اس نے سب کو کھلایا۔ شہیر کو کھلانے کے بعد اس نے باقی کا پیس اس کی طرف بڑھایا جیسے ہی اس نے منہ کھولا اس نے چوٹی نکال کر اس کے منہ میں دے دی۔ ایک زبردست ہتھ پڑا۔

”پھپھو!“ اس نے منہ بسورا۔ اور دوسرا کلکڑا لے کر کریم شہیر کے چہرے پر لگا دی۔ گویا سدھرنا دونوں کے بس کی بات نہیں تھی مگر دور آکاش میں چمکنے والے چاند نے سب کے آسودہ چہرے دیکھے۔ جن کی چمک اس کے ستاروں سے کئی زیادہ تھی۔ یہ چمک محبت اور اتفاق کی تھی۔

☆.....☆

نئے سے ملے

روشنی نے آہ سرد خارج کرتے ہوئے منیر
نیازی کا شعری مجموعہ ایک طرف رکھا، آنکھوں سے
سنہری فریم والا نازک سا چشمہ اتار کر شعری
مجموعے پر رکھ کر اس نے انگلیوں کی پوروں سے
نزاکت سے آنکھوں کو ہلکا سا دبایا، گزشتہ ایک
سال سے بینائی دھندلا رہی تھی۔
پانچ چھ منٹ بعد وہ منیر کے کمرے کے پاس
آکھڑی ہوئی میز کی دروازے سے سرخ رنگ کا بال پین
نکال کر کلینڈر پر درج 6 نومبر کے گزشتہ دن کا
کی آنکھوں کے گوشے نم ہو چکے تھے۔
”20 برس“ وہ ہولے سے بولی۔
”میں برس کافی ہوتے ہیں کسی کو بھلانے کے
لئے، مگر نہ جانے کیوں نواس مزاری یادداشت سے محو
نہیں ہوئے خاصے ڈھیٹ ہیں آپ“ کہہ کر وہ
دھیرے سے مسکرا دی، خاصی بھیگی ہوئی مسکان تھی یا
کہ فقط مسکان کا شائبہ تھا۔ چند لمحے کمرے میں بے
مقصد ٹہلنے کے بعد وہ ریڈ بال پین کو دیکھتے ہوئے
سنگھار میز کے سامنے آرکی۔

”ابھی اس بال پین میں سات آٹھ نقطے باقی
ہیں، یعنی مزید سات آٹھ سال تک یہ چل سکتی ہے ان
سات آٹھ سالوں میں آنے والے ہر 6 نومبر کو سات
آٹھ دائرے تو بن سکتے ہیں یاد ہے نواز مزاری میری
نوٹ بک پر آٹو گراف دے کر آپ نے یہ بال پین
مجھے عنایت کر دیا تھا، دیکھیں ابھی تک سنبھال کر رکھا
ہے اور آپ کی ڈیٹ آف برتھ کو مارک کرنے کے سوا
کوئی دوسرا کام نہیں لیا ہے، مگر کیا خبر آپ کو یاد بھی ہے

یا نہیں۔ روشنی سراج نامی کوئی پاگل سی لڑکی۔ اب کی
بار روشنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر ہونٹوں کو بھگا
گئے اس نے نظر اٹھا کر آئینے میں اپنا عکس دیکھا، شگن
آلود ساڑھی بے دلی سے کیا گیا جوڑا، کالے بالوں
میں واضح طور پر جھلک دکھاتے ہوئے سفید بال اور
آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے۔ گردن پر بڑی ہلکی ہلکی
جھریاں تھیں ”روشنی سراج“ اس نے آئینے میں اپنی
گہری بھوری آنکھوں کو بغور دیکھا، جن کی نم سراج پر
ایک عکس آج بھی زندہ تیر رہا تھا۔

”میری آنکھیں بوڑھی ہو گئی ہیں نواس مزاری
مگر آپ کا عکس آج بھی جوان ہے کیا معلوم آپ
بچے دیتے ہوں گے۔“ اس نے اپنے پیٹڈ بیگ میں
سے اپنی تصویر کو عقیدت کے ساتھ سینے سے
لگایا، آنکھوں کے دھڑکنے کی تصویر کو چوم رہی تھیں روشنی
سراج کی رنگت بھی، مگر اس کے دل سے بہت حیا آتی
گویا نواس مزاری سامنے موجود ہیں۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو میری جان۔“ اس نے
آنکھیں موند لیں اور آنسوؤں کے بندھول دیئے۔

☆☆☆☆

نواس مزاری نے بڑی امید کے ساتھ ان باکس
کھولا، مختلف لوگوں کی طرف سے بھیجے گئے سالگرہ
مبارک کے میسجیوں پیغامات موجود تھے لیکن روشنی
سراج کا پیغام نادر تھا۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے
ہر سال کی طرح اس کا نمبر ملایا، اور سال کے ہر
6 نومبر کی طرح ہی نمبر بند تھا وہ ہر 6 نومبر کو غبارت
والی کے نام سے سیونمبر کو ڈائل کرتے تھے 6 نومبر

سے پہلے گویا یہ نسر ملنا 'حرام' تھا، انہوں نے تنہی کے ساتھ اسکرین کو دیکھا اور رانگ چپڑ پر جھولنے لگے پھر ایک خیال کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے چند ثانیے بھر ہی سانسوں کو یکجا کرنے میں لگے۔ کمرے کے ایک طرف دیوار گیر چھوٹی سی الماری کا لاک کھولتے ہوئے دل میں یس کی جاگ اٹھی۔

”دیکھو غبارے والی میں نے تمہارے دیئے گئے ہر تھکے کو سنبھال کر رکھا ہے یہ تحائف میری متاع ہیں اور مجھے زمانے بھر کی دولت سے زیادہ عزیز ہیں تمہاری یادوں کے یہ خزانے ہمیشہ میرے پاس محفوظ رہیں گے۔“ انہوں نے خود کلائی کرتے ہوئے چھوٹے بڑے تحائف کو ترتیب دی جن میں چھوٹی سی باری ڈول ڈرم بجانا کا گھٹا، گاڑی، ٹوتھ برش، فیڈر، ربیزر، بھالو اور اسپانڈر مین نوآپے شائع تھے، ان کی نظر سیریلیک کے پیک پر پڑی، ہلکی سی کمرہ میں ہونٹوں کا احاطہ کر لیا، پیک کے نیچے موجود چھوٹی سرچٹ پر یہ چند جملے جگمگا رہے تھے۔

”ٹھوس‘ غدا‘ میں پہلا قدم‘ نیپلے سیریلیک بڑے پیٹ کی کٹھی غذا ہا ہا ہا۔“ انہوں نے آہستگی کے ساتھ اپنی کچھ بڑھی ہوئی ٹوند پر ہاتھ پھیرا آنکھوں کے گوشے ہبک گئے آج سے 20 برس قبل بھی ان کی ٹوند کچھ بڑھی ہوئی تھی جو دیکھنے میں بد نما نہیں لگتی تھی بلکہ وہ کچھ اور گول مثول دکھتے تھے۔

”میرے گول گپے جیسے نواس۔“ ”میرے آلو بخارے جیسے نواس۔“ ”مائی کل لیمب‘ سفید‘ سفید‘ نرم کالی آنکھوں والے‘ ملائم بالوں والے‘ چھوٹے سے سمنے۔“ ڈھیروں القاب ایک دم ساعتوں میں گونجے تھے انہوں نے ہاتھ میں پکڑا، جھنجھٹا، کونے میں رکھا اور زیر لب بڑبڑائے۔

”اب اور کتنا زمانہ لگے گا ملنے میں سراج کچھ تیری تحریر سے نہیں ملتے۔“

☆☆☆☆

”کیا؟“ میونہ مزاری نے حیرت سے نواس مزاری کو دیکھا۔

”نواس تم نے بھائی ہوش و حواس یہ فیصلہ کیا ہے ناں کیا واقعی تم سراج احمد کی بیٹی سے شادی کرنے میں سیریس ہو؟“

”آف کورس مام! اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے مجھے روشنی سراج سے محبت ہوگئی ہے۔“ وہ نہایت آرام سے کہہ کر ماں کے تاثرات جاچنے لگا جو خاصے ناگوار تھے۔

”محبت۔“ وہ جیسے صدے کے زیر اثر بولیں۔

”نواس! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے، میرا بھی اپنی بہو کے حوالے سے ایک آئیڈیل ہے اور تم میرے اکلوتے بیٹے میرے آئیڈیلزم پر پانی پھیر رہے ہو روشنی سراج سے تمہاری شادی کم از کم میری زندگی میں نہیں ہو سکتی مجھے مزید کچھ کہنے پر مجبور نہ کرو۔“

”کیوں ماما؟“ اب کی بار حیران ہونے کی بجائے نواس مزاری کی تھی۔

”نواس! سراج میرا آئیڈیل ہے اور بہت اچھی لڑکی ہے۔“

”نف ہے تمہارے آئیڈیل پر کیا ہے آخر روشنی سراج میں ماسوائے نا کے وہ بھی اس کے سرائے سے میل نہیں کھاتا، سالو کی سی عام نقوش کی حامل کم عمری لڑکی تمہیں اتنی پسند آگئی ہے کہ مجھ سے اختلاف کرنے لگے ہو ٹھیک ہے وہ تمہاری دوست ہے، لیکن وہ شریک سفر کے خانے میں فٹ نہیں بیٹھتی یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔“ میونہ مزاری نے برہمی سے نواس کو ڈانٹا۔

”مگر ماما۔“ وہ لاچار سی بولا۔

”اگر مگر کچھ نہیں میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا، میں آئندہ اس موضوع پر بات کرنا پسند نہیں کروں گی اور تم جاننے ہو میں جو فیصلہ کر لیتی ہوں اسے بدلہ نہیں

تی۔“ انہوں نے حتمی بات کی۔

”تو پھر ٹھیک ہے میں روشنی سراج کے علاوہ کسی شادی نہیں کروں گا، اگر روشنی سراج اس گھر میں آئے گی تو میں عمر بھر کنوارہ رہوں گا۔“ نواس لڑکی کا اٹل لہجہ ان کو پیش دلا گیا۔

”مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟“

”نہیں آپ کی خواہش کا احترام کر رہا ہوں اپنا لہو بتا رہا ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”میری خواہش کا احترام۔“ انہوں نے سوالیہ لہجہ میں ابرو چڑھائے۔

”عمر بھر کنوارہ رہنے کا فیصلہ کر کے بہت ناگوار داری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔“

”کیونکہ روشنی سراج میری زندگی ہے اور آپ کو میری زندگی منظور نہیں ہے اور مجھے زندگی کے سوا کچھ منظور نہیں ہے اگر زندگی کے سوا کوئی اور ہے تو وہ صرف موت ہے، صرف موت اور میں اس سے بے خوف ہوں مجھے معاف کر دیجئے گا۔“ اس کا لہجہ بھائی ٹوٹا ہوا تھا۔

”ہوں! اگر تمہیں اپنی دنیا بانی ہے تو اس گھر سے نکل جاؤ اور اپنی زندگی کو پالو، آسائش، لائف سٹائل، کولت مار کر جب عملی زندگی میں قدم رکھو گے تو روشنی کا بھوت اتر جائے گا لیکن اگر اس گھر میں رہنا ہے تو روشنی سراج سے ہٹ کر کچھ سوچنا پڑے گا۔“ وہ نہایت رسان سے کہہ کر نواس کے باب کی منتظر ہوئیں۔

”مجھے اگر زندگی کو پانے کے لئے شان و شوکت، خیر باد کہنا پڑا تو یقیناً ماننے چھوڑ دوں گا اور کبھی مٹاؤں گا نہیں، لیکن مجھے معلوم ہے روشنی سراج مجھے کی طرح سے بھی قبول نہیں کرے گی اور نہ ہی میں کسی محبت کو گناہ کی طرح حاصل کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں، اگر خدا نے اسے میرے نصیب میں لکھا ہے تو لگے کی چوٹ پر دھوم دھام سے اسے اپنی دلہن

بناؤں گا کسی ثواب کی طرح، ورنہ کنوارہ ہی رہوں گا اور مبارک ہو آپ کی انا کا پرچم سر بلند ہی رہے گا، معمولی سا جواز آپ کو سنگین مسئلہ نظر آ رہا ہے مگر نہیں اصل مسئلہ تو آپ کی انا کا ہے۔“ نواس مزاری نے اپنے آنسوؤں کو ہنسنے کا شکل روکا تھا۔

”تم جو بھی سمجھو، لیکن اگر میری خواہش پوری نہیں ہوتی تو روشنی سراج کو بھی نہیں پاسکو گے۔“ وہ تحمل کا غیر معمولی مظاہرہ کر رہی تھیں۔

”جیسا آپ کہہ رہی ہیں مام! ایسا ہی ہوگا روشنی سراج کبھی آپ کی بہو نہیں بنے گی اور جیسا میں چاہتا ہوں ویسا ہی ہوگا روشنی سراج کے علاوہ کوئی لڑکی میری بیوی نہیں بنے گی، دیش اس۔“ وہ کہہ کر رکنا نہیں تھا روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا، کمرے کے باہر کھڑی روشنی سراج قدموں کی آہٹ پا کر جلدی سے ہٹ گئی تھی تیز تیز قدم اٹھاتی وہ اس عالیشان محل سے نکل جانا چاہتی تھی۔

”روشنی۔“ نواس مزاری نے اسے دیاؤ لگی سے پکارا تھا، گھر پہلٹ کر دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

☆☆☆☆

پورے دو دن بعد روشنی سراج نواس مزاری کے روبرو تھی ہمیشہ کی طرح شوخ، لیکن اس مرتبہ اس کی تمام شوخیاں نواس مزاری کی اداکاری سے کم نہیں لگ رہی تھیں۔

”دودن سے میل کیوں آف تھا، گھر گیا تو پتہ چلا کالج ٹرپ کے ساتھ گئی ہوئی ہو۔“ وہ ناراضی سے بولا۔

”تو اس میں جھوٹ کیا ہے، ہم ساری کلاس شمالی علاقہ جات کی سیر کو گئے ہوئے تھے۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا اور ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے روشنی سراج کی وہائٹ لوگ سے بچی ہوئی چھوٹی سی ناک پھیل گئی تھی نواس مزاری کا دل چاہا وہ اس کی ناک کو زور سے دبا کر کہے ”چھینی“ مگر اس نے اپنی خواہش کو موقوف کر دیا اور محل کر بولا۔

”ویساں گنل پر ایلیم ہوگی ہے ناں؟“ وہ کھلکھلا
ہنس دی تھی۔
”ہاں۔“

سے سرائیا یا سانو لاسلو ناچہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔
 ”بہت برے ہیں آپ خبردار! جو آئندہ ایسا ہو
 ہو بڑے نواس بنے پھرتے ہیں۔“ وہ تڑپ ا
 بولی۔ ایک پل میں بہت بڑا از آشکار ہو گیا تھا نواس
 مزاری ہو لے سے ہیکل ہنسی ہنس دیا۔

فریادوں کی دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور وہ آپ
فرزند کی میں لے کر مسلسل کرب نہیں جھیل
لے جبکہ ان کی عمر اب صدمات سہنے کے قابل
نہیں رہی، انہیں انگریزوں سے سخت نفرت
ہے۔ اس کے لہجے سے کھوکھلا پن اور جھوٹ
بڑھ چکا ہے۔

آپ کو اور خود کو مزید کمزور کر دوں یہ ظاہر کر دوں ا۔
دل شکنی کر چپوں میں بٹا ہوا ہے، نہیں میں ایسا نہیں
چاہتی نواس زندہ تو رہنا پڑے گا اپنوں کے لئے مگر
بچی ہاں مگر بھی زندہ رہنا پڑے گا، کمال ضبط
کے باوجود آج تک لہجہ لہجہ بھیگ رہی تھیں روشنی
سراج کے گھونگرہ یا لے لے لے دیاں بال سرکش ہوانے
کھول دیئے تھے جامد خاموش تھی وہ ساکت بیٹھا
تھا، اور یہ کہ نہ بابا تھا۔

جانے کیوں اچانک ہی دل گھبرایا تھا، وہ بسزے...
انھہ کھڑے ہوئے۔

”چل نواس مزاری آج شہر چارہ گراں کی سیر کر لے دیکھ کاب یہ کہوچے اور بازار کیسے دکھتے ہیں“
”پھڑے ہوئے لوگوں کا سراغ ڈھونڈ لے۔ ایک تازہ عزم نے وجود میں پھریری بھردی تھی، چندرہ منٹ میں وہ شاور لے کر ڈریس اپ ہو گئے اور اب ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بالوں میں میز پرش کر رہے تھے نرم و ملائم سیاہ بالوں میں سفیدی چھلکنے لگی تھی کچھ بال کشادہ پیشانی پہ آنکھ پرے تھے۔“

”کاش میرے بال آپ کے بالوں کی طرح سیدھے اور سلی ہوتے۔“ کسی یاد نے دامن پکڑا، وہ ہولے سے منکائے اور نازک فریم والا چشمہ آنکھوں پر لگایا، کپڑوں پر پرفیم اسپرے کرتے ہوئے انہیں کچھ اور یاد آیا۔

”نواس مزاری کہاں ہیں آپ میرا دل اداس ہے۔“ وہ فون پر روتے ہوئے بولی تھی۔

”دراستی کسی کام سے شہر سے باہر آیا ہوں، کچھ دن لگ جائیں گے، تم فون بند کرو میں اس وقت بڑی ہوں۔“ انہوں نے فون پر لکھے میں بات مکمل کی۔

”آپ تو ہر وقت بڑی ہوتے ہیں، کسی دن مرگئی ناں تو جنازہ پڑھنے کی فرصت بھی ہوگی۔“ پاس۔

”شٹ اپ۔“ وہ غصے سے بھیڑ بولے۔

”میں اس وقت فضول باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، ہر وقت بس شکوے کرتی رہتی ہو۔“ ان کے غصے کا مطلق اثر نہ ہوا تھا۔

”تو گلابا دیس میرا گولی مار دیں مجھے۔“

”کرتا ہوں تمہارا بندوبست۔“ انہوں نے جھنجھلا کر کہا، مگر جواب نہایت الٹ ملا تھا۔

”پتہ ہے کیا تو!..... اچھا سا بندوبست کیجئے گا۔“

”دل کو دل سے راہ ہوتی ہے

غبارہ پھٹے تو ٹھاہ ہونی

نکھوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا۔
”شکریہ۔“ نواس مزاری نے اس کی ناک کو دبایا، تو وہ پھٹ پڑی۔

”ہاں میں جانتی ہوں ہر اس انسان سے جو آپ کو مجھ سے دور کر دے۔“ نواس مزاری کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔

”میری پاگل، میری شرمیلی۔“

”میم بیریدی کی تیل ہونے والی ہے، پلینز اس شعر کی تھوڑی سی اور وضاحت کر دیں۔“

”آں ہاں۔“ مائٹری کی آواز پر وہ کسی خیال سے چوکنی تھی۔

”گزر باقی تفریح میں کروادوں گی فی الحال آپ اس کروائی کی تشریح میں رہیں، شامل کر لیں کہ۔“

”جنہیں ہم دیکھ کر جیتے جیتے مرنے لگے۔“

وہ لوگ انھوں سے اوہل ہو گئے تھے،

شعر لکھو اس نے ٹیبل سے پرس اٹھایا۔

”میم اللہ حافظ۔“ کلاس نے مشترکہ طور پر

الوداع کیا تھا۔

☆☆☆☆

20 برس بعد وہ وطن واپس لوٹے تھے وہ روشنی

سراج سے ترک تعلقات کے بعد میمونہ مزاری کے

ہمراہ سعودی عرب سینٹیل ہو گئے تھے۔ ہر چیز بدل

گئی تھی میمونہ مزاری کا انتقال ہو چکا تھا۔ نہ وہ اپنی

خود سے ہاری تھیں اور نہ نواس مزاری نے ان کی

خواہش کو پورا کیا تھا، کیا کرتے، اگر مان لیتے تو

دل خفا ہو جاتا، یا شاید دھڑکنے چھوڑ دیتا، غبارے

والی کے نام پر ان کے جملہ حقوق محفوظ تھے، بے

ایمانی کیوں کرتے، بس ساری زندگی میمونہ مزاری

سے سرد جنگ میں گزار دی۔ آخر وقت میں آ کر

میمونہ مزاری بیٹھی کی حالت دیکھ کر کئی مرتبہ پشیمان

ضرور ہویں لیکن اپنی ضد پر قائم رہیں، نواس

مزاری گزرے ہوئے لمحوں کو سوچ رہے تھے

نہیں میں آپ کی جان واں، جھوٹ ہے سب کچھ۔
وہ اٹھلائی تھی۔ نواس مزاری ہنس دیا۔

”میری سچی سی لڑا کا طیارہ جانی، تم میری یاد بھی ہو اور پیار بھی مگر یہ بچوں والی حرکتیں چھوڑ دو، بڑی ہو گئی ہو، دیکھو ناں تھوڑی سی میچور ہو جاؤ۔“ وہ چپ رہی تو نواس مزاری نے کا ندھے اچکائے۔

”اوکے۔“

”تم تو غبارے اڑانے کے موڈ میں نظر نہیں آتی ہو میں کسی اور پارٹر کو ڈھونڈ لیتا ہوں۔“ ان سے کچھ

فاصلے پر ایک ماڈرن لڑکی کھڑی تھی۔

”ایکسیکزی، کیا آپ میرے ساتھ مل کر یہ غبارت

اڑائیں گی؟“ نواس مزاری نے پیش قدمی کی۔

”وائے ناٹ پیئڈم۔“ وہ خوش دلی سے بولی

دونوں کے ہاتھ غباروں کی ڈوری پر تھے انہوں نے ہوا

کے تیز جھونکے غبارے آسمان کی طرف اڑا دیئے۔

”وہ رہے۔“ نواس مزاری نے خوشی سے کہتے

ہوئے، رنگ برنگ غباروں کو آسمان کی بلندیوں کو

چھوئے، دیکھا اور روشنی سراج کی طرف نظر اٹھائی وہ

دونوں ہاتھوں پر رکھے زور سے بولی تھی۔

”آئی لوو یو۔“ نواس مزاری کا تہقہ سب

ساختہ تھا۔

”سڈیل۔“

”میں نہیں ہوں سڈیل۔“ اس نے لرزتی آواز

پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے نواس مزاری

کی طرف کمر کر لی وہ اس کے عین سامنے آ رکا۔

”جھوٹ مت بولو، کچھ دیر پہلے تو کہہ رہی تھی

میں کسی سے نہیں جلتی، اگر کسی سے نہیں جلتی تو آنکھوں

پر ہاتھ کیوں رکھے تھے۔“ لہجہ میں شرارت تھی۔

”وہ تو آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا۔“ صاف غلط بیانی

سے کام لیا گیا تھا۔

”اچھا لاؤ میں نکال دیتا ہوں۔“ وہ سیدھا

ہوا، روشنی سراج نے ذرا کی ذرا نرم آلود پلکوں کو اٹھا کر

”میری جان ہوتی، میری غبارے والی گڑیا آئی لو
پوسوچ۔“ وہ رو رہا تھا، روشنی سراج کا دل پھٹنے کے
قریب تھا، نواس مزاری کا قریب جہاں وجود کو راحتیں
بخش رہا تھا، وہیں نواس مزاری کے آنسو اور جدائی
سے جی کٹ رہا تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی روشنی سراج
نے آنکھوں کے ساتھ خود کو نواس مزاری سے الگ کیا
جیسا کہ لالی سلونی رنگت کو دھکا گئی تھی۔
”آئی لو یو نواس۔“

”تین چار سال تک تو میری عمر ڈھلنے لگی گی روشنی
پھر میں بوڑھا ہوں، لگوں گا، اگر میرے دانت گر گئے
یا بال اڑ گئے پتھر۔“

”پھر بھی غبارے والی آپ کی رہے گی آخر عمر
تک بھی اگر ہماری دعا رنگ لے گی تو آپ پھر بھی
مجھے بولیں۔“ کیا دھوپ چھاؤں موسم بھی رونا،
کبھی ہنسنا، کبھی جدائی سے لرزاں اور کسی لمحہ کٹنا،
کبھی نہ ملنے کی باتیں اور کبھی پالینے کی خواہش،

بھر کی پیاس، کبھی وصل کی آس، انہی ارادوں کے

درمیان ہاتھ سے ہاتھ جھوٹ گئے تھے۔

☆☆☆☆

”میں تمہاری آنکھیں اور غبارے اپنی ہونے

والی بیوی کو دے دوں گا، تم رہو یونی خفا۔“ نواس

مزاری نے اسے چڑایا۔

”میں کسی سے نہیں جلتی آئی سمجھ۔“ وہ سچ بول رہی تھی۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ نواس مزاری نے ہوا سے

بھرے غباروں کی ڈوریاں دوسرے ہاتھ میں منتقل کیں۔

”یاد غبارے والی، تم نے خواہ مخواہ موڈ آف کیا

ہوا ہے، ایک تو میں تمہاری خاطر آفس ورک چھوڑ کر

چلا آیا ہوں اس عمر میں تمہارے ساتھ مل کر غبارے

اڑانے اور تم ہو کہ سیدھے منہ بات نہیں کر رہیں۔“

”ہاں تو کون سا احسان کیا ہے آپ نے ہزار

منتوں کے بعد ساحل سمندر پر آنے کی زحمت گوارا

کی ہے، کوئی نہیں کرتے آپ مجھ سے پیار و یار کوئی

ہے

یہ بالکل تازہ شعر ہے میرا اچھا لگا آپ کو؟“
نہایت معصومانہ انداز میں دریافت کیا گیا تھا وہ
بھر پور غصے کے باوجود بے ساختگی سے ہنس دیئے تھے
وہ ایسی ہی کبھی ان سے بے وجہ مرعوب ہو کر چپ
کر جاتی کبھی دن میں بیس ایم ایس ایم کر کے
دریافت کرتی۔

”آپ ناراض تو نہیں ہیں؟“ آپ ٹھیک ہیں
ناں؟“ اپنا خیال رکھئے گا آئی مس یو“
کبھی کبھار تو وہ رہنمائی کر دیتے لیکن کبھی بے
پناہ مصروفیات میں غور کرنا انداز کر دیتے اور کبھی
اس کو ڈانٹ دیتے ہو وہ کسی دن خفا رہنے کے بعد خود
ہی بول پڑتی نواس مزاری نے کارکن چایاں تمام کر
یادوں کو جھٹک دیا۔

☆☆☆☆

وہ کالج میں بیکچر تھی آج کالج سے آئی تھی
چھٹی والے دن معمول کے مطابق وہ سی سائیڈ
جانے کے لئے تیار تھی گاڑی ڈرائیو کرتے نہ جانے
کیوں روشنی سراج کا دل عجیب انداز میں دھڑک رہا
تھا، سنگل پر گاڑی رکی تو اس نے غیر ارادی طور پر
بائیک پر بیٹھے نئے نویلے جوڑے کو دیکھا۔

”گلے ملتے ہیں دنیا میں جب پچھڑے ہوئے ساتھی
عدم ہم بے سہاراں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے“
روشنی سراج نے بے کسی سے منہ پھیرا تھا خدا کی
مہربانی سے ٹریفک دوبارہ اشارت ہوئی تو وہ تیزی
کے ساتھ رش سے باہر نکل آئی کم جھوم والی سڑک پر
گاڑی کو چلاتے ہوئے ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ
بنا ہوا تھا مگر ایک نکتہ ہی اسے ایک دم بریک لگانا پڑی
پچھڑے آنے والی گاڑی نے روشنی سراج کی گاڑی کو ہٹ
کیا تھا، نجانے کس کی غلطی تھی وہ تھملا کر گاڑی سے اتری
تھی۔ پچھلی گاڑی میں موجود شخص بھی باہر نکل آیا تھا وہ
غصے میں کچھ کہنے والی تھی کہ اسے ٹھک کر رک جانا پڑا کیا

یہ اس کی نظر کا دھوکہ تھا یا حقیقت؟

”نواس مزاری“۔ مقابل روشنی سراج سے بھی
زیادہ حیران اور پر جوش تھا۔
”غبارے والی“۔ اس کی سرسراہتی ہوئی آواز
روشنی سراج کی ساعتوں میں رس بن کر کھلی تھی دونوں
کی آنکھیں بھر آئیں ہونٹ کپکپا رہے تھے بے
اختیاری کے ساتھ قدم آگے بڑھے تھے اور دہاتھ
کے فاصلے پر رکے تھے، نظریں چروں کا طواف کر کے
سیر نہیں ہو رہی تھیں، نواس مزاری نے بے خود ہو کر
روشنی سراج کا کول سا ہاتھ تمام کر چوم لیا تھا وہ شرما کر
پچھڑے ہوئی تھی۔

”آپ بھی ناں یہ سڑک ہے۔“
”پھر کیا ہوا“ جھوم کو بھلا کیا معلوم ہو کہ دو پچھڑے
ہوئے ساتھی جب اچانک مل جائیں تو کیسی حسرتیں جنم لیتی
ہیں، میں کھر جاؤں گا روشنی سراج مجھے سمیٹ لو“۔ وہ
مندیدگی سے بولے روشنی سراج کے پاس فقط چپ تھی۔

☆☆☆☆

روشنی سراج کے گھر پر ایک دوسرے کے رو برو
غموں کی چٹائیوں اور کچھ شکایتیں بیان ہو رہی تھیں وہ
ایک دوسرے سے حیران و حیران رہ سیکے تھے وہ نواس
مزاری کی باتیں واپس کر رہے تھے اس کی بھی انہوں نے
شدت کے ساتھ اپنی نازک سی جگہ والی کو خود میں
بھینچ لیا تھا کاش وہ اسے کہیں پھیل لیتے۔

”آج بھی دیہی ہی سنگل پل ہے“۔ وہ جب کر کے نہ
دی تھی مزید بلک ابھی تھی خود نواس مزاری کے آنسو روشنی
سراج کے چہلے دار بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

”آپ نے مڑ کر کیوں نہیں دیکھا۔“
”مڑ کر دیکھنے کی مجھ میں ہمت کہاں تھی اگر مڑ کے
دیکھنے پر تمہیں کسی اور کے سنگ پاتا تو پتھر کا ہو جاتا۔“

”کیوں میں نے آپ سے کہا نہ تھا کہ غبارے والی
کے حق دار صرف آپ ہیں۔“ وہ کرب سے گویا ہوئی۔
”ہاں لیکن لڑکیاں تو مجبور ہوتی ہیں میرا خیال تھا

تم کسی سمجھوتے کی صلیب پر چڑھ چکی ہوگی لیکن ہر
چھ نومبر کو میں نے تمہارا نمبر ڈائل کیا تو ہر بار بند پایا کیا
اس قدر مجھ سے تنگ آ گئی تھیں۔“

”نہیں وہ نمبر کھو گیا تھا آپ سنا میں کیا آپ
آج بھی صرف میرے نواس مزاری ہیں؟“ ایک
خند تھا جو نوک زباں تک رسائی پا گیا۔
”تمہارے بعد میں کسی کا ہو نہیں سکا۔“ ان کی
آواز بھرا گئی۔

”دادا مجھے شادی کے لئے فورس کرتے کرتے
مجھے جھوڑ کر مٹی تلے جاسوئے اور میں نے بھی اپنے
فصلے کی لاج رکھی اور بیشہ آپ کی رہی۔“ ڈھیروں
اطمینان دونوں کے باوجود ہر حد سکون دے گیا ذرا
صبر آیا تو الگ ہو کر قریب تھے
”آپ بہت گریں فل ہو گئے تھے۔“ سچائی لہجے
سے عیاں تھی۔

”تم بھی بیچور اور ڈیسنٹ ہو گئی ہو۔“
”جیسا کہ آپ کی خواہش تھی ہے ناں نواس؟“
”ہاں لیکن تھوڑی سی بیچور رہو تمہاری چٹیل
حرکتوں میں میرا قرار ہے۔“ نواس مزاری نے محبت
سے کہا تو ان کے چہرے کو نور سے دھندلتی روشنی سراج نے
آنکھوں کے ساتھ کھٹکھٹا کر ہنس دی تھی وہ حیران ہوئے۔
”کیا ہوا؟“ روشنی سراج نے ان کے دانتوں
میں بے خلا کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

”تو دو کھڑکیاں سامنے بن ہی گئیں۔“ وہ خوش
دلی سے مسکرائے۔

”ہاں میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ۔“ ان کی
بات ابھی اوجھڑی تھی روشنی سراج نے پیار سے ان
کے بال بگاڑے۔

”بال بھی کچھ ہلکے ہو گئے ہیں۔“ آنکھوں میں
مسکراہٹ بھی لب سمجیدہ تھے۔

”ہوں تم پر بھی تو بڑھاپے کے آثار نظر آنے
لگے ہیں، مگر تمہیں یاد ہے ناں اپنی بات کہ آپ اگر

بوڑھے بھی ہو گئے تو غبارے والی کو قبول: ۱۱
وہ آس سے بولے۔
”مجھے یاد ہے۔“ وہ ملائمت سے کہہ کر موضوع
گفتگو بدلتے گئی۔

”پچھلے دو سال سے میری نظر کمزور ہو گئی ہے
دھندلا سا دکھائی دینے لگا ہے۔“
”بات مت بدلو۔“ انہوں نے کرب آمیز لہجے
میں گزارش کی۔

”نواس! میں 40 برس کی ہو چکی ہوں۔“ روشنی
سراج کے چہرے پر دلگدگی نمایاں نظر آرہی تھی۔
”میں بھی 47 برس کا ہوں میں ٹوٹ رہا ہوں
مجھے جوڑ دو روشنی اب تو کوئی وجہ نہیں رہی کہ ہم خود کو
تڑپائیں اب دوریاں ختم ہو جانی چاہئیں۔“ گہرا
امید بھرا لہجہ روشنی سراج کو جلا رہا تھا، کشمکش میں
ڈال رہا تھا۔

”تم کیوں متاثر ہو رہی ہو؟“ انہوں نے
استغراق کیا۔
”کیا تمہارے دل میں موجود میرا پیار خزاں
رہا؟“ وہ تڑپ کر بولی۔

”آپ کا پیار حیران ہے۔“ آنسوؤں سے
میں نے پیار کے پودے کو جوالہ لگا رہا ہے خزاں
کے موسم میں بھی امیدوں کے طائر اس پودے کی
ٹہنیوں پر چپکتے رہے ہیں، میں اپنے وعدے سے
منحرف نہیں ہوں، مجھے زمانے کا خوف دامن گیر ہے
لوگ کیا کہیں گے کہ اس عمر میں کیا سوچی نواس
پاکستان میں عمر کی اوسط زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر تک
ہے، میں چالیس اور آپ 47 کے ہو چکے ہیں باقی
زندگی بہت مختصر رہ جاتی ہے کھنچ چند سال اس مختصر
زندگی میں جبکہ کیا معلوم کس کی پہلے سانس جواب
دے جائے اس دائمی جدائی کا دکھ کس توڑ دے گا مجھے
بھی آپ کے ساتھ جینا ہے مگر مجھے میری زندگی کے

کھوئے ہوئے سال واپس لادیں نوا..... میں لمبی عمر تک آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں جینا چاہتی ہوں۔“ گلو گراؤ اور حلق میں معدوم ہونے لگی تھی دکھ کی شدت اتنی تھی کہ مزید بولنا نہ گیا اس کی سائیں اتار چڑھاؤ کا شکا کر گئیں۔

”میں تم سے اختلاف کرتا ہوں روشنی پلیز! میرے حال پر رحم کرو کسی حد تک تم درست سہی مگر سوچو عمر بھر کی جدائی سے بہتر ہے ہم چند سال مل کر گزار لیں کوئی حسرت کوئی ملال نہ رہے اور زمانے کی چھوڑ لوگ اس وقت کہاں ہوتے ہیں جب دو پیار کرنے والے شری اور چاند نظر آتے ہیں ایک ہونا چاہتے ہیں مگر کبھی ذات، کبھی بیزار، دو باریں حامل گردی جاتی ہیں روشنی ہم باہر رہ جائے والے دس پندرہ سال میں محبت کو امر کر دیں گے ہم وہ سال کچھ ایسے جن میں گے کہ بیت جانے والی جوانی کا حکم کچھ پڑ جائے گا۔“ نواس مزاری لجاجت سے بولے۔

”مجھے اس عمر میں لہنگا چولی پہن کر سولہ سٹاپ کرتے شرم آئے گی نوا..... کاش وقت کا پیہ پیچھے کی طرف گھوم جائے تو میں بڑے اربانوں سے آپ کی دہن بن کر پیار کی بیج پر بھی آپ کا انتظار کروں یہ وقت کی گردش اتنی ظالم کیوں ہوتی ہے نوا۔“ وہ سسک پڑی۔

”مت کہو مجھے نوا۔“ انہوں نے ہاتھ جوڑے۔

”جب تمہارے ہونٹوں کی حرکت سے یہ نام ادا ہوتا ہے تو اس سے پھوٹی روشنی مجھے وحشت میں مبتلا کر دیتی ہے مجھے امتحان میں مت ڈالو۔“

”نوا۔“ وہ درد سے پکاری۔

”میں شام کی فلائٹ سے سعودیہ چلا جاؤں گا“ میرے دل میں مرتے دم تک یہ حسرت رہے گی کہ تمہارے تن پر اپنے لئے سرخ غرارہ دیکھوں اور تمہارے ان ہاتھوں پر میرے نام کی مہندی لگی ہو میری اس خواہش کو تم حسرت بنا کر دم لوگی باقی کی

ساری زندگی مجھے افسوس رہے گا کہ تم نے میری خواہش پر دنیا کو مقدم جانا، روشنی تم نے سولہ سٹاپ میری خاطر کرنا تھے یا دنیا والوں کے لئے بولوروشنی اور ہاں میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم اب بھی میرے لئے وہی چھوٹی سی غبارے والی گڑیا ہو مجھے تمہاری عمر اور لوگوں کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا میں تمہارے ہر روپ کو اپنے لئے سنورا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں صرف اپنے لئے اور مجھے تم ہر روپ میں پیاری لگتی ہو میری جان ہو میرا سکون ہو تم میرا ہر رشتہ ناتہ تعلق، تم سے ہے چلتا ہوں۔“ نواس مزاری نے واپسی کے لئے قدم بڑھائے۔

”رک جائیں خدا کے لئے۔“ وہ لپک کر اٹھی تھی۔

”اپنی تو سنا ہے اب میری بھی سن لیں نوا! میں آپ کے بغیر کچھ نہیں ہوں میرے من میں آپ کے حوالے سے کئی خواہشیں لمبی ہیں اور آنکھوں میں کئی خواب روشن ہیں مجھے اپنی ذات کی تکمیل کے لئے آپ کا ساتھ منظور ہے میں تھک گئی ہوں مجھے سہارا دے دیں۔“ آنسوؤں کے درمیان روشنی سراج نے بات لپکائی۔ نواس مزاری نے سرور ہو کر اسے دیکھا تھا روشنی سراج کے آنسو صاف کرتے ہوئے ان کے لبوں پر ایک ہلکے سیٹھی۔

”تھینک یو سوچ روشنی میری جان کے ککڑے۔“

☆☆☆☆

ٹی پنک اور آف وہائٹ شرارے میں نفیس چوہری کے ساتھ لائٹ سائیک اپ روشنی سراج کو پرکشش بنا رہا تھا یہ حقیقت تھی کہ وہ اپنی اصل عمر سے انہیں کم عمر دکھائی دے رہی تھی تھری پیس میں لمبوس ہینڈسم پرسنائی کے مالک نواس مزاری کو دیکھ کر روشنی سراج کا دل دھڑک گیا تھا، خالص گلابوں سے سجائی ہوئی بیج پر وہ نواس مزاری کی منتظر تھی آنے والے خوش کن لمحات کا تصور اس کو خود میں سننے کا سبب بن رہا تھا فرط حیا سے پلٹیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس دن کا

کھن انتظار گزشتہ 20 برسوں سے کیا گیا تھا ان لمحات تک پہنچنے میں ہجر کے الاؤ کو پار کرنا پڑا تھا تلخیوں، اداپیوں کے موسم کا سامنا کرنا پڑا بیروں میں آبلے پھوٹ پڑے تھے تب کہیں جا کر یہ مبارک گھڑی آئی تھی وہ دونوں خدا کے شکر گزار تھے نواس مزاری کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی وہ بے چینی سے روشنی سراج کے پاس آ بیٹھے۔

”السلام علیکم! شادی مبارک۔“

”وعلیکم السلام! آپ کو بھی مبارک ہو۔“ آہستگی سے جواب دیا گیا تھا۔

”غبارے والی گڑیا! تمہیں سنانے کے لئے طویل داستانیں ہیں لیکن گویا لفظ ختم ہو گئے ہیں تمہارا یہ روپ دیکھ کر زبانی مجھے یہ آمادہ ہی نہیں ہے تمہارا یہ روپ دیکھنے کے لئے میں برس بھر کیا ہے ان آنکھوں کو تراوٹ ایک تمہارے چہرے سے حاصل ہوتی ہے گویا میری بیانی ہو گئی ہے دیکھنے سے سیری نہیں ہوتی، ان جلی ہوئی آنکھوں کو قرار بخشو نواس مزاری کی مشکل آسان کر دو یہ شام سلونا چہرہ اوپر کرو۔“ وہ گھمبیر لہجے میں بول رہے تھے۔

”جان نوا! میری طرف دیکھو مجھے سکون بخشو اور ذرا بتاؤ تو میں کیسا لگ رہا ہوں؟“

”مجھے شرم آتی ہے۔“ وہ لجا کر رہ گئی وہ بولے سے مسکرا دیے۔

”اپنے نواس سے شرمانا چھوڑ دو پہلی والی روشنی بن جاؤ۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ سے روشنی کا چہرہ اوپر کیا اس نے حیا بار نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر پلٹیں جھکا لیں۔

”ماشاء اللہ آپ ہمیشہ کی طرح حسین لگ رہے ہیں۔“

”تھینک یو۔“ وہ بشاشت سے بولے اور ہاتھ بڑھا کر اسے خود میں سمولیا اس نے نواس مزاری کے سینے میں منہ چھپا لیا۔

”نوا۔“

”جی جان نوا۔“ نواس مزاری کو لگا وہ رورہی ہے۔ انہوں نے دوبارہ روشنی کا چہرہ اوپر کیا جو آنسوؤں سے تر تھا۔

”اوہو رونا نہیں بھی اب مسکرانے کے موسم نے نوید بہار دی ہے۔“

”خوشی کے آنسو ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”مگر یار! میک اپ خراب ہو جائے گا۔“

انہوں نے ڈرایا۔

”ہونے دیں۔“ وہ لا پرواہی سے بولی۔

”اب میک اپ اتر بھی گیا تو کیا ہے میں اب روشنی نواس ہوں مجھ پر نواس مزاری کا رنگ ہے۔“

”اوہ لیس..... یہ ہوئی ناسات۔“ نواس مزاری نے اس کی بند آنکھوں پر بھی پلکوں کو چھوا اور اپنی گھمبیر دلش آواز میں سرگوشی کی۔

”اس جہاں بے صدا میں اک صدا ہے روشنی منزلیں بھری پڑی ہیں راستہ ہے روشنی رات کی تاریکیوں کا ڈر نہیں ہے اب مجھے جانا ہوا میں کہ شب کی انتہا ہے روشنی۔“

”تھینک یو! شام جلی میں آسو گی رچ گئی تھی۔“

”یو کم کم جان نوا۔“ کچھ لمبی جھپکے سے خاموشی کی نذر ہو گئے۔

”میری سوہنا۔“ انہوں نے پکاد۔

”جی۔“

”یار! اللہ نے ہم کو سرخو کر دیا ہے آؤ پہلے شکرانے کے نوافل پڑھ کر اس کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں۔“

”سچ کہا آپ نے نئی زندگی کی ابتداء شکرگزاری سے کرتے ہیں۔“ چند لمحوں بعد وہ خدا کی بارگاہ میں جھکے شکر ادا کر رہے تھے۔

☆☆☆☆

وہ شاور لے کر واش روم سے باہر نکلے تو

ڈریسنگ کے سامنے کھڑی روشنی کو بال سلجھانے کی کوشش میں الجھا ہوا پایا اس نے تنگ آ کر میسر برش اٹھا کر روشنی کے پھولے منہ کو دیکھا۔

”لاؤ میں بال سلجھا دیتا ہوں۔“

”اللہ تعالیٰ نے یہ گھونگر میرے لئے ہی سنبھال کر رکھے تھے کیا ہو جاتا اگر میرے بال بھی سیدھے ہوتے۔“ روشنی نے نواس مزاری کو دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالنے لگی تھی۔ ”کہا گیا اس کے گھونگر یا لے بال اللہ نے نواس مزاری کی دعا پر بنائے ہوں انہوں نے روشنی کی بات سے لطف لیتے ہوئے بہت پیار سے اس کے بال سنوار دیے۔

”غبارے والی تمہارے ان بالوں کے گرد نواس مزاری کی زندگی گول گول گھومتی ہے آؤ آؤ ایسی بات نہ کہنا میں تمہارے بال سلجھا دیا کروں گا۔“ روشنی ایک طرف رکھ کر وہ سینے پر ہاتھ رکھے روشنی کے سامنے ہوئے۔

”آں..... ایک منٹ۔“

”اب کیا ہوا؟“ وہ حیرت سے بولی۔ نواس مزاری نے آئینہ نشین بلیک چشمہ اس کی آنکھوں پر لگا دیا اور گھونگر یا لے بالوں کے آئینہ کو دائیں بائیں پھیلا دیا خوبیت سے کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد انہوں نے اس کے گرد بازو جھانک کر دیئے وہ مسکرائی تھی اور چھوٹی سی ناک پھیل گئی تھی انہوں نے اس کی ناک کو ہلکا سا دبا دیا۔

”میری زندگی کا ہارن۔“ وہ دونوں آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر ہنس دیئے۔

☆☆☆☆

وہ گھونگر یا لے بالوں کی پونی ٹیل بنائے کچن میں مصروف تھی۔

”غبارے والی اے غبارے والی۔“ نواس مزاری آفس سے واپسی پر پونہ ہی شور مچایا کرتے تھے۔

”میں یہاں کچن میں ہوں۔“ اس نے آواز

لگائی نواس مزاری کچن میں داخل ہو کر اس کا بازو کھینچ کر باہر لائے۔

”کیا ہوا نواس؟“

”یہ دیکھو تمہارے لئے غبارے لایا ہوں اب ذرا اپنی زلفوں کے ساتھ باندھنے دو۔“ خوشیوں کے جھنجھکے تھے۔ روشنی نے بلا اعتراض سر ان کے سامنے کر دیا نواس مزاری نے ہوا بھرے خوش رنگ غبارے اس کی پونی ٹیل کے ساتھ باندھ دیئے۔

”ایک منٹ یار!“ وہ جھٹ قریب آئے اور سیٹھی لے لی۔

”بس اب خوش؟“ اس نے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرائے۔

”اچھا یہ تادم کچن میں کیا کر رہی تھیں؟“

”آپ کے لئے کچھ اسٹیکل ڈش تیار کر رہی تھی۔“

”اچھا۔“ وہ خوش ہوئے۔

”تو اور کیا آپ جا کر چیچ کر لیں میں ابھی روم

میں آتی ہوں۔“

”او کے جلدی آنا۔“ انہوں نے پیار سے روشنی

کا رخسار دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ ٹرے میں ایک گلاس

دودھ اور ایک پیٹ ریکھ کر ان کے سامنے رکھی۔

”بہت بھوک لگی ہے۔“ جلدی سے بیٹھ جاؤ۔“

انہوں نے بے صبری سے کہہ کر پلیٹ سے رومال ہٹایا۔

”یہ کیا دلیہ؟“ نواس مزاری نے حیرت کی زیادتی سے کہا اور مسکراہٹ روکی روشنی کو دیکھا

آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”ہاں کیوں نہیں آپ کھائیں۔“

”روشنی کی بچی..... تمہیں معلوم ہے ناں کہ مجھے

دلیہ پسند نہیں ہے۔“ نواس نے اس کا کان کھینچا۔

”اب پسند ہو یا نہ ہو کھانا تو پڑے گا۔“ وہ

معصومیت سے بولی۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے اس کا کان چھوڑا۔

”مطلب یہ کہ جناب آپ کے دو دانت گر چکے ہیں تیسرا گرنے کی تیاری میں ہے اور چوتھا کچھ دنوں تک ہلنے لگے گا باقیوں کی باری بھی آ رہی جائے گی تو ایسے میں آپ سخت غذا کیسے کھا سکیں گے میں نے سوچا ہے اب آپ کے لئے دلیہ کھیر کسٹرڈ وغیرہ بناؤں گی اور بازار سے کیلے۔“ اس کی بات ابھی ادھوری تھی نواس مزاری نے تکیہ اٹھا کر اس کی جانب پھینکا۔

”ہاہا۔“ وہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔

”بہت تیز ہو تم غبارے والی۔“ انہوں نے ناراضی سے رخ موڑا۔

”آئی ایم سوری میرے گول گپے جیسے نواس۔“ وہ

ہنسی کے دوران بمشکل بولی تھی۔

”میں نے آپ کے لئے منقار تیار کیا ہے

ٹینشن نہ لیں۔“

”شکریہ۔“ وہ رکھائی سے بولے۔

”یو کم کم۔“ اس نے جھک کر کہا۔

”یو کم کم کی کچھ لگتی۔“ وہ زیادہ دیر اس سے

ناراض نہیں رہ سکتے تھے۔

”ایکسیکوز می میں کم کم کی کچھ نہیں لگتی۔“ میں سبز

نواس ہوں نواس کی جان لگتی ہوں۔“ اس نے فخر سے

سر بلند کیا۔

”اچھا جی۔“ نواس نے اسے پیار بھری نظروں

سے دیکھا۔

”ہاں جی۔“ وہ جھینپ کر ان ہی کے قرب میں

پناہ ڈھونڈنے لگی۔

☆☆☆☆

”تیری قربت کے لمحے پھول لیکن

پھولوں کی عمریں مختصر ہیں۔“

”روشنی۔“ نواس مزاری نے سوئی ہوئی روشنی کا

بازو ہلایا کتنا سرد وجود تھا انہوں نے فکر مندی سے اس

کے پرسکون چہرے کو دیکھا انہوں نے دیوانگی کے

عالم میں اسے جھنجھوڑ ڈالا اس کا بے جان بازو نیچے لٹکنے لگا۔ وہ چلائے تھے۔

”تمہیں کچھ نہیں ہوگا روشنی! تم مجھے تنہا چھوڑ کر

نہیں جاسکتیں تم نہیں مر سکتیں میں کیسے زندہ رہوں گا

تمہارے بغیر، یوں چپ چاپ کیوں چلی گئیں مجھے

کچھ تو بتایا ہوتا، کوئی راہ تو سمجھائی ہوئی روشنی میری

جان آنکھیں کھولو اپنے نواس کو دیکھو مجھے سفر میں اکیلا

کیوں چھوڑ گئی ہو کیوں تم نے اپنا کہا کچ کر دکھایا

صرف اپنا سوچا کہ نواس میں آپ کے بغیر جینا نہیں

چاہتی کچھ میرا بھی سوچا ہوتا اگر میرے بغیر جی

نہیں سکتی تھیں تو مرنا بھی نہیں تھا وہ خدا یا ایسا کیسے

ممکن ہے میری گزرا یا تو بالکل ٹھیک تھی اسے کیا

ہو گیا، میری گڑیا مجھے واپس کر دیں اللہ جی پلینز۔“

وہ بچوں کی طرح اس کے مردہ جسم سے لپٹ کر رو

رہے تھے۔

☆☆☆☆

”مجھے معلوم ہے تمہارے بغیر بڑے عذاب میں

گزرنا ہے۔“ یہ زندگی میرے لئے تمہارے بن کسی

سزا سے کہ نہیں ہے غبارے والی۔“ وہ اس کی اطلاع

تصویر سے باخبر نہ تھے۔

”مگر یقین جانو میں اللہ سے مرچکا ہوں کوئی

بغیر شکوہ کے اس قدر خاموشی سے صبر کرنا ہے

بھلا خوشیوں کے تین سال میری جھڑکی میں ڈال کر

مجھے غم کے سپرد کرنے والی مجھے بتاؤ بہاریں پیار

کرنے والوں سے اتنی جلدی کیوں روٹھ جاتی ہیں

پیار کا مقدور صرف تنہائی ہے کاش میری ماں نے تمہیں

بہو کے طور پر 23 برس قبل کر لیا ہوتا تو آج یہ شکستہ

وجود میرے اور تمہارے ٹکشن میں مہکنے والے معصوم

بچوں کی قلقلاریوں سے طاقتور ہو جاتا، کاش کہ انا کو

موت دیوبوچ لے تاکہ ہر پیار کرنے والے کی تکمیل

ہو جائے۔

☆.....☆☆☆☆☆

سرفراز سکریت جہانگ

”یا ہو۔ دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ مجھے ”نسخہ ہائے“ ہونہ ہو سکتا ہے بھلا، مانتی ہونا مجھے۔“
”وفا“ یہیں سے ہی ملے گا۔ نشاء پرویز کچھ کہے اور وہ ”نسخہ ہائے وفا“ کو دیکھتے ہی اس نے ایک نعرہ



بلند کیا اور جوش سے بولنے ہوئے جیسے ہی مڑی اپنے پیچھے ماہین کے بجائے ایک اجنبی شخص کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ چھٹ پانچ انڈیا لڈی رنگت، اس کا بیلیو کلر کی شرٹ اور جینز پہنے ایک ہاتھ میں سن گلاسز اٹھائے اپنی براؤن آنکھوں میں وہ چھٹی کے رنگ لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ نشاء ایک دم سہما کر رہ گئی۔
”آئی ایم سوری مجھے مس انڈیا لڈی رنگ ہوئی تھی مجھے لگا کہ میری فرینڈ میرے پیچھے کھڑی ہے۔“
”نوا اس او کے۔ ویسے مس انڈیا لڈی رنگ نہیں کافی اچھی انڈیا لڈی رنگ ہوئی ہے ہماری۔“
”کیا مطلب۔“ اس نے کچھ الجھ کر اس اجنبی کو دیکھا تو وہ مسکرا کر مزید بولا۔
”اصل میں، میں بھی اس کتاب کو ہی خریدنے آیا تھا میرے دوست کی برتھ ڈے ہے تو اس کے لیے اسے کتابیں بہت پسند ہیں۔ شاید آپ کو بھی۔“
”ایک سکیڑی آئی ہیو نو گوناؤ (مجھے جانا ہے)۔“
”وہ اسے مزید بولنے کا موقع دیئے بغیر تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی جہاں ایک شیپ پریٹھی بڑھ رہی تھی۔“



تم یہاں پر کیا کر رہی ہو مجھے لگا کہ تم میرے ساتھ کھڑی ہو۔

”کیا یار نشاء! پورے دو گھنٹے سے تم مجھے اپنے ساتھ لیے ہر بک سینٹر پر گھوم رہی ہو۔ میں تھک گئی تھی اسی لیے یہاں پر آکر بیٹھ گئی، بک مل گئی نا؟“ وہ حسب معمول لمبا جواب دے کر بولی تو اس نے صرف سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تو مایمین کاؤنٹر پر پیسے دے کر اس کے ساتھ چلی آئی۔

”پلیز جلدی چلو، امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“ وہ مختصر کہہ کر گاڑی کی ونڈ اسکرین کے باہر دیکھنے لگی تھی۔ اس کی نظر اپنی کار میں بیٹھے اس اجنبی پر پڑی، جو چہرے اور ڈریسنگ کے لحاظ سے کافی امیر لگتا تھا۔ اجنبی کی نظر بھی اس پر پڑی اور پہلے کی طرح اس کے لب مسکرا اٹھے نشاء نے بے اختیار مایمین کو دیکھا جو ڈرائیور کو جلدی چلنے کا کہہ رہی تھی۔

☆.....☆

دوسرے دن وہ حسب معمول جلدی اٹھ گئی نماز پڑھ کر وہ باہر آئی تو حسب معمول نشاء روز کی طرح اپنے سامنے کپڑوں کے ڈھیر پھیلانے مشین پر جمی انہیں سینے میں مصروف تھی۔ تریشہ پنچن میں بیٹھی پھونکی اٹھائے آگ سلگانے کے چکر میں بری طرح کھانس رہی تھی اور عریشہ بڑے سے صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ سامنے پنپیل کے بڑے سے درخت کے نیچے پڑی پھینکنا چار پانی پر ابا، عدنان اور عامر چائے اور پاپے سے ناشتہ کرنے میں مصروف تھے۔ بھی اماں کی نظر اس پر پڑی تو نرمی سے بولیں۔

”ارے نشاء! کالج نہیں جائے گی کیا؟“

”نہیں اماں! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”ارے کیسی ناشکری لڑکی ہے نشاء تو۔ پہلے مری جاتی تھی کہ اماں مجھے کالج جانا ہے، پھر اس بھٹی مائس لڑکی مایمین نے تجھے داخلہ لے کر دیا وہ تیرا سارا خرچہ اٹھاتی ہے۔ تو، تو کالج میں پڑھنے جانی ہے ورنہ

تیرے ابا کے پان کے کھوکھے اور میرے کام کرنے سے تو کہاں داخلہ لے سکتی تھی اور اب تو آئے دن چھٹی کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ چل میرے ساتھ میں تجھے کالج چھوڑنی جاؤں گی۔“

”اچھا اماں تو رک میں آتی ہوں۔“

تسلیم بیگم کے غصے سے کہنے پر وہ سر پر پاؤں رکھ کر اندر بھاگی، کالج یونیفارم پہن کر اس نے منہ دھویا اور اوپر سے بالوں میں کنگنا پھیر کر اس نے بیگ اٹھایا اور اماں کے پاس چلی آئی جو چادر پہنے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ پیچھے سے تریشہ نے اسے پکارا کہ نشاء ناشتہ تو کر کے جاؤ مگر وہ ان سنی کیے اماں کے ساتھ کالج چلی آئی ایک تو صبح سے اس کا موڈ خراب تھا۔ دوسرا مایمین بھی کالج نہیں آئی تھی۔ تین پرید لے کر اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور پیدل ہی گھر کے راستے پر چل پڑی۔ کالج سے اس کے گھر کا فاصلہ چندرہ

میں مسافت پر تھا۔ اماں کام پر جانے سے پہلے روڑ کے کالج چھوڑ جاتی تھیں۔ چلتے چلتے اس کی نظر سامنے کے پورٹل میں کار پر پڑی جس میں تقریباً اس کی ہی عمر پر چڑھ چکا تھا۔ یہ لڑکی سے فوجی لگتی ایک دوسرے پر اس کا تعلق ہی نہیں تھا۔ اسے اس دنیا سے بہت اگلی سی لگتی تھی۔ احساس کمتری ایک دم بڑھا تھا اس کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے کہیں دور چلی جائے جہاں نشاء پرویر ہو نہ جانتا ہو جہاں کوئی دکھ نہ ہو جہاں کوئی غربت نہ ہو۔ وہ اس دنیا سے ایک دم روپوش ہو جانا چاہتی تھی مگر ہر خواہش پوری تھوڑی ہوتی ہے اس کے قدموں نے مزید چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ پاس ہی موجود ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسے کوئی پروا نہیں تھی کون اسے دیکھ رہا ہے کون جا رہا ہے کون رک رہا ہے اسے ایسے لگ رہا تھا کہ اس کے دکھ میں یہ درخت زمین آسمان اور کائنات کا ذرہ ذرہ رو رہا ہے

ماتم کر رہا ہے اس نے اپنے ہاتھوں سے سر اٹھا کر حیرت سے اس درخت کو دیکھا زمین کو آسمان کو وہ حیرت سے دیکھنے لگی۔

آخر کار شیت تھا ان سب کا نشاء پرویز سے؟

کیا احساس کمتری کا رشتہ تھا؟

یہ اس کے ساتھ کیوں ماتم کر رہے تھے؟

کیا وہ ایسی تھی کہ اس کے دکھ پر محرومی پر کوئی روئے؟

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اس کی سسکیاں بچکیوں میں بدلنے لگیں۔ کسی ایک نرمی بھری آواز اس کے آس پاس گونگی اسے اچانک کہ وہ اس آواز کو پہچانتی ہے اسے جانتی ہے آواز ایک بار پھر گونگی۔

”آپ ٹھیک تو ہیں؟“ اس نے حیرت سے سر اٹھا دیکھا وہ فکر مندی سے اسے دیکھ رہا تھا اس کے کوئی جواب نہ دینے پر وہ سوال بدل کر بولا تھا۔

”آئیں میں آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دوں۔“

”گھر.....“ اس نے حیرت سے لفظ گھر کو دہرایا تھا اور اگلے ہی پل اسے اپنا گھر یاد آ گیا تھا تو وہ غم آواز میں بولی۔

”میں یہاں پر اس لیے نہیں بیٹھی تھی کہ آپ یا کوئی اجنبی شخص مجھے لفٹ دے۔“

”آپ سیدھے سوال کا سیدھا جواب کیوں نہیں دیتیں۔“ اب کے وہ جھنجھلا کر بولا تھا۔

”میں چلی جاؤں گی یاں میں ہے میرا گھر۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور اگلے ہی پل لڑکھڑا کر بیٹھ گئی۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اس سے اٹھنا تک نہیں جا رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کتنی دیر تک گھنٹوں کے بل بیٹھی رہی تھی۔ اجنبی نے دکھ سے اس پاگل سی لڑکی کو دیکھا تھا پھر نرمی سے بولا۔

”اچھا آئیں نشاء! میں آپ کو سہارا دے دیتا ہوں چلے میں۔“

”مایمین کہتی ہے کہ کبھی کسی کا سہارا نہیں لینا پتا۔“

کیا پتا سہارا دینے والے کا کب موڈ بدلے اور آپ کو چھوڑ کر آگے چل پڑے اور آپ منہ کے بل نہ پڑیں۔ میں چلی جاؤں گی مسٹر۔“

”فشار..... فشار چوہدری نام ہے میرا اور جہاں تک آپ کو چھوڑنے کی بات ہے آئی مین کہ..... خیر چلیں انہیں اب سب دیکھ رہے ہیں۔“

وہ کھڑا ہو کر اپنا ہاتھ بڑھا کر بولا تو نشاء نے کوئی جواب دیئے بغیر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا کیونکہ اب اس سے بالکل بھی بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اُسے آہستہ سے تھینک پوکہ کر وہ دھیرے دھیرے چلتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی جب کہ فشار چوہدری پر سوچ انداز میں اس کی پشت کو مس کر رہ گیا۔

☆.....☆

ہر آئے ہی وہ درخت کے نیچے پڑی چار پانی پڑھنے لگی۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے وہ صدیوں کی مسافت طے کر چکی ہو۔ برتن دھونی تریشہ بھاگ کر اس کے لیے پانی لے آئی تھی جسے وہ ایک ہی سانس میں ختم کر گئی تھی صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت اسے بے حد بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر پنچن میں چلی آئی پنچن بھی کیا تھا۔ صحن کے ایک طرف چار دیواری دے کر اس کے اوپر لکڑیوں کی چھت بنادی گئی تھی اور زمین پر ہی مٹی کا چولہا بنا ہوا تھا ان کے گھر کیس کی سہولت بالکل نہیں تھی۔ بجلی بھی نام کو ہی تھی ان کے کمرے میں صرف رات کو ہی پنکھا چلا کرتا تھا اور سب کے سونے کے بعد اماں اٹھ کر اسے بھی بند کر دیتی تھیں۔ ساری رات پنکھا چلنے دینا ان کے نزدیک دنیا کی سب سے بڑی عیاشی تھی اور بلب کے نام پر ان کے کمرے میں صرف اماں ایک دیا جلا دیتی تھیں جس میں تیل سے زیادہ پانی ڈالا جاتا تھا وہ چار پنہیں تھیں۔ سب سے

بڑی نشاط تھی پھر وہ اس کے بعد تریشہ اور عریضہ تھی اور اس کے دو بھائی عدنان اور عامر تھے جو اب کے ساتھ پان کے کھوکھے پر بیٹھتے تھے۔ نشاط نے میڈل کیا تھا تریشہ پانچویں میں تھی اور عریضہ ساتویں میں۔ وہ خود فرسٹ ایئر میں پڑھتی تھی ان تینوں کی اسکول فیس ماہین ہی دیتی تھی۔ ماہین تین بہنیں تھیں ایک کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری سے نشاء کی ایک دو بارہی ملاقات ہوئی تھی اور اس کے تین بھائی تھے جو کہ باہر سیٹل تھے۔ اس کی ماں سوشل ورکر تھی اور باپ ایک مشہور بزنس مین۔ سب اپنی اپنی زندگیوں میں کھو کر ماہین کو بالکل ہی بھولی چکے تھے وہ ماں باپ کے پیار کی ترسی ہوئی لڑکی تھی اور اسی خنای نے اسے نشاء کے بے حد قریب کر دیا تھا۔

اس نے بے دلی سے چٹنی کا ڈھکن اٹھا کر اس میں پڑی بے رنگ دال کو دیکھ کر اس کی ساری شکل اڑ گئی۔ ان کے گھر دال بھی جو بنی تھی دال کو ابال کر اس پر نمک مرچ ڈال کر ہی اس سے روٹی کھائی جاتی تھی۔ کتنی عجیب زندگی تھی اس کی ہر نعمت سے محروم ہر آرائش سے دور اور یہی بات جب دوسرے دن اس نے کالج میں ماہین سے کی وہ دھکے سے اسے دیکھ کر رہ گئی پھر سمجھاتے ہوئے بولی۔

”میں تمہیں کیسے سمجھاؤں نشاء میری جان! امیر وہ شخص نہیں ہوتا جس کے پاس دولت ہوتی ہے جو بہترین کپڑے پہنتا ہے جو بہتر سے بہتر کھاتا ہے وہ جس کے پاس بینک بیلنس ہو تم کیا جانو کہ امیر تو وہ انسان ہوتا ہے جس کے پاس باپ کی شفقت ہوتی ہے ماں کی ممتا بھری گود ہوتا ہے امیر وہ ہوتا ہے جس کے پاس بہن کی محبت ہوتی ہے، بھائیوں کا اس کی ذات پر کیا جانے والا یقین ہوتا ہے۔ خالی خولی ایچھے کپڑوں اور پیسوں سے کوئی بھی امیر نہیں ہوتا۔“

اس کی بات پر اس نے جل کر جواب دیا تھا کتنی اس نے ہر انداز سے اپنی ذات سے نفرت جھلک

رہی تھی۔

”ماہین! تم تو یہ سب کچھ بہت آسانی سے کہہ سکتی ہو کیونکہ تم میرے اس دو کمروں کے گھر میں نہیں رہتیں جہاں انسان ہوا تک کے لیے ترستا ہے تم اس ٹین چھت والے کمرے میں اس ٹوٹی ہوئی چارپائی پر نہیں سوتی جس کا پکھلا صرف چکر کھاتا ہے، ہوا نہیں دیتا۔ تمہیں کبھی ایک ایک چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑا، تمہیں کبھی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں کو قربان نہیں کرنا پڑا، اس لیے تم یہ ساری باتیں اتنے آرام سے کہہ رہی ہو۔“

”میں دوبارہ کہوں گی نشاء! دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی یونو جب تمہاری دولت کی ہوس بڑھنے لگے تو اپنے سے کمتر کد کھالیا کرو۔“

”مجھ سے کمتر بھی کوئی ہوگا ماہین۔“ وہ تلخی سے مسکرا کر بولی تو اب کی بار ماہین ہنسنے لگا کر بولی تھی۔

”اب اس شخص احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ نشاء تو وہ بھی خود کو جینے نہیں دیتا اور جو احساس برتری میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ دوسروں کو جینے نہیں دیتا۔“

”یونو! ماہین! تم بھی میرا دل شدت سے چاہتا ہے کہ تم سے تمہاری بہت عزت والی اور تمہیل میں اپنی قسمت دے دوں تاکہ میں احساس ہو کہ غریبی کیا ہوتی ہے۔“

اس کی بات پر ماہین نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر حسرت سے بولی بھی تو کیا۔

”اگر ایسا ممکن ہوتا نا نشاء تو قسم سے میں اپنی قسمت خود تمہیں دے دیتی اور تم سے خوشی خوشی تمہاری قسمت لے لیتی۔ تم نہیں جانتیں یہ امیر لوگوں کی دنیا بڑی بناوٹی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے احساسات جذبات تک بھی بناوٹی ہوتے ہیں اور یہ ہی بناوٹ انہیں اپنے خدا سے دور کر دیتی ہے۔“ نشاء نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ پریڈ کی بیل بجی تو وہ اس کے ساتھ اٹھ کر کلاس کی طرف بڑھ گئی خالی

دماغ کے ساتھ۔

☆.....☆

سب کچھ معمول کی طرح چل رہا تھا وہ صبح کو کالج جاتی شام کو اماں کے ساتھ مل کر کام میں ہاتھ بٹایا کرتی، ماہین سے جی بھر کر باتیں کرتی مگر ان سب میں ایک تبدیلی ضرور آئی تھی اور وہ یہ کہ صبح کو جب وہ کالج کے لیے اپنے گھر سے اماں کے ساتھ نکلتی تو درخت کے تنے سے ٹپک لگائے فشار چوہدری اسے کھڑا ملتا تھا۔ نجانے کیوں اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ فشار چوہدری صرف اس کے لیے ہی دھوپ میں کھڑا ہوتا ہے اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ جاتی تھی۔ شاید وہ اپنے چکر کھاتا تھا مگر کیا؟ وہ خود حیران تھی کہ وہ فشار چوہدری کے بارے میں اتنا کیوں سوچ رہی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے؟

اس سے متاثر ہو رہی ہے؟ یہ وہ سوال تھی جسے وہ ہر روز خود سے کرتی تھی مگر پھر اگلے ہی دن جواب سنے بغیر اپنے دل کو ڈالنے بیٹھ جاتی۔ ایک دن اتفاق سے اماں کو بخار نے گھیر لیا تو وہ اکیلی کالج کے لیے گھر سے چلی آئی اور سب معمول وہ جیسے ہی فٹ پاتھ کے سائیڈ پر لگے درخت کے قریب پہنچی فشار چوہدری اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا پھر نرمی سے بولا۔

”السلام علیکم نشاء! کیسی ہیں آپ؟“

”وعلیک السلام۔“ اس نے صرف سلام کا جواب دیتے خود کو سنا تھا۔

”مجھے آپ سے ایک بہت ہی ضروری بات کرنی ہے کیا آپ؟“

”دن منٹ، اب کیا میں ہر راہ چلتے شخص سے باتیں کرتی پھروں گی۔“ وہ اب کے کچھ بولتی تھی تو وہ جلدی سے بولا کہ نہیں وہ اس کی بات سننے سے ہی انکار کر دے۔

”میں اپنی سسٹر اور امی کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا

ہوں۔“

”پر کیوں؟“

اس کی ساوگی پر اس کا دل چاہا کہ اپنا سر کی دیوار پر دے مارے مگر وہاں کوئی دیوار نہیں تھی اور اگر تھی تھی نا تو روڈ کے پار تھی اب اگر وہ دوڑ کر اس کے دیوار سے جا کر اپنا سر بھی مار دے تو اسے یقین تھا کہ نشاء پرویز بے نیازی سے گزر جائے گی اور وہ یا تو وہیں پر مر جائے گا یا پھر پاگل ہو جائے گا اسی لیے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور نرمی سے بولا۔

”آپ کے رشتے کے لیے اور کیوں؟“

”کیوں کیا وہ کوئی میرج ہووے کے آخر ہیں۔“

اسے لطف آ رہا تھا فشار چوہدری کو غصہ دلانے میں کیونکہ اس نے کہیں پر پڑھا تھا کہ آپ جاننا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص کیسا ہے تو اسے صرف ایک بار غصے میں دیکھ لیں آپ کو خود بتا چل جائے گا۔ اب وہ اس کی بھی بچی نہیں تھی کہ سمجھ نہ سکتی وہ جانتی تھی کہ اس کا کیا مطلب ہے مگر پھر بھی وہ اسے تنگ کر رہی تھی۔

”نہیں وہ اس لیے آنا چاہ رہی ہیں کیونکہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اب آپ کیا کہتی ہیں اس بارے میں۔“

اب کے فشار چوہدری غصے میں بولا تو وہ شپٹا کر رہ گئی۔ ”میں کیا کہہ سکتی ہوں، میں ابوجا ہیں گے۔“ اور یہ لفظی بات تھی وہ جانتی ہی کہ گھر والے ضرور اس کی شادی پر اعتراض کریں گے کیونکہ اس سے بڑی نشاط تھی۔ پہلے اس کی شادی ہونی چاہیے تھی لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شادی صرف فشار چوہدری سے ہی کرے گی۔ بچپن کے خواب اب جا کے پورے ہو رہے تھے وہ جتنا خوش ہوتی کم تھا۔ پھر دوسرے دن فشار چوہدری کی امی (جو کہ امی کم اور ماڈل زیادہ لگ رہی تھیں) اور اس کی بہن روبی چلی آئیں انہوں نے نشاء کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی بیٹی پر رکھ دیئے۔ اماں

ابا الگ پریشان تھے کہ وہ اتنے امیر لوگوں میں رشتہ کرنے سے گھبرار ہے تھے تب نشاء نے ہی صدک اور انہیں اس رشتے کے لیے راضی کیا۔ جس کے لیے اسے تھوڑی سی جدوجہد کرنی پڑی۔ اماں نے کہا بھی کہ وہ پہلے نشاط کی شادی کریں گی جس پر وہ بگڑ کر بولی۔

”کیوں اماں! اگر اس کی شادی اس کے مقدر میں لکھی ہوگی تو ضرور ہوگی مگر میں اس کے لیے اپنا نصیب نہیں چھوڑ سکتی۔“

اس نے نفرت اور حقارت سے نشاط کو دیکھا تھا۔ ملگجے پکڑے بگڑے ہال آکھوں کے نیچے سیاہ جلتے اپنے ہونٹ کا تکی آکھتی وہ اسے سخت بری لگی تھی۔ بالآخر اماں ابا کو اس کا منہ مانا ہی پڑی اور شادی کی تاریخ دے دی گئی۔ نشاط ہواؤں میں اڑ رہی تھی وہ یہ خوش خبری سب سے پہلے بہن کو سنانا چاہتی تھی فون کرنے پر اسے پتا چلا کہ مایاں اپنی بہن کے گھر گئی ہے۔ کچھ دنوں کے لیے اسے دکھ ہوا تھا اس کی سب سے اچھی دوست ہی اس کی شادی میں شریک نہیں ہوگی مگر اس کے کچھ دنوں میں وہ سب بھول گئی مایاں کو نشاط کی آنکھوں کے آنسو یہاں تک کہ وہ خود کو بھی بھول گئی تھی۔ بھیجن جن کپڑوں کو وہ حسرت سے دیکھا کرتی تھی اسے اس نے جی بھر کر خریدا ہر مہنگے سے مہنگا پرفیوم سوٹ، جوتے، میک اپ اس نے ہر چیز خریدی اپنی شادی کی ساری شاپنگ اس نے مہنگے مہنگے مول سے کی وہ جس جس چیز پر ہاتھ رکھتی فشار چوہدری اسے لے کر دے دیتا۔ وہ بھی حیرت سے خود کو آئینے میں دیکھتی کیا واقعی اس کے بچپن کے دیکھے وہ سارے خواب سچ ہو رہے تھے کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ کوئی خواب دیکھیں اور وہ سچ ہو جائے۔ وہ اکثر سوچتی مگر اب تو اسے سوچنے تک کا وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ سارا دن فشار چوہدری کے ساتھ شاپنگ

کرتی پھرتی۔ پھر کسی ہٹل سے وہ لوگ ڈنر کرتے۔ اس نے اپنا فریج پھر تک خود لیا تھا مگر پیسے فشار چوہدری کے ہی تھے۔

☆.....☆

اور پھر وہ دہن بنی کچھ خواب کچھ امید کے لیے اور کچھ جگنو لیے وہ نشاء فشار چوہدری بن کر اس کے گھر آگئی۔

بیٹھے بیٹھے اس کی کمر آکر گئی تھی مگر فشار کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اس سے مزید بیٹھنا دوبھر ہو گیا تو وہ بیڈ کے بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور حیرت سے اپنے آپ کو دیکھنے لگی۔

”کیا سچ میں اب میں امیر ہوں مجھے کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑے گا۔“ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب وہ سو گئی۔

صبح کو جب وہ اٹھی تو فشار ٹیبل کے سامنے کھڑا اپنے بالوں میں برش کر رہا تھا اسے دیکھ کر مسکرایا تو نشاء کو ایک دم شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ دہن کے لباس پہن کر آگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی فشار مسکرا کر ناواں اٹھتا ہوا تھا۔

”اٹھ کیوں اب! آج کمزوری ڈارنگ مجھے ابھی اور اسی وقت ایک میٹنگ میں جانا ہے۔ نیچے ٹیبل پر میں تمہارے لیے ناشتہ لگا کے رکھتا ہوں باہر ڈرائیور ہر وقت موجود رہے گا تمہیں جہاں جانا ہو چلی جانا میں نے سائیڈ والی ٹیبل پر کچھ کیش رکھ دیا ہے، لے لینا اور میں لیٹ نائٹ آؤں گا پلیز میرا انتظار مت کرنا سو جانا اوکے خدا حافظ، لو یو۔“ وہ جلدی سے کوٹ پہنتا کمرے سے چلا گیا جب اس نے حیرت سے اپنی شادی کی پہلی صبح کو دیکھا پھر دل کو بہلا کر بولی۔

”شاید کوئی بہت ہی ضروری میٹنگ ہوگی ورنہ وہ اس طرح سے مجھے چھوڑ کر بالکل بھی نہ جاتے۔“ وہ خود کو تسلی دیتی اپنا زیور اتارنے لگی۔ نہا کر اس نے اپنا سب سے خوب صورت اور مہنگا سوٹ پہنتا تھا

ایک ہاتھ میں چار سونے کی چوڑیاں اور دوسرے ہاتھ میں ڈائمنڈ سے جڑا انگن کانوں میں ڈائمنڈ کی ہی بالیاں اور گولڈ کی چین جس میں دل کی شکل کا ننھا سا ڈائمنڈ جگمگا رہا تھا پہن کر اس نے ماکا ہلکا میک اپ کیا اور اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ کر گلے میں دوپٹہ ڈالے وہ نشاء پرویز تو بالکل نہیں لگ رہی تھی جو ہر وقت ایک ہی سوٹ پہنتی رہتی، اپنے حالات سے سخت نالاں رہتی یہ تو کوئی اور ہی نشاء فشار چوہدری تھی۔ وہ خود کو حیرت اور بے یقینی سے نبھانے لگتی ہی دیر آئینے میں دیکھتی رہی، چونکی تو اس وقت جب نوکرانی دروازہ ناک کے اندر داخل ہو کر بولی۔

”وہ بی بی جی ناشتا تیار ہے جی۔“

”آئی اور روٹی کیا ٹیبل پر ہے جی۔“ وہ اپنی ساس اور منہ کے بارے میں پوچھتے ہوئے اپنے بالوں میں جلدی جلدی کنگھا کرتی لگی اور بھی نوکرانی کے جواب نے اس کے ہاتھ روک دیئے۔

”وہ جی میڈم تو ایک پارٹی میں گئی ہیں اور روٹی بی بی تو اپنے دوستوں کے ساتھ کلب گئی ہیں جی۔“ وہ یقینی گھر پر کوئی نہیں ہے، اس نے حیرت سے پوچھا۔

”جی بی بی کوئی نہیں ہے جی۔“

”اچھا میں آتی ہوں۔“ وہ آہستہ سے بولی اور بے دلی سے اس کے پیچھے چلتے ہوئے آکر ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ پوری ٹیبل یہاں سے وہاں تک نبھانے کتنے ہی کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ ایک وقت تھا جب وہ ایک ایک چیز کے لیے ترتی تھی اور آج یہ وقت تھا کہ ہر چیز اس کے پاس تھی مگر وہ خوش نہیں تھی۔ بہت پہلے کہیں مایاں کی بات اسے یاد آگئی۔

”تم نہیں جانتیں امیر لوگوں کی دنیا بڑی بناوٹی ہوتی ہے، یہاں تک کہ ان کے جذبات احساسات

تک بناوٹی ہوتے ہیں اور یہی بناوٹ انہیں خدا سے دور کر دیتی ہے۔“

”کیا مایاں نے سچ کہا تھا یا پھر.....“

”میڈم کھانا ٹھنڈا ہو گیا ہے میں گرم کر کے لے آتی ہوں۔“ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ سوچتی نوکرانی کی آواز پر چونکتی ہوئی بولی۔

”نہیں، میں کھانا نہیں کھاؤں گی تم بس میرے لیے ایک کپ چائے لے آؤ میرے کمرے میں۔“

وہ کرسی دھکیل کر بے دلی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ بالکوئی میں وہ کھڑی نہ جانے کتنی سوچوں میں قید تھی۔ اس کا گھر اس علاقے میں سب سے امیر گھر تھا۔ لیکن کیا واقعی وہ امیر تھے؟ وقت کچھ اور گزرا۔ فشار چوہدری کا معمول پہلے دن کی ہی طرح تھا وہ اس کے سونے کے بعد آتا اور جاگنے سے پہلے ہی چلا جاتا اس نے ابھی تک اپنی ساس اور منہ کے پاس بیٹھ کر صرف دس منٹ بات تک نہیں کی تھی۔ وہ سارا دن اور بے گھر میں بولاٹی بولاٹی پھرتی۔ اس کو گھر کے وہ دن یاد آ رہے تھے وحشت ہونے لگی تھی اور پھر آج جب اتفاق سے فشار چوہدری ناشتے کی ٹیبل پر اسے ملا تو اس نے اسے نہ دیا تو وہ نرمی سے بات بدل کر بولا۔

”آج شام تم تیار رہنا۔ پارٹی میں جانا ہے بلکہ یوں کرو تم آج میرے ساتھ چلو مارکیٹ سے شاپنگ کر لینا اور پارلر چلی جانا، میں دوپہر کو آ جاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے۔“ وہ خوشی سے بولی کہ چلو کچھ دیر کے لیے ہی یہی وہ اس قید سے آزاد ہوگی۔ اس نے فشار چوہدری کے ساتھ ڈھیروں شاپنگ کی پارلر گئی اور جب وہ وہاں سے تیار ہو کر باہر نکلی تو فشار چوہدری اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا پھر مسکرا کر بولا۔

”ونڈرفل! بہت خوب صورت لگ رہی ہو تم۔“ وہ تھوڑی شرم کا گامڑی میں بیٹھ گئی اور جب وہ

پارٹی میں گئی تو نہ جانے کتنی نظروں نے اس کا تاقب کیا تھا۔ عورتوں کی رشک بھری نظریں اس کے چہرے پر گئی۔ ایک تو وہ ہی خوب صورت لمبے بال گوری رنگت اور بڑی بڑی آنکھیں ستواں ناک اور آج تو کچھ بیویشن کا کمال بھی تھا اور ایک اس نے پہلی بار ساڑھی پہنی تھی۔ وہ تو جیسے جاتے ہی پوری محفل کی جان ہی بن گئی تھی۔ بھی فشار چوہدری اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے ایک آدمی کے پاس لے جا کر بولا۔

”ارے نہال صاحب! کیسے ہیں آپ ان سے ملیے شی ازمانی و الف!“

”اوہیلو! کیا نام ہے آپ کا؟“

نہال اپنی گندی نظریں اس کے چہرے پر جھرا کر بولا اور ساتھ ہی اپنا ہاتھ بھی بڑھا دیا۔

دیکھا جو پرسکون انداز میں مسکرا رہا تھا۔

”ہیلو! میرا نام نشاء فشار چوہدری ہے۔“

اس نے دل کڑا کر کے اپنا ہاتھ نہال کے ہاتھ میں دے دیا جس پر نہال نے اپنے لب رکھ دیے۔ اسے تو جیسے کرنٹ لگا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ بھی پوری محفل میں ہڑ بڑی مچ گئی اور فشار چوہدری بھی اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اسے لیے آگے بڑھ گیا۔ وہ جو کوئی تھا بہت بڑی ہستی تھا۔

نشاء نے حیرت سے سب کو دیکھا جو اس آدمی کے آس پاس منڈلا رہے تھے۔ ان میں فشار چوہدری نمبر ایک پر تھا جو ہنس ہنس کر اس سے باتیں کر رہا تھا پھر نشاء کا تعارف کروایا تو اس نے صرف ایک نظر اسے دیکھا اور مسکرا کر فشار سے بولا۔

”آئی ایم سوری میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، یہ تو چیف صاحب نے اصرار کیا تو میں چلا آیا۔ میں چلتا ہوں۔“

”ارے آپ تو محفل کی جان ہیں، خیر میری پارٹی میں آپ کو ضرور آنا ہوگا۔“

”ٹرائی کروں گا۔“

ساکرم کہہ کر چلا گیا اور اس کے جاتے ہی سب باتوں میں لگ گئے۔ ہر لڑکی ہر عورت کی زبان پر صرف ساکرم کا ہی نام تھا لیکن اسے حیرت تب ہوئی جب اس نے ہر آدمی کے منہ سے بھی اس کا ہی نام سنا اور رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو فشار چوہدری نرمی سے بولا۔

”تم ساکرم سے ملیں نہیں نا، وہ صرف اس شہر کے ہی نہیں کئی شہروں کے مشہور بزنس مین ہیں۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں ان کا بزنس پھیلا ہوا ہے۔“ اس نے حیرت سے اسے دیکھا آخر وہ اسے یہ سب کیوں بتا رہا تھا اور اگلے ہی پل اس کی حیرت بے یقینی میں اس وقت بدلی جب فشار چوہدری نے کہا۔

”اصل میں ناکل میں نے اسے کچھ فائلیں دینی ہیں۔ نہال کو جس کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

سب میں دو دنوں کے لیے دینی جا رہا ہوں ویسے تو میں نے اس کے ہاتھ بھی بھیج سکتا ہوں بٹ تم جانتی ہو نا کہ ہمارا ڈرائیور چھٹی پر گیا ہوا ہے اور اس کے بدلے نیا آیا ہے۔ مجھے بالکل بھی اعتبار نہیں ہے۔ میں نے ڈرائیور کو اسے بتا دیا ہے اور فائلیں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر پڑی ہیں۔ اسے ملے گی جانا اوکے گڈ نائٹ۔“

وہ اس کا جواب سنے بغیر ہی اسٹڈی روم میں چلا گیا جب کہ نشاء شکل کے لیے پریشان ہو گئی۔

☆.....☆

صبح اس کے اٹھنے سے پہلے ہی فشار چوہدری جا چکا تھا۔ بے دلی سے اس نے کپڑے بدلے کا چل آنگھوں میں ڈال کر وہ نیچے چلی آئی۔ خلاف معمول روٹی اور انٹی ناشتہ کرنے میں مصروف تھیں اس کو دیکھ کر بس رکی مسکرائیں اور دوبارہ ناشتہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ نشاء نے ایک نظر روٹی کو دیکھا بغیر بازو کے ٹائمٹ شرٹ اور جگہ جگہ سے چھٹی جینز پہنے

اپنے براؤن پالوں کو کندھے پر ڈالے وہ آزادی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔ ہلکا سا ناشتہ کر کے وہ فائلیں لے کر باہر چلی آئی۔ ڈرائیور تو بس جیسے اس کا ہی منتظر تھا اسے دیکھ کر اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھول دیا تو وہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اسے بار بار کل رات کا واقعہ یاد آ رہا تھا جب نہال نے اس کے ہاتھ پر کس کیا تھا اور فشار چوہدری جان کر انجان بن گیا تھا۔

”کیا کوئی مرد ایسا بھی ہوتا ہے۔ میں جلدی سے فائلیں دے کر واپس آ جاؤں گی۔“ وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی۔ تبھی اس کی کار ایک جھٹکے سے رکی تو وہ باہر نکل آئی وہ کوئی گھر نہیں عالیشان محل تھا وہ جتنا حیران ہوئی کم تھا۔ گھر کے باہر دو باوردی گاڑی کھڑے تھے جنہوں نے اسے دیکھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ حیران سی اندر چلی آئی۔ صبح انٹوں سے بنا وہ گھر کسی محل سے کم نہیں تھا ہر طرف چولہی کی بول تھے ہر جگہ باوردی گاڑی کھڑے تھے۔ ایک چل چلے لیے اس کا دل چاہا کہ واپس چلی جائے مگر وہ اب اس نہیں سکتی تھی۔

”ارے نشاء صاحبہ آئی ہیں۔ آئیے آئیے کبھی ہیں آپ؟“

وہ حیران سی گھر کو دیکھ رہی تھی کہ ایکدم مسکراتا ہوا نہال جو کہ 35 سال تک کا تھا اس کے سامنے آ کر بولا۔

”جی آئی ایم فائن۔ یہ لیجیے فائل۔“

”آئیے نا باہر کیوں کھڑی ہیں اندر چلتے ہیں کچھ نا تم ہمارے ساتھ مجھ کو لایا کریں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا اور آگے چل پڑا تو مجبوراً وہ بھی اس کے پیچھے چلتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہو گئی اور اس کے کہنے پر ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

”باتی باتیں تو بعد میں ہوتی رہیں گی پہلے یہ بتائیے کیا لیں گی آپ؟“

”جی کچھ نہیں میں بس وہ.....“

”ارے ایسے کیسے چلے گا۔ گاڑی جلدی کرے گی۔“

اس کے منع کرنے کے باوجود وہ بولا تو ایکدم سارے گاڑی کمرے سے باہر چلے گئے۔ نہ جانے کیوں اسے ایکدم کچھ خطرے کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور فائلیں ٹیبل پر رکھ کر بولی۔

”مانیڈمت کیجیے گا مجھے ذرا جلدی ہے۔“ وہ کہتے ہوئے مڑی کہ نہال اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

”ارے ایسے کیسے نشاء صاحبہ جس کام کے لیے آئی ہیں پہلے وہ کام تو کریں پھر چلی جائے گا۔“

”یہ کیا تیزیری ہے میرا ہاتھ چھوڑیں آپ۔“

”ارے بڑی شریف بن رہی ہیں آپ، جیسے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔“

اب کے وہ اس کا رخسار سہلا کر بولا تو نشاء ایک جھٹکے سے الگ ہوئی اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔

”شید آپ کو آپ کے شوہر نے کچھ بتایا نہیں۔“

”کیوں آپ بات کریں اپنے شوہر سے۔“ نہال نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور فشار چوہدری کا نمبر ملا کر اسے فون دیا تو وہ قہقہے مچاتی ہوئی بولی۔

”فشار کہاں ہیں آپ؟“

”کیا بکواس کر رہی ہو جیسا کہ جیسا وہ کہتا ہے ویسا کرو ورنہ میری طرف مت آنا، میں تمہیں طلاق دے دوں گا۔ ارے اتنے میں نے پا پڑیلے ہیں صرف تمہارے لیے اب صلہ دینے کا وقت آیا ہے تو چیخ رہی ہو۔“

اس نے فون بند کر دیا اور نشاء بے حس و حرکت سی کرنے کے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ ایکدم بے جان ہو کر رہ گئی تھی کیا یہ تھی وہ دولت جسے پانے کی چاہ میں وہ پاگل رہی تھی کیا عزت، دولت سے اہم تھی؟

وہ ایکدم نہال کے قدموں میں گر کر پھوٹ

پھوٹ کر روتے ہوئے بولی۔

”پلیز..... پلیز مجھے جانے دیں مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں، مہربانی کریں مجھ پر۔ پلیز اگر آپ سچے مسلمان ہیں تو مجھے کچھ نہیں کہیں گے۔“

کسی نے یہی تھی کہ وہ نشاء پرورن جو کبھی اپنے حالات سے خوش نہیں رہی تھی جس نے بھی کسی انسان کو انسان نہیں سمجھا تھا وہ آج اپنی عزت کے لیے ایک امیر زادے کے قید ہونے میں گری پڑی تھی۔ پتا نہیں اس کی قسمت اچھی تھی یا پھر وہ وقت ہی ایسا تھا۔ نہال اس سے دور ہو کر زور سے بولا۔

”گارڈ میڈم کو ان کے گھر پھونکاؤ“
اس نے بے یقینی سے سر اٹھا کر نہال کو دیکھا تھا جو رخ موڑے کھڑا تھا۔ پھر اس سے بولا۔

”مس نشاء فشار چو بدری کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو دوسروں کو لگی ٹھوکر سے ہی سبق سیکھ جاتے ہیں اور کچھ لوگ ہمیشہ ٹھوکر لگنے کے انتظار میں رہتے ہیں اور کچھ ٹھوکر لگنے کے بعد اٹھ کر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیتے ہیں تاکہ دوبارہ اٹھ کر نہ لگے۔ اب آپ کا انتخاب کن میں ہوتا ہے یہ میں نہیں جانتا۔ آپ جاسکتی ہیں مگر یاد رکھیے گا ہر کوئی نہال نہیں ہوتا جو ہاتھ آیا مفت کا مال ٹھکرا دے۔“ وہ بولا تو نشاء اٹھ کر باہر چلی آئی ڈرائیور اس کا منتظر تھا مگر وہ اسے نظر انداز کیے بے جان قدموں سے آگے بڑھتی چلی گئی۔

کیا یہ تھی وہ دولت جس کے اس نے خواب دیکھے تھے۔ وہ اپنے حال پر کبھی خوش نہیں رہی تھی اور اسے ملا بھی تو کیا آج اس کے پاس دولت تھی، بینک بیلنس تھا پر اپنی ذات کا مان اور یقین نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی نظروں میں بے مول ہو کر رہ گئی تھی۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں میں درد ہونے لگا تھا مگر وہ چلتی جا رہی تھی اور بھی اس کی نظر سامنے سے آتے ٹرک پر پڑی اور وہ

یہ بات جانتی تھی کہ یہاں سے جائے گی تو فشار اسے ہر بار پیچھا گا اور وہ اپنی عزت نہیں بچا سکے گی اور اگر وہ اس کا کہا نہیں مانے گی تو وہ اسے طلاق دے دے گا، عمر بھر کا روگ۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ مر جاتی۔

اس سے پہلے کہ ٹرک اس پر سے گزرتا کسی نے پوری قوت سے اسے پیچھے کھینچا تھا اور وہ لڑکھڑا کر ایک طرف گری اور پھوٹ پھوٹ کر ردی تو نہال نے نہایت دکھ سے اسے دیکھا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”یہ کیا کر رہی تھیں تم؟“
”مر جانا چاہتی ہوں میں اس زندگی سے موت بہتر ہے۔“

”اچھا اب اگر میں تمہیں مرنے دیتا تو کیا ہوتا۔ ایک ناختم ہونے والی سزا تمہارا مقدر تھی۔ بدنامی سے تمہارے لیے اپنی اگلی ساری زندگی جس میں موت کی آغوش سے تم برداشت کرتی کس منہ سے تم اللہ کے پاس جا سکتی۔“ وہ سچ سے کہتا کہ اسے بندی میں نے کتنے ساری زندگیاں گزاریں اور جب تجھ پر ذرہ سی آزمائش ڈالی تو تم نے خود کو بھی حرام سوچ چن لی۔ ہر مسئلے کا حل موت نہیں ہوتا نشاء۔“

پھر وہ اپنے گھر آگئی۔ اماں اب کو جب فشار چو بدری کے بارے میں پتا چلا تو انہوں نے اس کے فیصلے کو ٹھیک کہا اور رفریہ مینے کے بعد اسے ڈاک سے طلاق نامہ موصول ہوا۔ نہ جانے کتنی ہی دیر وہ اماں کے گلے لگ کر اس نام نہاد رشتے کے ٹوٹنے پر ماتم کرتی رہی۔

ابھی کیا کہیں ابھی کیا سنیں کہ
سر فیصل سکوت جاناں

☆.....☆

آج میں نہال کے ساتھ بہت خوش ہوں ابھی کچھ دیر میں ہم ایک ہوٹل میں ڈنر کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ آج میرا ایک پیارا سا بیٹا شاہ زیب ہے۔ میں

اسے بالکل نہال کی طرح دیکھنا چاہتی ہوں۔ نشاط، تریشہ اور عریشہ کی شادی ہو چکی ہے۔ ابا اور امی ہم میں نہیں جب کہ بھائی اپنی بیویوں کے ساتھ ایک خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ میں آج بھی سوچتی ہوں تو ڈر جاتی ہوں کہ اگر اس دن میں خود کشی کریتی تو میرا انجام کس قدر بھیانک ہوتا، اگر مجھے نہال نہ بجاتے تو؟ اس سے آگے میں کچھ سوچ نہیں سکتی۔ نہال مجھے بلارہے ہیں۔“

”بس آتی ہوں۔“
میں کہتے ہوئے جلدی سے شاہ زیب کا ہاتھ پکڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئی اور ہمیں کی طرح آج بھی ٹریفک کے حد تھا۔ ریڈ سگنل پر ٹھہر گئی اور میری نظر ونڈو کے پار نظر آتے اس شخص پر رک سکی تھی میں بے اختیار بھاگتی ہوئی اس تک گئی۔ مجھے پتا نہ تھا کہ کپڑے ایک ٹانگ آنکھوں سے بہتے آتے اس نے بیٹھی کھیاں ہاتھ اٹھا کر جبکہ مانگتا یہ وہ فشار چو بدری تو نہیں تھا جو محفلوں کی جان ہوا کرتا تھا یہ تو کوئی اور ہی تھا جسے اپنے کیے کا دنیا میں ہی عذاب مل رہا تھا اور آخرت میں بھی ملنا تھا۔

”نشاء! مجھے..... مجھ معاف کر دو میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا۔“

”یہ سب.....“ میں اتنا ہی کہہ سکی اور میرے پیچھے آنے والا نہال ساکت رہ گئے جب کہ فشار چو بدری روتے ہوئے بولا۔

”تمہیں طلاق دینے کے بعد کچھ لوگوں نے روٹی کو کڈنیپ کر لیا اور تو وہ میری ساری دولت مانگتے گئے، میں نے انہیں اپنی برسوں سے جمع کی ہوئی ساری دولت دے دی اور انہوں نے روٹی کا گینگ ریپ کر کے اسے مار دیا امی بھی یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور جب میں نے مرنے کی کوشش کی تو ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ ہر کوئی اپنے کیے

کا انجام ضرور بھگتا ہے جلدی یاد رہے۔ مجھے اللہ نے اب تک شاید اس لیے زندہ رکھا ہے کہ میں تم سے معافی مانگ سکوں مجھے معاف کر دو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا تو میں نے اسے کہا کہ میں نے اسے معاف کر دیا۔ میں اٹھ کر ابھی دو قدم ہی چلی تھی کہ ایک دم شروع مچ گیا، فشار چو بدری گناہ کو گناہ نہ سمجھنے والا آج لاوارث موت مرا پڑا تھا، بے شک اللہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ ہم نے گھر سے آتے ہی اس کی تدفین کرائی اور آج میں اللہ کے اس انصاف پر حیران ہوں جو ہماری قسمت میں ہوتا ہے ہمیں ضرور ملتا ہے جلد یا بدیر اور ہم کون ہوتے ہیں اس سے یہ کہنے والے کہ اس نے فلاں کو اتنا دیا اور ہمیں نہیں دیا۔ کسی چیز کے ختم ہونے پر شکوہ مت کرنا کیونکہ اس نے آپ سے صرف ایک چیز لی ہے سب کچھ نہیں۔“

میں نے سوچتے ہوئے ایک نظر آسمان پر ڈالی۔ جہاں پر سورج کچھ نئے وعدے امیدیں اور ارمان لے کر طلوع ہو رہا تھا اس امید پر کہ شاید اب کوئی لڑکی نشاء کی طرح جھٹکری نہ کرے۔ کاش اب کوئی فشار چو بدری نہ ہو۔

”نہال ہر انسان ہمہ ادبی طرح کیوں اچھا نہیں ہو سکتا۔“

”اگر ہر نہال کی زندگی میں نشاء چلی آئے۔ نہ تو نہال کو اچھا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا ہے اور مجھے نئی زندگی مل گئی۔“

”میری بھی زندگی کا حاصل ہیں آپ۔“
میں نے شرم کر کہا اور نہال کے کندھے پر سر رکھ کر ایک بار پھر سے باہر پھینکی نئی صبح کو دیکھنے لگی مگر اب میرے دیکھنے کے انداز میں مایوسی اور ناامیدی نہیں تھی بلکہ ایک نئی امید تھی آس تھی کچھ اچھا ہو جانے کی۔

☆.....☆

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلے وار ناول

زندگی بھر کی محبت نثریں

وہ پریشانی اور فکر میں ہوسٹل کے روم میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ آج اسے ڈسپانچر ہو جانا تھا شہوار نے اس کا سارا سامان پیک کر دیا تھا پنک کاٹن کا ایمر اینڈ سوٹ بھی زیب تن کروا دیا تھا۔ زہرہ بھی آگئی تھیں اور

شوخی و شنگہ سی پکار حمزہ کی واضح تھی۔

”زہرہ میں جلد اپنی بیٹی کو لے جاؤں گا۔“

”بھائی صاحب آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں نیل فرصت آپ کی ہی بیٹی ہے یہ میری بھی بھتیجی ہی نہیں بیٹی ہے۔“ انہوں نے پیار بھری نگاہوں سے دیکھا نیل فرانیس پٹنگ ہی نظر میں پسند آئی تھی خاموش خاموش ڈری سبھی سرخ و سفیدی اس کے نین نقش بھی منفرد تھے اس کے بال دراز تھے لائٹ براؤن کلر کے۔

”ارے بھئی یہ رونے دھونے والے سین تو کریں نہیں۔“ حمزہ نے نیل فرکا بھی چہرہ اداس دیکھ لیا تھا۔ سارا سامان گاڑی میں حمزہ اور مہادر کھائے تھے شہوار اس کے ساتھ ہی تھے۔

”چلو بیٹا! زہرہ نے نیل فرکی پشت پر تھپکی دی۔ سر پر اس کے بینڈیج ابھی بندھی ہوئی تھی رخم ابھی

فصل نمبر 19



بھرا نہیں تھا مگر وہ مکمل طور پر ٹھیک تھی شکلیں احمد نے اسے خود ہی زیادہ سے زیادہ ہوسٹل میں اس لی بھی رکھا گھر میں وہ دیکھ بھال نہیں ہوسکتی تھی۔

وہ چپ چاپ ان سب کی ہمراہی میں چل رہی تھی۔ نیچے ضیاء بھی گاڑی میں موجود تھا اور فہر لگ گاڑی لے کے آیا ہوا تھا۔ جس میں بیٹھ کے اسے جانا تھا فہر کو دیکھ کر اسے وہ رخ اور تکلیف دہ لمحہ یاد آ گیا دانت پیس کے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔

”ابو میں آپ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھوں گی۔“ اس فہر کو گویا انور ہی کیا۔
 ”چلو کوئی بات نہیں جا تو ایک ہی جگہ رہے ہیں۔“ زہرہ فہر کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئیں۔
 وہ سارا قافلہ زہرہ کے گھر پہنچ گیا تھا جہاں کنول پہلے سے موجود تھیں۔
 فہر سیدھا اپنے روم میں چلا گیا تھا کنول نے اس کا تہا ہوا چہرہ دیکھ لیا تھا۔
 ”ارے بھی کنول چائے وغیرہ کا انتظام کیا۔“

”امی نے سب کا انتظام کیا ہے۔“ نیل فر بڑے صوفے پر ٹیک لگا کے بیٹھی تھی اور شہوار اس کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ قسمت بھی دیکھو گئے اسباب بنے اور وہ یہاں تک آ گئی تھی۔ صاف ستھرا کشادہ ڈیکوریٹ کیا گھر تھا نیل فر کو اچھا لگا تھا۔

”فہر کہاں گیا۔“ چائے وغیرہ سب لگ گئی تھی فہر کی غیر موجودگی ضیاء کو چونکا گئی۔
 ”کمرے میں چلا گیا ہے۔“ زہرہ نے بتانا تھا نیل فر اور شہوار ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھنے لگی تھیں۔

”ارے بھی یہ سب کچھ ایسے ہی رکھا ہے شہر میں۔“ کنول نے ملازمہ کو ساتھ لگاتے چائے کے ساتھ لوازمات بھی سینٹرل ٹیبل پر لگا دیے۔
 ”ضیاء کو اور فہر کو بلاؤ۔“ کنول نے مہار سے کہا۔

”بھائی صاحب آپ تو بس اپنی بیٹی کو دیکھے جا رہے ہیں۔ ہم بھی یہاں ہیں۔“ رحمان علی نے بے ساختہ کہا اور خود ہی مسکراتے بھی لگے جب کہ شکلیں احمد جھینپ گئے۔ کنول نے نیل فر کے لیے بیٹ بنائی اور اسے دی۔

”اتنا نہیں کھا سکوں گی۔“ چکن پیسز دیکھ کے وہ گھبرا کے بولی۔
 ”بیٹا کھاؤ پیو ڈاکٹر نے کیا کہا ہے اس وقت صرف خوراک کی ضرورت ہے چلو شاباش۔“ زہرہ نے اس کی سنی ہی نہیں۔

شہوار اور زہرہ بیدہ خالہ کو بھی کنول لوازمات سرور کر رہی تھی فہر اور ضیاء بھی آگئے تھے فہر نیل فر کو دیکھنے سے گریز کر رہا تھا مگر کنول اس کی گھبراہٹ سمجھ رہی تھیں۔
 نیل فر نے بس اچلتی نگاہ ڈالی اور چائے کے سپ لینے لگی۔

”چھپو آپ نے آپی کاروم تو بڑا زبردست سیٹ کیا ہے۔“ حمزہ روم کا تفصیلی جائزہ لے کے آیا تھا۔
 ”انشاء اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے یہ روم ہمیں سیٹ ہو جائے گا۔“ فہر نے دل سے دعا ہی کی۔
 ”میں نے کہا بجی پہلی دفعہ آ رہی ہے ذرا اچھا ہی کروں۔“ زہرہ خوش ہو کے گویا ہوئیں۔ ضیاء اور فہر بھی اپنی اپنی گفتگو میں لگے تھے۔

”زہرہ میری بیٹی کا خیال رکھنا تمہیں تکلیف تو دے رہا ہوں۔“ شکلیں احمد نے ان سے کہا۔
 ”بھائی صاحب یہ میری بھی بیٹی ہے۔“ نیل فر کو اپنا ہی مسلسل موضوع گفتگو بنے رہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

”ابو میں آرام کروں گی۔“ اس نے شکلیں احمد سے سرگوشی میں کہا۔
 ”ہاں آؤ چلو روم میں۔“ وہ کھڑے ہو گئے۔ شہوار بھی اس کے ساتھ ہی اٹھی تھی اصل میں وہ فہر کے سامنے مزید بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔

روم کشادہ تھا وسیع و عریض بیڈرائٹنگ ٹیبل اور ایک طرف صوفہ سیٹ پڑا تھا دبیز پردے پڑے تھے۔
 لان میں کھٹنے والی کھڑکی پر۔
 ”بیٹا! تم اداس نہیں ہونا میں روز آؤں گا۔“ وہ اسے اطمینان دلارہے تھے۔

”آپ میری وجہ سے اپنی وائف سے جھگڑا نہیں کیجیے گا۔“ وہ رک رک کے منمناتے گویا ہوئی۔
 ”جھگڑا تو اس عورت نے مجھ سے آج تک کیا ہی نہیں اور میں تو کروں گا بھی نہیں۔“ وہ کچھ حسرت اور افسردگی سے بھی گویا ہوئی۔

”آپ ابوی وائف کو کدو بات کرتی ہیں۔ ہماری طرح امی بولیں۔“ حمزہ اس کی سن کے درمیان میں بول اٹھا۔
 ”جب وہ مجھے تسلیم کر لیں گی تو میں بھی تم لوگوں کی طرح امی کہنے لگوں گی میں ان پر زبردستی مسلط نہیں ہونا چاہتی وہ دل سے مجھے قبول کر لیں گی تو میں سچے کا مزا بھی آئے گا۔“ اتنی گہری اور پرسونج ہو رہی تھی

شکلیں احمد تو تھیر زہرہ کے ان کی بیٹی بہت حساس اور نازک جذبات رکھتی تھی۔
 ”آپ سچے دل سے بتائیں چاہتی ہیں امی کہیں؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔
 ”ماں کو بھوپا ہے اور ماں کے بھونے کا درد کیا ہوتا ہے مجھ سے تنہا ہونے کا اور اگر دوبارہ سے مجھے

ماں مل جائے تو یہ میری خوش نصیبی ہوگی۔“ لہجے میں اداسی حسرت کھڑکے تھا وہ آج تک اپنی ماں کو یاد ہی کرتی تھی کب سے ایسی زندگی گزار رہی تھی۔ چند سال قبل وہ پاکستان آئی تھی وہ بھی ماں کی خواہش تھی شکلیں احمد کو انگریز کے چکر لگانے پڑتے تھے جس سے وہ بہت ڈسٹرب ہوئے تھے۔ ماں نے یہ ہی سوچ کے پاکستان جانے کی ضد کی تھی۔

”میری امی بہت اچھی ہیں وہ غصہ نہیں کرتی ہیں مگر انہیں چپ لگ گئی ہے۔“ حمزہ بھی اداسی سے بولا تھا۔
 ”ان کا غصہ کرنا حق بنتا ہے کیونکہ تم لوگوں کی لائف میں، میں اور میری ماں تو بلاوجہ آ گئے۔“

”نیل فر میرے بچے ایسی بات نہیں کرو تمہیں اللہ نے اسی طرح دنیا میں لانا تھا اور تمہاری ماں کے نصیب میں، میں ہی لکھا تھا کیونکہ جوڑیاں اوپر والا بناتا ہے اسے ہی خبر ہے کیا کچھ ہونے والا ہے۔“

”ہوں شاید۔“ اس نے سر ہلایا۔
 ”اور آپ یہ بھی دیکھیے مجھے ہمیشہ بہن کی خواہش ہوتی تھی کاش میری بھی کوئی بہن ہوتی دیکھیے اللہ نے یہ قبول کر لی۔“ حمزہ تو اسے پاپا کے بہت خوش تھا وہ ہر دفعہ راستے میں ملی تھی اور اسے حسرت سے ہی دیکھتا ہے کاش یہ میری بھی بہن ہوتی شائد یہ خون کی کشش تھی جو اسے ہر دفعہ متوجہ کر لیتی تھی۔

”ابو آپ تو اداس ہو گئے ہیں۔“ نیل فرنے ان کے ہاتھ تھامے۔
 ”تمہارا باپ اس وقت ایسی پوزیشن میں ہے تمہیں ایک لمحے کو بھی انہیں نگاہوں سے دور نہیں کرنا چاہتا۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئے۔
 ”ارے بھی ماموں جان یہ شہوار اور زبیدہ آنٹی جا رہی ہیں۔“ کنول نے انہیں آ کے اطلاع دی۔
 پیچھے پیچھے وہ دونوں بھی تھیں۔
 ”انکل بہت دیر ہو گئی ہے۔“ شہوار کا سنی کاٹن کے پرنٹڈ کپڑوں میں ملبوس کچھ ان سب کے درمیان جھجکی گئی تھی۔

”ہاں ہاں ضیاء آپ لوگوں کو ڈراپ کرے گا۔“
 ”ابو یہ ذمے داری بھائی کے ذمے ہی کیوں۔“ حزرہ نے نقطہ اعتراض اٹھایا۔
 ”تمہیں تو نہیں سکتا ڈرائیونگ آتی نہیں ہے۔“ وہ بھی جھٹ گویا ہوئے۔
 ”یہ بھی ٹھیک کہاں سے کہہ سکتے والا ہوں۔“ وہ بھی ارادہ باندھ چکا تھا۔
 ”تم اپنی بڑھائی پر غور کرو اور صرف اسپورٹس بائیک چلاؤ گاڑی کے خواب نہیں دیکھو۔“ شکیل احمد اسے ویسے بھی اپنی جلدی گاڑی تو ہاتھ میں لے نہیں سکتے تھے ابھی بیس کا بھی نہیں ہوا تھا ویسے ہی ٹریفک کا اتنا شرسا چھا خاصا نارل گاڑی چلانے والا نہ تھا جس کا ختم ہو جاتا تھا۔
 ”اچھا نیل فرہم چلتے ہیں بیٹا! الٹی سیدھی سڑک نہیں رکھنا آتے رہیں گے ہم ملنے۔“ زبیدہ خالہ نے اسے ساتھ لگا کے پیار کیا اور سمجھایا بھی۔
 وہ سب سے ہی سلام و دعا کے بعد رخصت ہوئی تھیں۔ ضیاء کے ساتھ فرہم بھی جا رہا تھا۔
 ”ابو آپ بھی جائیے بہت وقت گزر گیا ہے۔“ نیل فرہم ان کی بھی ٹکڑھی جو انتظار میں ہوں گی۔
 ”ماموں جان ہم بہت اچھی طرح ان کا خیال رکھیں گے۔“ مہادے نیلے ان کے ہاتھ کی شکلوں کو پر سوچ انداز میں دیکھا وہ کچھ متفکر لگ رہے تھے۔

”آج کی رات تو میں بھی یہیں ہوں پھر کچھ دن بعد نیل فرہم میں اپنے گھر لے جاؤں گی اچھا ہم مل کر انجوائے کریں گے کیوں نیل فرہم۔“ کنول نے مسکراتے لہجے میں تائیدی انداز میں اسے دیکھا۔
 وہ صرف مسکراتے پر اکتفا کر سکی ایک تو اسے فہر کی بھی پریشانی تھی وہ اس سے لائق ہی نظر آ رہا تھا مگر ایسے لوگوں کی خاموشی خطرناک بھی ہوتی ہے۔
 شکیل احمد بھی اسے ڈھیروں ہدایت دے کے رخصت ہوئے تھے حزرہ کو تو نیل فرہم کو گھر لانے کی جلدی تھی۔

☆.....☆

آفس سے واپسی پر وہ اس کے ساتھ ہی تھے اور وہ چہرے پر دنیا جہان کی سنجیدگی لیے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ بلیک پینٹ پر ہاف وائٹ لائنوں والی شرٹ میں ڈسینڈ لگ رہا تھا۔ بلاوجہ تو وہ کسی سے مخاطب ہی نہیں ہوتا تھا اور بہت لیے دے رہے والی شخصیت تھی یا پھر اس کے ساتھ جو کچھ گزرا یہ اس کا اثر تھا۔
 منیب احمد کو ہمیشہ سے یہی لگا شہزاد کو خود کو ان سب کے درمیان اجنبی ہی محسوس کرتا ہے اور وجہ ان کی

ماں تھیں جنہوں نے کبھی اپنا عینیت سے مخاطب ہی نہیں کیا اور شہزاد اپنی ذات میں ہی گم ہو گیا بڑھائی مکمل کی تو منیب احمد نے اسے اپنے برنس میں انوا لو کر لیا حالانکہ اس نے کہا بھی وہ جاب کر لے گا مگر منیب احمد نے اس کی سنی ہی نہیں اور معقول تنخواہ پر ان کے آفس میں آ گیا وہ تنخواہ وغیرہ لیتا ہی نہیں تھا کیونکہ وہ خود کو ان کے احسانوں تلے دبا ہوا محسوس کرتا تھا جنہوں نے پرورش کی تربیت کی اور پڑھایا لکھا کے اس قابل کر دیا تھا وہ آج اپنے پیروں پر کھڑا تھا وہ غلط باتوں میں پڑا نہیں تھا یہ اس کے ماں باپ کی کوئی نیکی تھی جو اچھے گھرانے میں وہ پروان چڑھا تھا نگاہوں میں مزاج میں ہمیشہ اس نے عاجزی ہی رہی تھی سانسے والے کو حقیر نہیں سمجھا جس کسی سے بھی ملتا خندہ پیشانی اور انکساری سے ملتا تھا۔

شاید اس کی یہ ہی شخصیت کی خوبیاں ان کی بیٹی کے دل میں اتر گئی تھیں اور وہ اسے چاہنے لگی تھی انہیں فخر بھی تھا ان کا ہونے والا داماد اچھے گون کا تھا۔

راستہ خاصا خاموشی اور سوچوں کی نظر ہو گیا تھا منیب احمد نے ریسٹورینٹ کے باہر گاڑی روکنے کو کہا۔
 ”آپ کو کیا ہے مناب؟“ شہزاد حیران ہوا کیونکہ اکثر ان کے کلائنٹ میٹنگ کے لیے ریسٹورنٹ میں آتے تھے۔

”نہیں آج میرا موڈ اچھا ہے تم لوگوں میں ڈنر باہر کریں خوب اچھا سا۔“ منیب احمد مسکراتے پر جوش اور فریش لہجے میں گویا ہوئے۔

وہ حیرت و انساٹ میں مبتلا ہو گیا منیب احمد نے آج سے پہلے کبھی ایسا کہا جو نہیں تھا ڈنر وغیرہ باہر بہت کم کرتے وہ بھی برنس ڈیلنگ کے سلسلے میں دورہ کرتا تھا انہیں باہر کے کھانے پسند نہیں تھے۔
 ”انکل آپ تو پسند نہیں کرتے ہیں۔“ شہزاد نے کھانے کی پیشکش کی۔

وہ پھر ان کی ہمرائی میں مشہور و معروف ریسٹورنٹ میں آ گیا۔
 منیب احمد نے سائیکل کی نیل کا انتخاب کیا ویٹر بھی آ گیا آڈر کیا اور شہزاد نے بھی کہا۔

”آپ جو آرڈر کر رہے ہیں وہی ٹھیک ہے۔“ وہ آسٹین فولڈر کے کور پر لکھی ہوئی تھی۔
 ”ارے برخوردار میں نے اپنی عمر کے لحاظ سے آرڈر کیا تمہیں جو پسند ہو۔“ انہوں نے گویا اسے ڈانٹا ہو۔

شہزاد نے مسکراتے ہوئے اپنی پسند کا آرڈر کر دیا ڈنر لگ گیا تھا۔ منیب احمد بھی کھانے سے پورا پورا انصاف کر رہے تھے۔ شہزاد مجھے تم سے اہم باتیں کرنی ہیں جو گھر پر تو مشکل تھا میں علیحدہ میں تم سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔“ ڈنر کے بعد ان کا عقدہ بھی کھل گیا وہ ایسے ہی تو یہاں نہیں آ سکتے، اس نے وہ مودب ہو کے ہلایا۔

”دیکھو بیٹا! مجھے خود غرض نہیں سمجھنا میں جو تم سے کہنے جا رہا ہوں۔“ انہوں نے زیادہ لمبی تمہید باندھنے سے گریز کیا۔

”جی انکل۔“ وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا جو وہ کہنے والے تھے۔
 ”شہزاد تمہارا شادی کا کس تک ارادہ ہے۔“

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا اگر آپ جلدی چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ اس نے جھٹ سعادت مندی کا ثبوت دیا۔

”دیکھو بیٹھا فیصلے دل کی رضا مندی سے ہوتے ہیں اور مجھے خبر ہے تم نے ماہا کو بھی صرف میری خاطر قبول کیا ہے۔“

”انکل آپ سب لوگ میرے لیے احترام کا درجہ رکھتے ہیں پھر ماہا میں ایسی کوئی برائی بھی نہیں میں کیوں انکار کرتا آپ نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی یہ رشتہ کیا ہے آپ میرے ماں باپ کی جگہ ہیں آپ کو اختیار ہے فیصلہ کرنے کا۔“ اس نے جھٹ وضاحت بھی دی۔

”بیٹا! تمہارے ماں باپ کا یہ حق ہے جو میں نے استعمال کر لیا۔“

”آپ ایسے نہ کہیں میرے ماں باپ مل بھی جائیں گے تو آپ میرے لیے پہلے اہم ہوں گے۔“ شہزیل ان کی دل و جان سے عزت اور قدر کرتا تھا۔

”آپ کا جب ارادہ ہو میں انکار نہیں کروں گا۔“

”تمہاری وہ شرط کے تمہارے ماں باپ مل جائیں گے شادی جب ہی کرو گے۔“ وہ جانچتی نگاہوں سے شہزیل کو دیکھ رہی تھی۔

”میری قسمت میں کیا ہے مجھے کچھ خبر نہیں مگر یہ ماہا کے ساتھ نا انصافی ہوگی کب تک وہ انتظار کرے گی۔“ لہجے کی اداسی لفظوں میں عیاں بھی منیب احمد نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”دادی جان کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے وہ ماہا کے لیے مجھے مناسب نہیں سمجھتی ہیں ظاہر ہے میرے خاندان کا یہ نہیں اور کہتے ہیں خاندان اچھا نہیں چاہیے پیدا ہوئی۔“

منیب احمد کو اس کی بات چونکا گئی انہیں انکا شہزیل کے دل کو ٹھیس پہنچی ہے اس دن ماں جی کے الفاظ وہ بھی نہیں بھولے تھے۔

”خاندان تمہارا اچھا ہے کیونکہ تم نے اپنے اندر اہل بیت کے لیے واضح کیا ہے کیونکہ تمہارا خیر صبح جگہ کا ہے ورنہ تم اپنی شخصیت کے خلاف بھی جاسکتے تھے۔“

”یہ تو آپ سب کی تربیت اور پرورش ہے جو میری ہوئی ہے آپ اہل بیت کے درمیان۔“ وہ گویا ہوا۔

”اللہ نے تمہاری تربیت اور پرورش ہمارے گھرانے میں لکھی تھی اس لیے تم یہاں آئے۔“

”پتہ نہیں۔“ لہجے میں محرومی اور مایوسی بھی تھی۔

”شہزیل تم زبردستی کا فیصلہ نہیں کرنا مجھے تمہاری خوشی بھی عزیز ہے۔“

”خوشی، خوشی تو میرے لیے آپ سب ہیں اب تو میرا آنے والا کل بھی آپ ہیں۔“

”بیٹا اتنے اداس اور طول کیوں ہو رہے ہو۔“ انہیں شہزیل کے اندر خالی پن محسوس ہو رہا تھا۔

”نہیں تو۔“ اس نے جھٹ لپی کی۔ اچھا میں تمہاری آئی سے اور ذکر کر لوں پھر ہی آگے کے مراحل پر آئیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ شہزیل کے دل میں یہ خوشیاں پھوٹیں نہ ہی شادی نے اسے تو اپنے گھر والوں کے نہ ملنے کا غم تھا آخری امیدیں تک دم توڑ گئی تھیں۔ شادی کو کب تک روکے گا ماہا کی تعلیم بھی پوری ہو جائے گی پھر دادی جان کے سوالات کب تک وہ ان سب کو ٹالے گا کیا ہوا اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے اپنی زندگی وقف کر دے منیب انکل کے احسانوں کا اور اس گھر کے احسانوں کا بدلہ تو اترے۔

گاڑی ڈرائیو کرتے وقت اس کی سوچیں صرف اپنے گھر گھوم رہی تھیں۔

گھر آ کے وہ سیدھا اپنے روم میں آ گیا تھا فضول تو وہ کہیں بیٹھتا ہی نہیں تھا کوشش کرتا تھا کھانا بھی اکیلے میں کھائے دادی جان کا سامنا کم سے کم ہو۔ آج تو ڈر بھی باہر کیا تھا باہر جانے کا سوال نہیں تھا مگر شہزیل کو جانتا تھا وہ رات میں اپنے روم میں جانے سے پہلے اس کے پاس ضرور آتا تھا۔ اور اس وقت اس کا شہزیل سے بھی ملنے کا موقع نہیں تھا۔

اسے فکر و گھبراہٹ اور پریشانی تھی ماہا کو فیس کرنا تھا جو اتنی ضدی طبیعت کی مالک تھی خبر تو تھی وہ بھی ایسے تو ذرا بھی راضی نہیں ہوگی شادی کے لیے اسے روکھا پھیکا شہزیل نہیں چاہیے ہوگا وہ ماہا کو سمجھتا اور جانتا تھا۔

اس کے دل کی خوشیاں بھی کہیں کھو گئی تھیں۔ ماہا کو وہ چاہنے ہی لگا تھا یا پھر یہ رشتے کی نوعیت تھی جب سے ایک دوسرے سے منسوب ہوئے تھے دل میں اللہ تعالیٰ نے اس کے محبت ڈال دی تھی ورنہ وہ تو ماہا کو ذرا بھی نہیں دیکھتا تھا مگر جیران بھی تھا ماہا کو وہ کب اچھا لگنے لگا جو وہ اپنی جان سے ہی گزرنے جا رہی تھی اس وقت بھی اسے کتنی شرمندگی تھی وہ تو شکر تھا شہزیل منیب انکل اور بشری کو خبر بھی ورنہ تو وہ دادی جان کے مزید طنزیہ جملوں کو سنا اور داشت نہ کرتا اور یہاں سے بھی چلا جاتا اس کا سوچ سوچ کے سر دکھنے لگا تھا۔

☆.....☆

شادی کے دس پندرہ دن پہلے گزریے دعوتوں میں وہ سب بھول گئی مگر جنین کا رویہ اس سے بے نیازی والا بھی نہیں تھا۔ وہ نارمل تھا مگر اپنی طنزیہ تنگیوں سے باز نہیں آتا تھا۔ آریکہ نے خود کو اس گھر میں ایڈجسٹ کر لیا تھا پھر کون سے غیر لوگ تھے جانے لگے تھے اس لیے بھی وہ ریلیکس ہو گئی تھی۔

انیس نے اسے کام کرنے سے منع کیا تھا مگر انیس نے اسے ایک مہینہ تو اپنے نازخڑے اٹھوا لے۔

”آپ پھر کچن میں آئیں گے کیونکہ آپ نے ہی وی دیکھا ہے۔“ انیس نے اسے روک دیا۔

”آریکہ سے انیس کوئی بھی گھر کا کام نہیں کروا رہی تھی۔ وہ اسے نئی دہنوں کی طرح رکھ رہی تھیں۔“

”مجھ سے ٹی وی نہیں دیکھا جاتا اور میں شوق سے دیکھتی تھی۔“ انیس نے اسے روک دیا۔

”کروں گی۔“ وہ تو گھبرا گئی۔

”مجھ سے اتنے دنوں سے کوئی کام نہیں ہو رہا تو مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں بیمار ہو گئی ہوں۔“

”ارے یہ تم کیا کرنے لگی ہو چھوڑو اسے میں روٹی بنا لوں گی تم جا کے حسین کو دیکھو آگیا ہے آفس سے۔“

”آئی آپ ایسے تو نہیں کریں۔“

”یہ مجھے آئی تو بالکل نہیں کہنا ہی کہو سمجھیں اور ہاں تم سے میں کام کرواؤں گی پہلے بیٹھا بناؤں گی پھر کام کرواؤں گی۔“ وہ اسے ہٹا رہی تھیں۔

”یہ کوئی بات نہ ہوئی ضروری ہے بیٹھا بنے گا تو کام ہوگا۔“ وہ بولی۔

”آپ بھائی کو دیکھیں پوچھیے چائے پیئیں گے تو وہ میں بنا دوں گی۔“ حرا اس کا دھیان ہٹانے کو بولی تھی۔

”چائے وغیرہ میں خود بناؤں گی۔“

”ابھی تم اپنے میاں کو دیکھو جا کے۔“ انیس نے اسے مسکرا کے معنی خیزی سے چھیڑا وہ جھینپ گئی۔



Lets Explore The New World!
Join us Today

- ★ FREE REGISTRATION ★
- ★ FREE MEMBERSHIP CARD ★
- ★ FREE INVITATION OF VARIOUS PROGRAMS ★
- ★ SCHOLARSHIP ★
- ★ DISCOUNT VOUCHERS ★
- ★ STUDENT OF THE MONTH ★
- ★ TEACHER OF THE MONTH ★
- ★ GIFT & CERTIFICATE ★
- ★ COMPETITIONS ★
- ★ BIRTHDAY WISHES ★
- ★ LEARNING & DEVELOPMENT ★

Discount Available



UHU

For more discount login to our website

www.uhukids.pk

FABER-CASTELL

آر یکہ کا دل جانے کیوں حنین کے سامنے دھڑ دھڑ کرنے لگتا تھا ہاتھ پیروں میں پسینہ آنے لگتا تھا اس کا ویسے کے روز جا رہا تھا انداز غصہ دیکھ کے وہ ڈر گئی تھی میں دن ہو گئے تھے وہ اس سے بات تو دور کی بات اس کی جانب دیکھنے تک سے گریز کر رہا تھا۔

روم میں آئی تو دیکھا حنین کا بیگ اور جوتے پڑے تھے واش روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی وہ لگتا تھا نہار ہاتھا۔

آر یکہ دھانی پرنٹڈ ایمبر ایمپڈ کپڑوں میں شادی کے بعد اور ہی حسین ہو گئی تھی یہ شہرہ نے اسے کہا تھا اپنا سراپا ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت وہ بلیوٹراؤزر میں ملبوس گلے میں تولیہ ڈالے باہر آیا۔ وہ شیٹا کے آئینے کے آگے سے ہٹ گئی اور وہ ہنوز ناراضی کھلی لیے اپنے کیلے بالوں کو رگڑ رہا تھا پانی کی بوندیں آر یکہ کے چہرے کو بھی چھو گئی تھیں۔

اس کا بیگ اٹھا کے جگہ پر رکھا جوتے بھی اٹھائے اور ڈریسنگ روم میں رکھ آئی۔
”پلیز آنکھ میرے جوتے اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ اسے اچھا نہیں لگا آر یکہ اس کے جوتے اٹھائے۔

”کیوں بیوی اور میری جوتی میں کوئی فرق ہے۔“ طنز کے ساتھ تیر پھینکا۔
”شٹ اپ۔“ کوئیے دور سے بیڈ پر پھینکا۔ آنکھوں میں غصے کی چنگاریاں تھیں جو آر یکہ کے چہرے کو دھکانے لگیں وہ درمیاں میں جا رہا تھا۔
آر یکہ سہمی گئی اس کی دھماڑی سی غلط ناک تیور لیے ہوئے تھی۔ پراعتاد بننے کی بہت کوشش کرتی مگر پھر اس کے سامنے آتی ہے وہ بھر بھری کلاں بن جاتی تھی۔
”تم یہ جوتے اٹھا کے نہیں رکھ رہی تھیں بلکہ طنز سے جوتے مجھے مارتی رہتی ہو۔“ وہ لب بھینچ کر رہ گئی۔

وارڈ روم سے ٹی شرٹ نکالی اور اپنے کمرے پر زیب تن کر لی۔
”بھائی چائے بن گئی ہے۔“ حرا کی آواز آئی۔
وہ دونوں ہی چونک گئے۔

”کیا ہوا زبان بند ہو گئی ہے یا الفاظ گم ہو گئے ہیں۔“
اس نے آر یکہ کے سرخ و پید چہرے پر اچکتی نگاہ ڈالی۔
دروازے پر ناک ہوئی۔
”بھائی میں چائے لائی ہوں۔“

”کیوں تم کیوں لائی ہو تمہاری بھائی نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔“ اب اس کی باری تھی طنز کرنے کی۔

”نہیں تو ہمیں تو انہیں روکنا پڑ رہا ہے یہ تو کام کرنا چاہ رہی ہیں۔“ حرا نے ٹرے سینٹرل ٹیبل پر رکھی۔
آر یکہ کا تو اہانت سے برا حال تھا۔ وہ حرا کے سامنے کوئی بھی تلخ کلامی نہیں چاہتی تھی کہ حرا کو احساس ہو اس میں اور حنین میں ان بن چل رہی ہے اگر انہیں کو خبر ہوئی تو وہ تو فکر مند ہو جائیں گی۔

”میں نے پڑوس میں کہہ دیا ہے ماسی کا انتظام بھی ہو جائے گا اور انہیں کام بھی کرنا نہیں پڑے گا۔“

واضح طنز اس پر تھا وہ پہلو بدل کے رہ گئی۔

”میں نے کام کرنے سے منع تو نہیں کیا۔“ وہ جھٹ گویا ہوئی۔

”مگر میں سمجھتا ہوں اس گھر میں بہت پہلے ہی ماسی کو لگا دینا چاہیے تھا کیونکہ لوگوں کا پتا نہیں وہ تمہیں یہ نہ کہہ دیں کام کے لیے شادی کی ہے۔“

حرا تو ہونٹوں کی طرح اپنے بھائی کی ہمہی باتوں کو نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھے جا رہی تھی۔

آر یکہ کو اس کے سامنے اچھا نہیں لگ رہا تھا وہ کہیں کچھ اور ہی نہ سمجھ لے۔

”بھائی ایسا تو کسی نے بھی نہیں کہا۔“ اس نے معصومیت سے کہا۔

حنین چائے کے ساتھ سلاکس بھی کھا رہا تھا۔

”تم فضول باتوں پر دھیان کم دیا کرو جاؤ۔“ اس نے حرا کو سرزنش کی۔

”ڈانٹ کیوں رہے ہیں۔“ وہ منہ بسور کے منمنائی۔

”سوری بیٹا جھوک لگ رہی ہے تو کچھ غصہ آ گیا۔“ جھٹ اپنے کہے کا احساس ہوا تو اس نے معذرت

بھی کی۔

حرا، حنین کو غصہ کرنے نہ دیکھنے لگی۔

”آپ اس کے سامنے کھول ظاہر کر رہے ہیں۔“ آر یکہ نے حرا کے جانے کے بعد کہا۔

”ایک نہ ایک دن تو ظہر ہو ہی جائے گا۔“ چائے کے سب لینے لگا۔

وہ اس کے سامنے بیڈ پر ہی بیٹھ کر رات کو دونوں فاصلوں پر ہی سوتے تھے۔ حنین تو ایسی کوئی

حرکت کر ہی نہیں رہا تھا جو اسے موندنے سے متاثر کرے۔

”آپ ظاہر کریں گے تو ہوگا۔“ وہ اس کے ہائے سیاہ چہرے کو بغور دیکھنے لگی جو چائے پینے

کے بعد سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ پورے دن کی تنگی کے بعد اس کے ساتھ جسم تک تھک جاتا تھا۔

وہ چپ چاپ بیٹھی تھی اور حنین آنکھیں بند کیے اس کی موجودگی کی مہک کو اپنے اندر اتار رہا تھا۔ جس

دن سے زندگی میں شامل ہوئی تھی اسے یہی احساس خوشی دیتا تھا اور اس کی گھر آر یکہ نے جو دل و دماغ

میں غلط فہمی پھیلائی تھی وہ لکٹی دفعہ دور کرنی چاہی مگر وہ مان کے نہیں دی اور پھر بھی جسے تھک سا گیا تھا۔ وہ

قریب تو تھی مگر فاصلوں پر رہ کر مخاطب ہوتی تھی۔ اندر کی مردانگی پکار پکار کے تنہا ہی وصول کر لے

کب تک وہ کنارے پر بیٹھا رہے گا۔

مگر نہیں وہ ایسا کچھ نہیں کرنا چاہ رہا تھا جو آر یکہ کو اور زیادہ بدظن کر دے اور وہ اسے اپنے مزید بدظن

کیسے برداشت کر سکے گا وہ اس سے سپاٹ اور سنجیدہ لہجے میں ہی مخاطب ہوتا تھا غصہ بھی ہنوز برقرار رکھا ہوا

تھا۔ اولین شادی کی شب اس نے برابر ہی کر دی تھی۔ اس کے ارا مانوں کا خون ہی کیا تھا یہ اسے برداشت

نہیں ہوتا تھا۔

”چپ بیٹھی ہے یہ نہیں میرے قریب آ کے میرے سر میں اپنی انگلیاں ہی چلا دے۔“ یہ خواہشیں اندر

سے بیدار ہوتی رہتی تھیں۔

”میں گھر چلی جاؤں۔“ یکدم ہی وہ گویا ہوئی۔

حنین کا تخیلاتی قتل رک گیا اور آنکھیں پٹ سے کھول دی تھیں۔

”امی بلا رہی تھیں۔“ اس نے بتایا۔

”آپ کی امی بلا رہی ہیں مگر کیوں۔“ وہ اس سے بات سے بات نکال کے زیادہ سے زیادہ اپنے

قریب رکھنا چاہتا تھا۔

”جب سے شادی ہوئی ہے میں رکنے گئی نہیں ہوں۔“ اس نے حنین کی آنکھوں میں دیکھا وہ اسے ہی

بغور دیکھ رہا تھا۔ فوراً ہی نگاہ جھکا لی اس کے سامنے تو اس کے اوسان خطا ہوتے تھے مگر پھر بھی خود کو پراعتماد بنا

کے سامنے ڈٹی رہتی اور طنزیہ تیز میری مار دیتی تھی۔

”شادی کے بعد تو لڑکیوں کا رکنہ ختم ہی ہو جاتا ہے اور پھر تمہیں رکنے جانے کی کیا ضرورت ہے روز

جا کے گھٹنے دو گھٹنے رک کے مل آ کر۔“ اس نے نارمل انداز میں گویا اسے مشورہ ہی دیا۔

آر یکہ نے سلگ کے گرم گرم گھونٹ اندر اتارے۔

”شادی کے وقت ہمارا کوئی ایگریمنٹ نہیں ہوا تھا کہ میں اپنے میکے رکنے نہیں جاسکتی۔“

”ایگریمنٹ تو اس کا بھی نہیں ہوا تھا کہ میری شادی کی رات خراب کی جائے میری تو پہلی پہلی شادی

تھی۔“ لا جواب کرتے ہوئے اسے تو وہ ماہر تھا۔

وہ تو مارے جیاد و ظہر کے چھپ کے لب بھینچ لیے۔ حنین کے ہونٹوں پر مبہم معنی خیز مسکراہٹ تھی جو اس

کا دل جلانے کو کافی تھی۔

”میری کون سی دوسری شادی تھی۔“ حنین کی بڑکی بڑکی کہا۔

”پھر تو یہ تمہارے ساتھ بھی ظلم ہوا تھا۔“

”پلیز مجھ سے یہ بے ہودہ گفتگو تو کیجیے نہیں۔“ وہ دوسری طرف کر لیا۔

اس نے کروٹ آر یکہ کی جانب کی جو غصے میں بیٹھ گیا۔

”بے ہودہ گفتگو میں نے کب کی ہے صرف شادی کی رات کا کہا ہے اس سے آگے کی کہانی تو ہماری

کچھ اور ہی تھی یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔“

”میں جب آپ کے لیے اہمیت اور حیثیت نہیں رکھتی ہوں تو پھر سب کی بھی گنجائش نہیں نکلتی۔“

نخوت اور ناگواری کا اظہار کیا۔

”اہمیت اور حیثیت رکھتی ہو جب ہی میری ماں نے تمہارا انتخاب کیا ورنہ میں اپنی پسند بھی پتا سکتا تھا۔“

”کیوں اپنی ماں کے انتخاب پر سر جھکا یا، کر لیتے اپنی پسند سے۔“ اسے تو رونا ہی آ گیا دامن جان کسی

اور ہی کی بات کر کے اسے ڈی گریٹ کر رہا تھا۔

”زبردستی کے رشتے پائیدار نہیں رہتے۔“

”یہ تمہیں لگتا ہے زبردستی کا رشتہ ورنہ میں نے دل و جان سے سچے دل سے یہ رشتہ قائم کیا ہے۔“

”جھوٹ تو بہت اچھا بول لیتے ہیں۔ مجھے کیا آپ کی وہ ساری نفرت انگیز باتیں یاد نہیں مجھے دیکھ کر

آپ کے سارے کام خراب ہوتے ہیں۔ میں منوس ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو ہی آنے لگے۔

”تم میرے مذاق کو اتنا دل پر لگی مجھے اندازہ نہیں تھا۔ ورنہ میں یہ شادی ہی نہیں کرتا۔“ اس نے دیکھا

آر یکہ کی آنکھوں میں آنسو نظر آرہے تھے۔ دل کر رہا تھا اپنے ہونٹوں سے یہ آنسو چن لے مگر یہ دامن جان تو

شیرینی بنی ہوئی تھی پاس آنے تک تو دیتی نہیں۔

”کیوں کی یہ شادی میری زندگی برباد کر دی۔“
 ”شٹ اپ۔ آواز کو دبا کے بولو۔ امی نے سن لیا تو اچھا نہیں ہوگا۔“ وہ ذرا درشت لہجے میں ڈپٹ کے ہی بولا تھا۔
 ”تمہاری غلط فہمیوں کو میں چاہے کبھی ساری زندگی دور نہیں کر سکتا کیونکہ زندگی میں نہیں تم خود خراب کر رہی ہو۔ بہتری اسی میں ہے کہ صبر کر لو۔“ اس نے ہی ہتھ پیر ڈال دیئے۔
 ”اوہ نہ اپنی امی کے کیسے گئے رشتے کو زبردستی نبھانا چاہتے ہیں۔“
 ”سچ ایسا نہیں ہے آریک تم سمجھنے کی کوشش کرو۔“ وہ بے زاری کے ساتھ روہا نسابھی ہو رہا تھا۔
 ”میں آپ کو اچھی طرح سمجھ گئی ہوں۔“
 ”ٹھیک جو تمہارے دل میں آئے کرو۔“ وہ اٹھا کیونکہ اسے غصہ ہی بہت آنے لگا تھا۔
 ”تم نے تمہیں کر لیا ہے ساری زندگی مجھے اذیت دوگی ایسا میں ہونے نہیں دوں گا اگر تم چاہتی ہو تو میں یہ رشتہ ختم کرنے کا کام کروں۔“ وہ ایسا سخت گیر بن گیا۔
 آریک تو خواہش کرتا تھا کہ وہ اپنی چہرے کا رنگ فق ہو گیا یہ کیا کہہ رہا تھا اتنی آسانی سے رشتہ ختم کرنے کو کہہ رہا ہے۔
 ”میں نے اپنے مطلب کے لیے غلطی کی کیونکہ کام کرنے والی چاہیے تھی۔“ وہ پھر بولا۔
 ”جو تمہارا فیصلہ ہو بتا دینا اور جتنا دل چاہے اپنی امی کی طرف رک کے آؤ میری تم پابند نہیں ہو اگر میں زبردستی کروں گا تو بھی تمہیں مجھ پر شک ہوگا۔“ وہ ہٹا کے لیے ایسا کر رہا ہوں۔“ وہ ہٹا کے روم سے ہی نکل گیا۔
 یہ دیکھتے بغیر آریک کے دل و دماغ کی بنیادیں ہلا رہی تھیں۔ کیسے وہ اپنی زندگی سے بے دخل کر سکتا ہے وہ تو اس کے بغیر رہی نہیں سکتی چپکے چپکے اسے چاہ رہی تھی کہ وہ اس کا بنا دیا گیا تھا۔ دل کو وہ خوش نہیں تھی کہ جنسین کی وہ پسندیدہ نہیں ہے وہ روئے جا رہی تھی۔
 ☆.....☆
 ثریا کو چپکی لگ گئی تھی۔ کلکیل احمد سے وہ ایک بار بھی مخاطب نہیں ہوئی تھیں۔ ضیاء نے سنا کہ وہ بات کر رہی تھیں مگر کلکیل احمد سے لا تعلقی نہیں دیکھا رہی تھیں ان کے کام بھی کر رہی تھیں۔
 ”ضیاء تم آفس میں کہیں بھی شہوار کو سیٹ کر دو۔“
 ”کیوں ابو۔“ وہ جیسے سمجھا نہیں۔
 ”وہ جاب کرنا چاہ رہی ہے میں نہیں چاہتا وہ ادھر ادھر کہیں بھی کرے۔“ ان کی نگاہ ٹی وی پر بھی تھی۔
 ثریا ان دونوں کے لیے چائے بنا کے لائی تھیں وہ بھی سننے لگی تھیں۔ ذکر در شہوار کا تھا اور یہ بھی علم تھا نیل فرکی فرہنگ ہے۔
 ”ابو آفس میں کہیں گنجائش نہیں نکلتی جو نیوایاٹ کیا جائے۔“ اس نے بھی صاف گوئی سے کہا۔
 ”نہیں نکلتی تو نکالو میں جو کہہ رہا ہوں تمہیں سمجھ نہیں آ رہی۔“ وہ تیز لہجے میں گویا ہوئے۔
 ضیاء خفیف سا ہو گیا وہ یکدم غصے میں جو آ گئے تھے۔
 ”ابو معذرت چاہتا ہوں مجھے کچھ کہنا ہے۔“ وہ ڈرتے ڈرتے پھر گویا ہوا۔

ثریا کو کلکیل احمد کے بدلتے رویے پر بھی حیرانگی تھی جو بیٹی کے آنے سے ہر وقت کھوئے کھوئے رہتے تھے۔
 ”اسے ضرورت کیا ہے جاب کی۔“
 ”شوق ہے چند دن کرنے دو پھر میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ اس کا بندوبست کرنا ہے۔“ انداز پر سوچ تھا۔ ضیاء پہلو بدل کے رہ گیا۔
 ”آپ دونوں کی چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ ثریا کو مد اخلت کرنی ہی پڑی۔
 کلکیل احمد نے کپ اٹھا لیا تھا جب کہ ضیاء کسی گہری سوچ میں تھا شہوار کو وہ آفس میں رکھنا نہیں چاہتا تھا مگر ابوی کے آگے چپ ہو گیا۔
 ”سچ میں اس سے بات کر کے تمہیں بتا دوں گا تم اگر انٹرویو لینا چاہو تو لے لینا۔“ انہوں نے کہا۔
 ضیاء اپنا چائے کا کپ لے کے کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”یہ فارملیز کی ضرورت کیا ہے جب اسے رکھنا ہے تو ٹھیک ہے۔“ وہ بھی رکھائی سے کہتا ہوا چلا گیا۔
 ثریا نے فکر مندی سے دونوں باپ بیٹے کی گفتگو سنی تھی کبھی کلکیل احمد اپنی چلاتے تھے ضیاء چڑ کے چپ ہو جاتا تھا۔
 وہ بھی افسردگی سے اٹھنے لگیں۔
 ”آپ کہاں جا رہی ہیں بیٹی۔“ چائے کی کپ ساسر میں رکھا۔
 ”بیٹھے کے کیا کروں گی آپ کے لیے میری سب سے بڑی کوئی معنی نہیں رہتی۔“ لہجے کی افسردگی مایوسی اور خفگی عیاں تھی۔
 ”یہ تمہاری سوچ ہے ورنہ ایسا کچھ نہیں ہے۔“
 ”ہاں یہ میری سوچ ہے ورنہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے میں ہی ہانگل ہوں۔“ ان کی آواز بھرا سی گئی۔
 ”ثریا دیکھو تم مجھ پر غصہ ہوا کرو یہ تمہارا حق ہے مگر میں بھی مجبور تھا۔“ وہ اپنے لیے بے جا ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اپنی بیوی کو کیسے سمجھائیں۔
 مجبور تھے آپ کو کب ایسا لگائیں آپ کے قابل نہیں اور میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا۔
 ”ثریا میں نے دھوکا نہیں کیا ہے تمہیں ساری کہانی بتائی ہے۔“
 ”کیسے یقین کر لوں یہ سچ ہے۔“
 ”میری بیٹی سے پوچھ لو۔“ وہ پھر گویا ہوئے۔
 ”مجھے ضرورت نہیں آپ کی بیٹی سے پوچھنے کی۔“ آنکھوں کی نمی آنچل کے کونے سے خشک کی۔
 ”آپ نے مجھے کبھی اس قابل ہی نہیں سمجھا جو کچھ بتاتے۔“
 ”کیا بتاتا میں نے شادی کر لی ہے تم کیا خوش ہو تیں بلکہ تم مجھے اور ضیاء کو چھوڑ کے چلی جاتیں۔“ انہوں نے کہا۔
 ”مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔“
 ”پلیز ثریا سمجھنے کی کوشش کرو میرا کوئی اس عورت سے جذباتی لگاؤ تو نہیں تھا۔“ وہ انہیں یقین دلانے کی ہر ممکن کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔

”یہ آپ کو لگتا ہے ورنہ حقیقت تو کچھ اور ہی تھی۔“

”ثریا میرے گناہ کی سزا اتنی بڑی نہیں دینا کہ تم پھر بعد میں مجھے ڈھونڈتی پھر تمہارا جو فیصلہ ہے میں تمہیں نہیں روکوں گا زبردستی بھی نہیں کروں گا کہ تم میرے ساتھ زندگی گزارو۔ میری بھی کون سی لمبی زندگی ہے کب کہاں رک جائے۔“

ثریا تو ترپ ہی گئیں ایسا تو وہ ہرگز ہرگز بھی نہیں چاہتیں تھیں۔

”میری بیٹی کی زندگی میں محرومیاں ہی ہیں وہ ویسے بھی مجھ سے یہی کہہ رہی ہے میں تمہیں مجبور نہیں کروں اسے قبول کرو، وہ تمہارے سامنے تک نہیں آئے گی۔“ لہجے میں اتنا درد اور محرومی تھی وہ روم سے ہی چلے گئے۔

ان کا دل بڑا تھا انہیں نیل فر سے کوئی حسد نفرت نہیں تھی اس کی جو کہانی سنی انہیں افسوس ہی ہوا مگر دکھ تو نکلیل احمد نے دیا تھا ان کے پاس ہو کے بھی وہ ان کے پاس نہیں تھے ہر وقت غلٹ میں سوچوں میں گھرا ہی دیکھا تھا احکام کے کہیں بھی گھنٹوں کے لیے غائب ہو جاتے تھے یہ انہیں اذیت ناک سزا لگتی تھی۔

☆.....☆

اسے یہاں آئے ہر ایک ہفتہ ہو گیا تھا اس کے سر کی بینڈیج بھی کھل گئی تھی۔ حمزہ اور نکلیل احمد روز ہی آتے تھے۔

حمزہ تو اکثر رات گئے تک جاتا تھا۔

نیل فر کا دل گھبرا رہا تھا وہ روم سے نکلی نکلی ہی پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھی کاسنی بریڈ ڈکپروں میں سرخ و سپید وہ کوئی ایسا ہی لگ رہی تھی۔ فہر نے اسے اس کے بعد تو وہ روم میں آ جاتی تھی کوشش کرتی کم سے کم اس کا سامنا ہو۔ اب اسے فہر سے ڈر تو نہیں لگا۔ اس کی خاموش نگاہیں جانے کیوں کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی تھیں۔ وہ اس کی جانب دیکھنے تک سے گریز کرتی تھی ڈر پر تو اس کا سامنا ہو ہی جاتا تھا۔

وہ سوچنے لگی کچن میں جائے دیکھے زہرہ کیا کر رہی ہیں۔ عموماً وہ ملازمہ کے ساتھ چمچے کچن میں ہی ہوتی تھیں۔

”مجھے تو بھائی صاحب نے نہیں بتایا۔“

زہرہ کی حیرانگی سے بھری آواز آئی نیل فر کے قدم کچن کے باہر ہی رک گئے۔

”ماموں جان آپ کو بتا کے پریشان نہیں کرنا چاہتے ہوں گے یہ تو مجھے ضیاء نے بتایا ہے۔“

فہر انہیں جانے کس بارے میں بتا رہا تھا نیل فر جس کے مارے متوجہ ہوئی کیونکہ ذکر اس کے باپ کا تھا۔

”بھائی کو ہو کیا گیا ہے۔“

”ضیاء کہہ رہا تھا ماما جان سے سخت ناراض ہیں اور وہ کہہ رہی تھیں وہ اپنے بھائی کے پاس کنینڈا میں ہی رہیں گی۔“

”بھائی سے میں خود بات کرتی ہوں یہ تو بھائی صاحب کے ساتھ بھی ظلم ہے اور بچوں کے ساتھ بھی۔ وہ نیل فر کو قبول نہیں کرتیں نہ کریں مگر اس عمر میں بھائی کو رسوا تو کر کے نہ جائیں۔“ زہرہ کو دکھ و افسوس ہو رہا

”جذبائی لگاؤ کے بغیر اتنا سب کچھ نہیں ہو جاتا۔“ اشارہ ان کا نیل فر کی طرف تھا۔

”میں نے اس عورت سے نکاح کیا اور جو نکاح کے بعد کے تقاضے تھے صرف اسے یہ یقین دلانے کے لیے ادا کیے میں کوئی بدکردار نہیں ہوں، عزت دی ہے تو عزت رکھ بھی رہا ہوں۔“

ثریا لب چل رہی تھیں یہ حقیقت تھی نکلیل احمد کی توجہ اور محبت میں کوئی کمی نہیں تھی مگر اچانک سے کبھی کبھی ملک سے چلے جاتے تھے ثریا پریشان ہو جاتی تھیں۔ مگر پھر نکلیل احمد انہیں سمجھا کے منالیتے تھے۔

”جس وقت رانی نے مجھے امید سے ہونے کی خبر دی میں بہت پریشان ہو گیا تھا وہ بہت خوش تھی کیونکہ ایک عزت دار شریف آدمی کے بچے کی ماں بننے جا رہی تھی۔“

”پلیز مجھے نیند آ رہی ہے میں سونے جا رہی ہوں۔“

ان کے دل پر تو دکھوں کے پہاڑ گر رہے تھے۔

انہیں اس انجانی عورت سے حسد محسوس نہیں ہو رہا تھا جب کہ وہ اس دنیا میں بھی نہیں تھی۔ صرف انہیں نکلیل احمد کے اتنا بڑا راز چھپانے پر دکھ ہو رہا تھا۔ انہیں اس قابل ہی نہیں سمجھا تھا جو انہیں کچھ بتاتے۔

نکلیل احمد نے ایک صحت بھری نگاہ ڈالی ان کی دماغ کی شریانیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ اتنا پریشان تو وہ رانی کے دنیا سے جانے پر نہیں تھے جتنا ثریا کی ناراضی پر ہو رہے تھے۔

”ثریا مجھے یہ سزا نہیں دو۔ میری ساری زندگی تمہاری نظروں کے سامنے نہیں آئے گی میں اسے الگ رکھوں گا۔“ وہ بھی ان کے پیچھے نہیں آ گئے۔

”یہ آپ کی بیٹی کا بھی گھر ہے آپ میرا گھر ہے اس پر یہ پابندی عائد نہیں کریں، اپنی مرضی اس گھر میں رکھیں یا نہیں اور۔“

”مجھے خبر ہے سوتن کی بیٹی کو تم کیسے برداشت کرو گی۔“

”یہ آپ کی سوچ ہے کیونکہ آپ نے پہلے مجھ سے کہہ دیا تھا۔ جب شادی کر رہے تھے جواب اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔“ انہوں نے نکلیا طنز ہی کیا۔

”میں اپنے بھائی کے پاس کنینڈا چلی جاؤں گی۔“ یکدم ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا۔

”کیا کہہ رہی ہو ضیاء اور حمزہ کا سوچا ہے۔“ وہ سن کے گھبرا گئے۔

”ضیاء اور حمزہ کوئی بچے نہیں رہے سمجھ دار ہو گئے ہیں اور ضیاء کی بھی شادی ہو جائے گی۔“

جائے گا۔“ کتنی آسانی سے وہ بولتی جا رہی تھیں۔

”ثریا پلیز اس عمر میں مجھے یہ غم تو نہیں دو۔“ انہوں نے مجرموں کی طرح سر جھکا کے ان سے کہا۔

”غم کے لیے کسی بھی عمر کا ہونا ضروری تو نہیں۔“ اتنی گہری بات وہ بھی طنز یہ۔

نکلیل احمد لا جواب ہی ہو گئے تھے۔

”ایسا کیوں کر رہی ہو۔“ انہوں نے ان کی ان سنی کی۔

”میں جتنی ہوں مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے آپ کی پراسرار شخصیت نے مجھے بہت پریشان کیا ہے۔“ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی تھیں۔ نکلیل احمد کی جانب دیکھنے سے گریز ہی کر رہی تھیں۔ وہ اتنے حواس باختہ اور پریشان ہو رہے تھے ثریا کو ان کے دل کی کیفیت کا بھی اندازہ تھا۔

”میری شخصیت تو تمہارے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہے۔“

تھا۔ ”کیا ابویکی وائف کینیڈا جا رہی ہیں۔“ وہ تو سن کے پریشان ہونے لگی۔

ایسا تو وہ فطری نہیں چاہے گی اس کی وجہ سے باپ اور بھائیوں کو دکھ ملے۔

”آپ ان سے کوئی بات نہیں کیجیے گا۔“ فہر نے کہا۔

”ارے ایسے کیسے چھوڑ دوں اس میں نیل فرکا بھی کیا تصور ہے ماں تو اس کی دنیا سے چلی گئی اور باپ کی محبت بھی وہ ترس ترس کے لے رہی ہے۔“ انہیں سچی سے بھی محبت تھی۔

”آپ نیل فرکے سامنے کچھ نہیں کہیے گا۔“

نیل فرنے قدم موڑ لیے تھے اس کی بے چینی بڑھ گئی تھی یہ کیا ہونے والا تھا اسے کچھ تو کرنا ہوگا ورنہ وہ تو چلی جائیں گی اور پھر وہ ضیاء اور حمزہ کو ماں سے محروم رہیں ماں کی محرومی کا غم کوئی اس سے پوچھے کیا ہوتا ہے۔ باپ بھائی اس سے مہمانوں کی طرح ملنے آتے تھے اس کو ہمیشہ اس کی کمی کا بھی احساس رہتا تھا اور آج جب کہ اسے سب پہ چھل گیا تھا مگر وہ خوشی ابھی تک نہیں ملی تھی اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دے سکتی وہ خود یہاں سے چلی جائے گی۔“ اس نے یہ فیصلہ بھی لمحوں میں کر لیا تھا۔

دروازے پر ناک ہولی تو چمک گئی۔

”کون ہے آجائے۔“ زہرہ نے علاوہ اس وقت کوئی ہو بھی نہیں سکتا تھا وہ سنبھل گئی۔

”لاک گھما کے فہر کا چہرہ نمودار ہوا وہ چونک گئی اور نگار کی گواہی کا اظہار بھی کیا۔

”آپ کو امی بلارہی ہیں اور ہاں چوری چوری کہا تیں نہیں سنی چاہیے۔“ فہر نے اسے جاتے

ہوئے دیکھ لیا تھا۔

نیل فر جزبزی ہو گئی مگر اس کی جانب دیکھنے سے گریز کیا۔

”میں نے کسی کی کوئی باتیں نہیں سنی۔“ تزخ کے رکھائی زدہ بے چینی کہا۔

”نیل فر میں نے تمہیں دیکھ لیا تھا۔“ وہ چوکتھ میں ایسا وہ تھا اور وہ اپنے برے بڑے منہ بنا کے دیکھ رہی تھی۔ اس ظالم کا ہی تو کیا دھرا تھا جو آج اس کے در پر آگئی تھی۔ جانے قسمت اسی کے ساتھ کیا کچھ کرنے والی تھی۔

”آ جاؤ امی بلارہی ہیں۔“ مسکرا کے کہہ کے وہ نکل گیا تھا۔

نیل فر نے دانت ہی پیسے فہر سے جانے کیوں بیرہی ہو گیا تھا جتنا وہ اس سے بچتی تھی آج اسی کے در پر وہ بیٹھی تھی۔

”پھوپھو آپ نے بلایا۔“ اس نے دیکھا وہ ڈانٹنگ نیل پر بیٹھی تھیں۔ لوازمات سے نیل بھی تھی۔

فہر اپنی چیز سنبھال کے بیٹھ گیا تھا۔ کن اکھیوں سے اس کے تاثرات جاننے کی بھی کوشش کی۔

”ہاں بیٹھو میں نے کباب تلے ہیں راتے اور چٹنی کے ساتھ کھاؤ تمہارا منہ کا مزہ بھی ٹھیک ہو جائے گا بیماری میں پھیکے کھانے کھا کھا کے منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔“

”پھوپھو اس وقت دل نہیں کر رہا۔“ وہ فہر کے سامنے بیٹھنا نہیں چاہتی تھی وہ کباب راتے میں ڈوبو کے مزے لے لے کے کھا رہا تھا۔

”ارے کیا تکلفات میں پڑی رہتی ہو بیٹھو اور کھاؤ دیکھو کسی کمزور ہوتی جا رہی ہو۔“

”کمزور تو یہ پہلے بھی تھیں۔“ زیر لب منمننا کے بولا جو صرف نیل فر نے سنا۔

”تم نے کب دیکھا پہلے۔“ زہرہ نے سن لیا تھا وہ حیرانگی سے پوچھنے ہی لگی تھیں۔

”پہلے سے مطلب ہو پتل میں۔“ وہ گڑبڑا گیا اور نیل فر بھی گھبرا گئی۔

”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو ہو پتل میں زیادہ کمزور لگ رہی تھی۔ یہاں ایک ہفتہ ہو گیا ہے ذرا صحت ٹھیک

ہو رہی ہے۔“ انہوں نے گویا سنا سنی کہا۔

”امی پلیز چائے صابرہ سے تو قطعی نہیں بنوائیے گا۔“ وہ منہ بسور کے بولا۔

”میں نے بنائی ہے لے کے آتی ہوں۔ نیل فر بیٹا کھانا شروع کرو۔“ انہوں نے پلیٹ بنا کے اس کے

آگے کی تھی اور خود چائے لینے چلی گئی تھیں۔

”اتنا کیوں سوچ رہی ہو کھاؤ صحت تو ٹھیک کرو مستقبل قریب، میں میرے بچے بھی پالنے ہیں۔“ بے باکی تھی ہمیشہ کی طرح ابھی بھی اس کے لہجے میں وہ تو کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گئی مگر غصے سے اسے گھورا جو مسکرا رہا تھا۔

”شٹ اپ۔“

”کچھ بھی کہو یہ میری محبت کی چائے ہے جو تم آج میرے سامنے میرے گھر میں بیٹھی ہو۔ ایک دن ہمیشہ کے لیے میرے پہلو میں بھی آ جاؤ گی۔“

وہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی ایک سیڈنٹ کے لیے زیادہ ہی حساس ہو گئی تھی۔

”بیٹھ جاؤ ابھی تمہارا زخم ٹھیک نہیں ہے اتنا صبر نہ کرو۔“

”میں مر جاؤں گی مگر آپ سے؟“ آگے بولتے ہوئے زخ زخ گئی۔

”کیا آپ سے شادی نہیں کروں گی یہی کہنے والی تھیں۔“ اسے اگائے جا رہا تھا اور وہ اندر ہی اندر

بچ و تاب کھا رہی تھی۔ زہرہ چائے کی ٹرے لے آئی تھی۔

”ارے لڑکی تم نے کھانا ہی نہیں کھایا۔“

”پھوپھو پوچھ کہہ رہی ہوں دل نہیں کر رہا۔“ اور واقعی فہر کی ایسی بے باکانہ بات کہ اس کا کھانے

کادل ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اٹھنے لگی۔

”آپ تو بھاگنے پر تلی رہتی ہیں۔ روم سے نکل کے بھی بیٹھا کریں۔“ فہر اپنی عادت سے باز نہیں آیا۔

زہرہ نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا۔

”فہر ٹھیک کہہ رہا ہے ہر وقت کمرے میں نہیں رہا کرو بیٹا یہ تمہارا ہی گھر ہے۔“

نیل فر کو زبردستی کھانا پڑا تھا اور وہ اس کی حالت سے مزے لے رہا تھا یہاں آنے کے بعد پہلی بار اس

نے نیل فر کو ایسے مخاطب کیا اور چھیڑا بھی۔

اس نے کباب کو زبردستی ہی نگھا ذہن اس کا پہلے ہی الجھا ہوا تھا۔ شکلیں احمد کی فکر ضیاء اور حمزہ کی فکر ان کی

ماں ان کو چھوڑ کے جا رہی تھی۔

”تھوڑا اگر میری ماں کا ہاتھ بنادیں تو ہرج تو نہیں۔“

”فہر کیا ہو گیا ہے وہ مہمان ہے اور بیمار بھی ہے ہاتھ بٹانے کی ضرورت نہیں ملازمہ رکھی ہوئی ہے۔“

انہوں نے فہر کو خوشنکس لگا ہوں سے گھورا تھا۔

نیل فرخانی ہو گئی فہر کی پہلے ٹون دوسری تھی اور اب وہ اپنے گھر میں زیادہ ہی اکر بھی رہا تھا۔
 ”جاؤ آرام کرو۔“ انہوں نے اس کے رخسار پر پھینکی دی وہ تیزی سے اٹھی اور چلی گئی۔
 دل گر رہا تھا فہر کا منہ نوج لے جو اس سے مسلسل جلانے والی باتیں ہی کر رہا تھا۔
 ”مستقبل قریب میں میرے بچے پالنے ہیں۔“ یہ جملہ اس کے کان میں بازگشت بن کے گونج رہا تھا۔ اسے تو شرم و غصے سے پسینے ہی آرہے تھے مزید وہ یہاں رہی تو اس کی بے باکیاں بڑھتی ہی جائیں گی اور ایسے میں یہاں سے جانے کی ضد کی تو ٹھیک احمد کوئی پریشانی لاحق ہو جائے گی اور سب ہی سوال اٹھائیں گے کیوں جا رہی ہے وہ پھر سب کو کیا بتائے گی۔
 ”نہیں ابھی وہ ایسا کچھ نہیں کرے گی اور فہر سے ڈر کے کیوں جانے ڈرانے کی باری تو اس کی ہے۔“
 اس کے دماغ نے بہت کچھ سوچ لیا تھا۔

”ویسے فہر ٹھیک تو کہہ رہا تھا اسے زہرہ کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔“ وہ لان میں کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی تھی اور باہر لان میں دیکھ رہی تھی شام دھیرے دھیرے ہو رہی تھی۔ لائٹس بھی آن نہیں اس کا دل بہت اداس اور ویران ہو گیا اس کے ماتھے پر جانے خوشیاں آنے سے پہلے روٹھ کیوں جاتی ہیں۔ دنیا میں آنے کی اسے اتنی بڑی سزا کیوں مل رہی ہے۔
 ”کاش امی آپ اتنی جلد ہی جاتیں میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے کوئی رشتہ بھی میرا نہیں ہے۔“
 رنجور اور رملول سی ہو رہی تھی۔
 چند دنوں پہلے اس کی زندگی کیا تھی اور کیا بدلتی آگئی تھی اور والے نے اسے آزمائش میں رکھا ہوا تھا کہیں تو کوئی کوتاہی کوئی گناہ تو ہوا ہے ورنہ سزا ایسے تو نہیں ملتی۔
 آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔ چہرہ اس کا مرجھا کے رہ گیا تھا۔ کل کی نیل فر سے چند دن بعد کی نیل فر مختلف تھی۔
 ”مجھے ایسا کچھ کرنا ہے جو سب خوش رہیں۔“ اس نے مصمم ارادہ پانڈا لیا تھا۔ زہرہ کے ساتھ وہ گھر جا کے شرمائے گزرتا کے کہہ گی وہ نہ جائیں اتنی بڑی سزا دے کے نہ جائیں وہ خود کوئی سب کی نظروں سے ہٹا لے گی۔
 ”میری قسمت میں اگر یہی ہے تو پھر مجھے وہی کرنا ہے جو مجھے ٹھیک لگ رہا ہے۔“ مری سے وہ ہٹ گئی تھی اور صرف وہی سوچ تھی جو اسے کرنا تھا۔

☆.....☆

وہ یونیورسٹی جانے کے لیے تیار کھڑی تھی آخری کلاسز اس کی چل رہی تھیں اس کے بعد اس کے ایگرام ہو جانے تھے اس نے سوچ لیا تھا رزلٹ کے بعد وہ کسی کالج میں پچھرا کر کی جاوے گی۔
 ”امی نوادے کہیں مجھے یونیورسٹی ڈراپ کر دے۔“ وہ بشری سے کہہ رہی تھی۔
 ”فواد کو اٹھانے کے لیے ایک بندہ چاہیے جو اسے بار بار جگاتا رہے دس گھنٹے میں اٹھے گا تم شہزہیل کے ساتھ کیوں نہیں جا رہی ہو۔“
 ”مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا۔“ اس نے سوچ لیا تھا وہ شہزہیل سے کم مخاطب ہوگی تاکہ اس کے دل اور آنکھوں میں جو ناگواریت نظر آتی ہے وہ کسی طرح تو ختم ہو۔

”آئیے۔“ اس نے ماہا کو بلایا۔ بلیک بینٹ پر گرے شرٹ میں ملبوس وہ پارکنگ لگا رہا تھا۔
 نگاہ چرائی۔

”میں نوادے کے ساتھ جا رہی ہوں۔“ نروٹھے پن سے کہا۔
 ”فضول کے نعرے نہیں کرو جاؤ۔“ بشری نے ڈپٹ کے کہا۔
 شہزہیل باہر نکل گیا تھا اور وہ جلدیلا کے رہ گئی۔
 ”آپ کیوں مجھے اس کے ساتھ بھیج رہی ہیں۔“
 ”روز جانی ہو۔“ انہوں نے کہا۔
 دیکھو ہر وقت کا غصہ اچھا نہیں ہوتا ہے اور اس کو کیوں دکھاتی رہتی ہو۔“
 ”اس لیے کہ وہ مجھے لاابالی سمجھتا ہے۔“
 ”خود کو بدلو۔“ انہوں نے پھر کہا۔

ماہا غیر چٹختی ہوئی چائے کی فنٹ ڈور کھولا اور دھڑپے سے بیٹھ گئی شہزہیل نے اس کے تیور دیکھے جو خات خطرناک لگ رہے تھے۔ بشری تو ہر وقت ہی لگتی تھی اس وقت تو اس کا حسن اور جگمگا رہا تھا پنک سوٹ میں غازوں پر سرخ سرخ لالی آنکھوں میں غصہ بھی تھا۔ شہزہیل نے اس کو خاصی گہری نگاہوں سے ہونٹوں پر مبہم سا تبسم کیے دیکھا غیب احمد نے جب سے شادی کی بات کی تھی شہزہیل نے خود کو ذہنی طور پر تیار ہی کر لیا تھا اور ماہا کو سوچنا شروع کر دیا تھا اس کی خاصیت تھی اس جنگجو لڑکی سے جانے کب لگاؤ ہو گیا اپنی تمام تر بے وقوفانہ حرکتوں سمیت اسے وہ معصوم سی چھوٹی لڑکی کی صورت اپنی پسندیدہ چیز حاصل کرنے کے لیے ضد کرنا ورنہ ناہونا شروع کر دیتی تھی اور اس نے شہزہیل کی اسی طرح حاصل کر لیا تھا۔ مگر شہزہیل نے کبھی اپنے جذبات اور محسوسات سے اسے آگاہی نہیں دی تھی جب کہ ماہا جب موقع ملا اپنے جذبات اس پر عیاں کرتی رہی تھی اور ابھی بھی بچوں کی طرح اسے غصہ ہی دکھا رہی تھی مگر مجھ نہیں آ رہا تھا کیوں غصہ آ رہا ہے۔ آپ ہر وقت غصے میں کیوں رہتے لگی ہیں۔“ اس نے استفہامیہ سوال اٹھا دیا۔
 ماہا نے چوتھن سیکڑ کے اس پر نگاہ ڈالی اور پھر نخوت سے واپس وینڈا سکرین سے اپنے کمرے کی طرف ہٹا۔
 ”میں تم سے بات تک نہیں کرنا چاہتی۔“ اب میرا کیا قصور ہو گیا۔“ وہ ہنسا۔
 ”سارے قصور تمہاری طرف ہی نکلتے ہیں۔“ دانت پیسے۔
 ”میں سمجھا نہیں۔“ گاڑی وہ بڑی مہارت سے ڈرائیو کرتا تھا ماہا نے اس کی اس خوبی کو دل میں سراہا تھا۔

”جپ چاپ ڈرائیو کرو۔“
 ”دیکھیں سارے فیصلے آپ کی مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں ابھی بھی مجھ پر غصہ ہے۔“
 ”کون سے فیصلے۔“ وہ چونک کے گھومی۔
 ”شادی کرو تو رہا ہوں پھر بھی آپ مجھ سے ناراض ہیں۔“
 ”سنو شہزہیل مجھے تم سے ایسے زبردستی شادی نہیں کر لی تم باپا کے دباؤ میں آ کے رضامندی دے دو جب کہ تم نے خود کہا تھا تمہارے گھر والے جب تک تمہیں ملے لیں تم اس وقت تک شادی نہیں کرو گے۔“ وہ گویا ہوئی۔

رواۓ ڈاکٹر

سیدہ فرزانه حبیب فرزین کی ڈائری سے

ایک چاہت بھری نظم

اک بل کا سہارا نہ چاہت ملے
اب تو خواہش ہے یہ
دشت ہی دشت ہو شکے پاؤں چلیں
ہم سر بزم شمع کی مانند چلیں
جس کو چاہیں اس کو پھر نہ پائیں کبھی
چھوڑ جائیں یوں چپ چاپ دنیا کہ پھر
دل یہ چاہے بھی تو ہم نہ آئیں کبھی
اب تو خواہش ہے یہ
کوئی صحرا قلعہ یا بیابان ہو
جس میں سالوں تلک قید ہی قید ہو
اپنے خالق و مالک سے میں نے جو کی
لے وفا کی..... وہاں پر وہ ناپید ہو
اب تو خواہش ہے یہ
رومے جاؤں تو چپ نہ کرائے کوئی
دور چل میں یا پھر کسی دشت میں
ہاتھ ملے میرا چھوڑ آئے کوئی
اب تو خواہش ہے یہ

سعدیہ عابدی کی ڈائری سے

قتیل شفا کی نظم

تمہیں معلوم ہے جاناں!
کہ تم بھی ایک قاتل ہو
میرے اندر کا اک ہنستا ہو
انسان تم نے مار ڈالا ہے
بھلا ہم اس قدر لاچار کب تھے

میری چاہت تھا، وہ میری انا بھی تھا
میرے خاموش لہجوں کی وہ ایک صدا بھی تھا
رہتا تھا صبح و شام وہ میرے وجود میں
میری آواز، میرا لہجہ، وہ میری ادا بھی تھا
دیتا تھا مجھ کو شہدہ بے حساب مگر
ہمدرد بھی تھا میرا وہ میری وفا بھی تھا
اب اس کے ذکر پر اکثر حاشا و شواہد
کبھی میری محبت کی وہ ادا بھی تھا
عجب نگاہیں تھیں میری زندگی میں تال
پوچھنا اسے بھی تھا اور دل میں خدا بھی تھا

ریما نور رضوان کی ڈائری سے

نازیہ کنول نازی کی خوب صورت نظم

اب تو خواہش ہے یہ

دروایا ملے
سانس لینے کی حسرت میں مرجائیں ہم
اب تو خواہش ہے یہ ایسی آندھی چلے
جس میں پتوں کی مانند پھرجائیں ہم
اب تو خواہش ہے یہ دنیا والوں کا غم
ایسی ٹھوکر لگائے کہ جی نہ ٹھیکیں
ایسی انجھیں یہ سینے میں سانس کہ بس
ہم دوا پینا چاہیں تو نہ پنی سکیں
کوئی ہم نہ راہی نہ راحت ملے

شہزہیل نے گاڑی سائڈ پر لا کے روک دی۔
”میرے گھر والوں کا کوئی اتنا پیہ نہیں چل رہا کب تک میں آپ کو الٹا کے رکھوں گا۔ دادی جان کو
الگ پریشانی ہے۔“ اس کے لہجے میں افسردگی تھی۔
”دادی جان کی باتوں کا تم نے اتنا اثر لیا اور ایک دم فیصلہ کر لیا۔“ ماہا کو ایسے تو شادی کرنی ہی نہیں تھی
شہزہیل دوسروں کی مرضی کے آگے سر جھکا رہا تھا اس کے دل میں محبت تو نہیں ہوتی وہ اپنے لیے شہزہیل کی
آنکھوں میں محبت دیکھنا چاہتی تھی اس کی سمجھ آگیا تھا بغیر محبت کے زندگی خوب صورت نہیں ہو سکتی۔ ساری
زندگی وہ شہزہیل کا انتظار کرتی تھی لیکن کسی اور سے قطعی شادی نہیں کرے گی۔
”میں نے بہت سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا ہے۔“

”کیا سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا میں بھی تو سنوں۔“ ماہا کا لہجہ فہمائی اور طنز یہ ہو گیا۔
”میرے گھر والوں کا کچھ اتنا پیہ نہیں ہے آپ کب تک انتظار کریں گی آپ کے ماں و باپ کو آپ کی
بہت فکر ہے۔“
”تمہارے سنبھالنے والے میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور میں بوجھ بن رہی ہوں اپنے ماں و باپ
کے لیے۔“ وہ تو لٹائی ہوئی تھی۔
شہزہیل تو جھٹکا کھا کے رہ گیا وہ اپنی تلخ ہنکڑی ہو رہی تھی جو منہ آیا بولتی گئی۔
”آپ میری ہر بات کا غلط مطلب لے رہی ہوتی ہو۔“ اسے بھی غصہ آگیا۔ ماہا پہلو بدل کے رہ گئی۔ تم
بول ہی ایسے رہے ہو۔“
”آپ کال کھول کے سن لیں آپ کی مرضی کے مطابق میں نے فیصلہ کر لیا ہے میں شادی کر رہا
ہوں۔“ آنکھوں میں غصہ اور لہجے میں اس کے مصمم ارادہ تھا۔
”مجھے ایسے شادی کرنی ہی نہیں ہے اور پلیز گاڑی چلاؤ میرا سانس بیٹ ہو رہا ہے۔“ وہ تو تنک ہی
گئی۔

شہزہیل نے گاڑی اشارت کر دی اور وہ منہ گھما کے بیٹھ گئی وہ مسلسل اسے دیکھ رہی تھی۔
یونیورسٹی آگئی تھی وہ اس سے بات کیے بغیر ہی اتر گئی۔
”واپسی میں، میں لینے آؤں گا۔“
”شکریہ اس کی ضرورت نہیں میں فواد کو بلا لوں گی۔“ نخوت سے کہا۔
”میں نے جو کہا وہ سنیں میں لینے آؤں گا۔“ وہ سنجیدہ اور درشت آواز میں گویا ہوا۔
ماہا پیر پختی ہوئی اندر چلی گئی اس نے نگہ زدہ انداز میں اسے دیکھا تھا۔
ماہا کی سمجھ نہیں آ رہا تھا آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ شادی کرنا چاہ رہا ہے تو بھی اسے اعتراض ہے جب کہ
اس نے تو بہت سوچنے کے بعد رضامندی دے دی تھی منیب احمد باپ تھے اور ہر باپ کو اپنی بیٹی کی ایسے
ہی فکر ہوتی ہے۔
شہزہیل کو بھی اپنی بہن یاد آگئی جو ماہا کی عمر کی ہوگی جانے کیسے ہوگی شادی ہوئی ہوگی یا نہیں، شہرہ اس
سے بھی چھوٹی تھی وہ گاڑی چلا رہا تھا مگر خیالوں میں بھی گم تھا اس کی شخصیت بکھر کے رہ گئی تھی۔
(جاری ہے)

الشعار

زندگی تمج کی مانند جلاتا ہوں ندیم
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا
حناعلیٰ سیالکوٹ
ہماری شرط وفا یہی ہے وفا کرو گے وفا کریں
ہمارا ملنا ہے ایسا ملنا، ملا کرو گے ملا کریں گے
یہ پوچھنا کیا کہ خط لکھو گے؟ پوچھنے کی ضرورت نہیں
تمہاری مرضی پر منحصر ہے لکھا کرو گے لکھا کریں گے
نوشین مدرؔ لاہور
دل سلگتا ہے میرا سرد رویے سے تیرے
دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے
جسے تو حکم کرے دل میرا ایسے دھڑکے
نوشین مدرؔ لاہور
کیسی مجھ سے محبت ہم پر سب روشن تھا
یونہی ذرا سناٹوں کا تھا دل بریاد کریں
رابعہ منیرؔ سرگودھا
چاہا تو چاہتوں کی حدوں سے بڑھ گئے
نشہ محبتوں کا اترنے نہیں دیا
اس نے ہنسی ہنسی میں محبت کی بات کی
میں نے عدیم اس کو مکر نے نہیں دیا
مریم نوازؔ فیصل آباد
ایسے رہا کرو کہ لوگ آرزو کریں
ایسا چلن چلو کہ زمانہ مثال دے

مریم ماہ منیرؔ لاہور
تم کو دیکھوں یا پھر چاند دیکھوں
بات تو ایک ہی ہے گر تم سمجھو
ریما نور رضوانؔ کراچی
کسی نے عجیب سوال کر ڈالا
مرتے تو مجھ پر ہوں پھر جیتے کس کے لیے ہو
سدرہ شاہینؔ خانیوال
کھلونے ٹوٹ جانے پر بہت رویں کی بچن میں
مگر اب دل جو ٹوٹا ہے تو آنسو کیوں نہیں بہتے؟
ریمل آرزوؔ اوکاڑہ
پھر پیاس اتری ہے بستیوں میں
گفتگوئے فرات کی جائے
دھنک نازؔ کراچی
خواب لفظوں میں ڈھل نہیں سکتے
کاش آنکھیں پڑھا کرے کوئی
لوگ تسخیر بھی ہو سکتے ہیں
لفظ دل سے ادا کرے کوئی
صباحہؔ ہارون آباد
اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
اب اسے ڈھونڈنے میں تاحد سحر جاؤں گا

کسی کو نیند نہیں آتی کوئی آرام نہیں کرتا
تمہارے سیاہ مڑگاں
ایقانے عہد کے منتظر کو بلاتے ہی نہیں
اور میں تمہارے عشق نے مجھے
فردوس بریں کا مکین بنا دیا ہے
میں وہاں شہد کے دریاؤں سے
مجھے زمانوں کی محبت ملی
اور میں راتوں کو بے خواب رہتا ہوں
تمہاری خاطر
اور اس دنیا کے لوگ
راتوں کے بیت جانے کے منتظر ہیں
میں صحرا کی مسافروں اور نخلستان کے درمیان
واپس آتا ہوں
میں رات کو صدا دیتا ہوں
اور ہر محبت کے لیے رات ہی تو ہوتی ہے
اے ہمارا مقدر، ہماری جنت
کیون آئے اور کس نے ہمارے نام کی
صدا لگائی ہے ہمارے جانشینوں اور
ہمارے ہاتھوں
پرورش پانے والوں میں سے
کون آیا ہے گلاب کے پھولوں کے لیے
اس لمحے سے ہم ساتھ ساتھ تھے
وہ جذبات میں سخت گیری ہے
میں صحراؤں اور نخلستانوں کے
سفر سے لوٹ آیا ہوں
اور اب تمہاری آنکھوں میں سا گیا ہوں
☆.....

دانیہ آفرین کی ڈائری سے
نازیہ کنول نازی کی غزل

یوں اپنے آپ سے بے زار کب تھے
سر محفل جو رسوا کر چکے ہیں
وہ سب اپنے ہی تھے اغیار کب تھے
یوں ہی خوشیاں لٹا بیٹھے وفا میں
وگرنہ دکھ سے ہم دو چار کب تھے
ہوا مشکل ہے جن پر آج چلنا
وہ رستے اتنے بھی دشوار کب تھے
دلوں میں کفر اور منہ پر محبت
یہ انسان اتنے پراہر کب تھے
ہمیں گھائل جو اتنا کس کے ہیں
قسم سے پھول ہی تھے خار کب تھے
کوئی تو زخم دل کو چاٹا ہے
وگرنہ زیست سے بے زار کب تھے
ابھی پچھلے برس تو قربتیں تھیں
وہ یوں ہم سے سمندر پار کب تھے
تیری چاہ میں گنوا بیٹھے ہیں خود کو
ہم پہلے اتنے بھی لاچار کب تھے

مہوش جواد کی ڈائری سے

ایک نظم

تمہاری آنکھیں

صحراؤں اور نخلستان کے درمیان

سفر کرتی، تمہاری آنکھیں

اک آرزو اور تمنا میں، یہ عالم بے خوابی ہے

اس ماہ میں

آمد سے اس کا کچھ تعلق نہیں۔ ایسا ہی ہوگا علاقے کا نام بھی کچھ میڑھا سا ہے ہم نے بہت یاد رکھنے کی کوشش کی لیکن حافظے سے پھسل جاتا تھا۔
(دنیا گول ہے "ابن انشاء")
نوشین مدرثر۔ لاہور

اس ماہ کا شعر

نہ جانے کیا ہوا ہے سال بحر میں
دیا روشن کہ مدھم ہو گیا ہے
ہمیں معلوم ہے اتنا کہ ایک سال
ہماری عمر سے کم ہو گیا ہے
اریشہ۔ کمالیہ

اس ماہ کا فلسفہ

خدا رکھے گا ان لوگوں کا جنہوں نے آپ کی
جیت کے واسطے اپنا بہت کچھ ہار دیا ہے اور یاد
رکھے گا اس ذات باری تعالیٰ کو جس نے آپ کے لیے سے
بڑھ کر سوچا اور آپ کی عزتوں سے بڑھ کر نوازا ہے۔
نور بانو۔ کوئٹہ

اس ماہ کی ہرمرچیں

☆ ناجائز خواہشات ناجائز آمدنی سے ہی پوری
ہو سکتی ہیں۔
☆ آپ سینما دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا
ایک عورت پڑوس کے گھر میں جھانک کر خوش ہوتی
ہے۔
☆ خواتین فارغ اوقات میں بچوں کی جوئیں

اس ماہ کا اقتباس

بکی نشانی

آفاق میاں نے گھر اپنا ایسی جگہ لیا ہے کہ اس
کے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اوپر نیچے سڑکیں
ہیں۔ ہم نے کئی بار اس خیال سے کہ کبھی تنہا بھی آنا پڑ
جاتا ہے اس گھر کے فضا کی کوئی نشانی مقرر کرنے
کی کوشش کی۔

پہلے روز ہم نے یہ یاد رکھا کہ کئی کے سرے پر
ایک پتیل پر تریزوں کا ڈھیر ہے اور اس کے پاس
ایک گھوڑا گاڑی کھڑی ہے دوسرے روز اس کی طرف
میں ہم آدھ فرلانگ کا غچہ کھا گئے۔ تریزوں والے نے
محض ہمیں بھگانے کے لیے اگلے روز پتیل لٹا دیے
کھڑا کیا۔ یہی سب حرکت گھوڑا گاڑی والے نے کی۔
آفاق نے کہا۔ "ایسی چلتی پھرتی چیزوں کی نشانی تو ملا
نصیر الدین مقرر کیا کرتے تھے۔ انہوں نے ریگستان
میں ایک جگہ رو پے دبا دیے تھے اور نشانی یہ رکھی کہ
عین اس جگہ پر بادل کا سایہ تھا۔ اگلے روز دیکھا کہ نہ
بادل ہے نہ اس کا سایہ اور نہ دیے ہیں۔ کچی چیز کی
نشانی رکھو۔"

ہم نے یہ بات گرہ میں باندھ لی۔ عین گھر کے
سامنے ایک دکان پر پیپسی کولا کا اشتہار لگا تھا۔ پکا دوپار
میں جڑا ہوا لیکن شام تک پیپسی کولا والوں نے اس قسم
کے اشتہار شہر میں جا بجا ہزاروں جگہ پر جڑ دیے آفاق
میاں کا کہنا ہے کہ یہ پہلے سے جڑے ہیں۔ آپ کی

صدف سحر۔ کمالیہ
اک محبت ہے بدگمان ہونا
اک حقیقت ہے داستان ہونا
تو جو آئے تو بات بنتی ہے
ورنہ عمروں کا رایگان ہونا
یعنی سید۔ ملتان
وصال میں بھی وہی فاصلے سراب کے ہیں
کہ اس کو نیند مجھے رت جگے کی عادت ہے
تیرا نصیب ہے اے دل سدا کی محرومی
نہ وہ سخی نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے
فریال۔ لاہور
کچھ تو مشکل ہے بہت کار محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جاسکتی
کوئی ہو بھی تو ذرا چاہنے والا تیرا
راہ چلتوں سے رقابت نہیں کی جاسکتی
نورین ملک۔ لاہور
بھڑکی چڑکی دنیوی دنیا میں اک مدت سے
کسی کی لگن نہیں ہے کہ کچھ نہ پوچھو تم
وہ زخم پایا کہ جگہ کی صاف مشکل ہے
وہ مات اب کے ہوتی ہے کچھ نہ پوچھو تم
زرش۔ پشاور
یہ بھی دن ہیں اس سے پل دوپل ملنا ناممکن ہے
وہ بھی دن تھے کٹ جاتی تھیں راتیں پوری باتوں میں
میں اور تم سے پہنچ گئے آپ جناب کے صیغوں میں
رفتہ رفتہ اتر آئی ہے ایسی دوری باتوں میں
نشاء حیات۔ کراچی
ممین جس کے لیے ہم نے سب حدیں توڑ دیں
اسی نے آج کہا ہے اپنی حد میں رہو
☆.....☆

شمال ملک۔ کراچی
کوئی وعدہ نہیں پھر بھی انتظار تیرا تھا
دور ہونے پر بھی اعتبار تیرا تھا
نجانے کیوں بے رخی تو نے ہم سے کی
کیا ہم سے بھی زیادہ کوئی طلب گار تیرا تھا
روشنی فاطمہ۔ کراچی
اہل نظر کے بخت میں کس نے یہ لکھ دیا
رہنا کسی کے ساتھ محبت کسی کے ساتھ
ہوتی ہے اس کے دل کو کسی اور کی طلب
رکھتی ہے عمر بھر اسے قسمت کسی کے ساتھ
سحرش نور۔ گجرات
بے کار خیالوں سے لپٹ کر نہیں دیکھا
جو کچھ بھی ہوا ہم نے پلٹ کر نہیں دیکھا
اس ڈر سے کہ کٹ نہ جائیں بے تابی کے راستے
آنکھوں نے تیری راہوں سے ہٹ کر نہیں دیکھا
کرن ناز۔ کھاریاں
ملو کہ آج کوئی بات روبرو کر لیں
یہ کیوں ہوئیں دوریاں کچھ اس پر گفتگو کر لیں
کر لیں گے پھر سے زیارت تمہارے چہرے کی
کہ پہلے آنکھوں کو اشکوں سے با وضو کر لیں
ارم سرفراز۔ لاہور
مقرر وقت ہوتا ہے محبت کی نمازوں کا
ادا جن کی نکل جائے قضا بھی چھوٹ جاتی ہے
محبت دل کا جبدہ ہے جو ہے توحید پر قائم ہے
نظر کے شرک والوں سے محبت روٹھ جاتی ہے



وہاں ایک پائلٹ نے اس سے سوڈا لڑکی شرط لگائی کہ وہ ان دونوں کو جہاز میں بٹھا کر پورے شہر میں گھمائے گا اور اگر اس تمام عرصے میں وہ ایک لفظ بھی نہ بولے تو جیت جائیں گے اسکاٹ نے شرط مان لی۔ جہاز اڑاتے ہوئے پائلٹ نے بہت غوطے دیے کئی مرتبہ فلا بازیاں کھلائیں لیکن وہ ان کی خاموشی کو نہ توڑ سکا۔ زمین پر اترنے کے بعد اس نے اسکاٹ سے کہا۔

”کمال ہے بھی تم جیت گئے لیکن تمہاری بیوی کہاں ہے؟“ تو اسکاٹ بولا۔

”وہ تو شکر ہے کہ میں نے اپنی بیوی پر نظر رکھی ہوئی تھی وہ جیسے ہی چپٹنے لگی میں نے اسے جہاز سے

نوشین مدر۔ لاہور

ایک بچے کے لئے دوست کو گھر کھانے پر بلایا۔ بچے کی ماں نے جب اس کے دوست کو دسترخوان سے چھو صاف کرتے دیکھا تو لڑکے بھجاتے ہوئے کہا:

”کیا تم اپنے گھر میں بھی دسترخوان سے چھو صاف کرتے ہو؟“

”نہیں تو اپنے گھر میں مجھے ہمیشہ صاف بچے ملتے ہیں۔“ بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

اریشہ۔ کمالیہ

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ افرع بن حابس نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا حسن کا بوسہ لے رہے تھے تو وہ بولا:

”یا رسول اللہ میرے دس بچے ہیں۔ میں نے ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔“ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جو (بچوں، یتیموں، عاجزوں اور یتیموں پر رحم نہ کرے اللہ تعالیٰ بھی اس پر رحم نہ کرے گا۔“ (مسلم)

سیدہ نورین۔ کراچی
بھلائی اور نیکی
حسن بن اہل خلیفہ مامون کا وزیر بہت نئی تھا۔ دھڑک لوگوں کو عطیات دیتا رہتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک اعرابی نے دیکھا۔

”اے حسن! یہ راستہ احسان کا نہیں جو تو نے اختیار کر رکھا ہے کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسراف میں کوئی بھلائی نہیں۔“

حسن نے اعرابی کو جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تجھے نہیں معلوم کہ بھلائی اور نیکی میں اسراف ہوتا ہی نہیں۔“

عانیہ نیازی۔ ربوہ

شرط
اسکاٹ اپنی بیوی کے ساتھ فلائنگ کلب گیا۔

چاند بیڑوں سے پرے ہو کر گئی ہوں بارشیں
کاش وہ لمحہ کبھی اس بت کی صحبت میں کئے
اک مثال بے مثال اب تک ہیں اپنے درمیاں
جن کے بازو جسم و دل حق کی شہادت میں کئے
کاٹنا مشکل بہت تھا ہجر کی شب کو منیر
جیسے ساری زندگی غم کی حفاظت میں کئے

شاعر: منیر نیازی

انتخاب: نور بانو۔ کوئٹہ

اس ماہ کچھ خاص

☆ رشتے اور رستے زندگی کے دو پہلو ہیں۔ کبھی کبھی رشتے نبھاتے نبھاتے راستے کھوجاتے ہیں اور کبھی کبھی راستوں پر چلتے چلتے رشتے بن جاتے ہیں۔ کسی کو رشتے راس آجاتے ہیں تو کسی کو راستے، فرق صرف اتنا ہے راستوں کے دکھ برداشت ہو جاتے ہیں مگر رشتوں کے نہیں ہوتے۔

☆ انسان محبت ایک بار ہی کرتا ہے اور باقی محبتیں اسی محبت کو بھلانے کے لیے کرتا ہے۔

☆ محبت اور نفرت دونوں اگر حد سے بڑھ جائیں تو جنوں کی حد میں داخل ہو جاتی ہیں۔

☆ دکھ کی کوٹاریں چھوڑنے سے تو رخصت ہو جاتی ہیں مگر دل کے نہاں حائلوں میں جا کر کسی ایک گوشے کو ویران کر دیتی ہیں اور یہ کسی مخصوص شخص کے لیے ہوتا ہے۔

☆ خود غرضی میں انسان پاگل ہو جاتا ہے۔

☆ جن میں خوبی ہوتی ہے وہ باتیں نہیں کرتے

اور جن میں خوبی نہیں ہوتی وہ باتیں کرتے ہیں۔

☆ ہم خیال لوگ ہم سفر ہو جائیں تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔

☆ زبان کو شکوہ سے روکو خوشی کی زندگی عطا ہو گی۔

☆

عانیہ نیازی۔ ربوہ

☆.....

نکالتی ہیں چاہے ہوں نہ ہوں۔
☆ عورت کے نزدیک سب سے حسین عورت وہ ہے جو اسے آئینے کے سامنے دکھائی دے۔
☆ شوہر جب زیادہ محبت جتائے تو سمجھ لیں کہیں اور بڑی ہونے کی اطلاعی ٹھننی نہ لگی۔
دھنک ناز۔ کراچی

اس ماہ کی مزاحیہ غزل

میری محبت کو اپنے دل میں ڈھونڈ لینا
اور ہاں آئے تو کبھی اچھی طرح گوندھ لینا
مل جائے اگر پیار تو کھونا نہیں
پیاز کاٹنے وقت رونا نہیں
مجھ سے روٹھ جائے گا بھانہ اچھا ہے
تھوڑا سا کھلا دو اگر چھانا اچھا ہے
پیوستہ رہ شجر سے امید بہا ہر طرف
بچے دو وہی اچھے بیویاں بے شک چاروں طرف
آپ کی کشش سرفروش ہے
آپ کا نشہ مدہوش ہے
کیا کہیں تم سے اے دوست
جس کتے نے تم کو کاٹا وہ اب تک بے ہوش ہے
ایس اتیا ز احمد۔ کراچی

اس ماہ کی اچھی بات

جو لوگ دکھ، تکلیف، درد کو سمجھتے ہیں، وہ لوگ کبھی بھی اس کی وجہ نہیں بنتے۔

ملا لہ اسلم۔ خانیوال

اس ماہ کی غزل

چار دن اس حسن مطلق کی رفاقت میں کئے
اور اس کے بعد سب دن اس کی حسرت میں کئے
اس جگہ رہنا ہی کیوں ان شہریوں کے درمیان
وقت سارا جس جگہ بے جا مروت میں کئے
اک قیام دلربا رستے میں ہم کو چاہیے
چاہے پھر باقی سفر راہ مصیبت میں کئے

حیا
مولوی اپنے 22 بچوں اور بیوی کے ساتھ کسی دعوت میں گیا۔ میزبان نے جب اسے لوگ دیکھے تو غصے اور طرے سے بولا۔
”حیا نہیں آئی؟“ مولوی صاحب ہنستے ہوئے بولے۔
”نہیں جناب! اس کے پیپر ہو رہے تھے اس لیے وہ نہیں آئی۔“

دھنک ناز۔ کراچی

لفظوں کی روشنی

☆ جو لوگ آپ کے اختلاف رکھتے ہیں ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن یہ بتانے کی جرأت نہیں ہو سکتی۔
☆ یہ ہماری آنکھیں نہیں بلکہ دوسروں کی آنکھیں ہیں جو ہمیں بر باد کرتی ہیں اگر سوائے آپ کے تمام دنیا کے لوگ اندھے ہوتے تو آپ بھی پھر عمدہ لباس اور خوش نماسان کی پروا نہ کرتے۔
☆ جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ سب کسی نہ کسی دن بخش دیا جائے گا اس لیے اطمینان بخش کرو تاکہ بخشش کا موسم تمہارا رہے نہ کہ تمہارے وارثوں کا۔

ماہ نور۔ فیصل آباد

کنجوس

ایک لکھ پتی کے پاس کچھ لوگ چندہ لینے گئے۔ انہوں نے لکھ پتی سے کہا۔ وہ نیک مقاصد کے لیے کام کر رہے ہیں اس کے لیے اسے چندہ دینا چاہیے۔ تو لکھ پتی کنجوس کہنے لگا۔
”میرا ایک بھائی ہے لیکن وہ کام نہیں کرتا کیا اس کی مدد کرنا اچھا مقصد نہیں؟ میری ایک ادھی عمر کی غیر شادی شدہ بہن ہے وہ تیس سال سے کنواری بیٹی

ہے اس کی شادی کرنا اچھا کام نہیں ہے کیا؟ میرے باپ کی عمر 80 برس ہے ان کو کھانے پینے کی اشیاء فراہم کرنا نیک مقصد نہیں؟“
”یقیناً یہ سب کام کرنا اچھا اور نیک مقصد ہے چندے کی اپیل کرنے والوں نے کہا۔“
”جب میں یہ اتنے سارے نیک کام نہیں کرتا تو پھر تمہیں چندہ کیوں دوں؟“

ثناء حیات۔ کراچی

مہکتی کلیاں

☆ میں اپنے حریفوں پر اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ چار منٹ کی حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت اور اہمیت سے بخوبی واقف ہوں۔ (نیپولین)
☆ جس کے پاس مضبوط قوت ارادی ہے وہ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق بناتا ہے۔ (گوٹے)
☆ آدمی کی زندگی کا بہتر حصہ وہ ہے جس میں انتہائی کام کے بھول چکا ہے۔ (ورڈز ورثہ)
☆ ایک شخص کوئی کی ذخیرہ اندوزی کا وہی حال ہوتا ہے جو ہندسی محسوس کے تحت کھنٹے کا تختہ وہ کھیاں کرتی ہیں جب کہ ہندسہ نشان حاصل کرتا ہے۔
☆ ماں کا دل ایک ایسا جگہ ہے جہاں ہم اپنی تمام پریشانیاں اور دکھ جمع کر دیتے ہیں۔ (لوکی وٹ ٹاچ)

ریما نور رضوان۔ کراچی

راس نہ آیا۔۔۔۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کہ کسی کو گھر راس نہیں آیا، کسی کو موٹر راس نہیں آئی کسی کو اسکوٹر تو کسی لاری راس نہیں آئی اس لیے ان گاڑیوں کے حادثات ہوتے ہیں اور کوئی زخمی ہوتا ہے تو کوئی مر جاتا ہے یا مالک کو نقصان ہوتا ہے۔ کسی کو گھر راس آ جاتا ہے تو کہتے ہیں، اس کو آفس میں پیسہ مل رہا ہے۔ اس لیے

خوش ہے اس کی بیوی بچے بھی صحت مند ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ لوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں یا ایک دوسرے کے گلے شکوے میں لگے رہتے ہیں لیکن آج کل ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ کسی کو بیوی راس آرہی ہے اور کسی کو دلہن راس نہیں آرہی ہے۔ دلہن کے گھر میں قدم رکھتے ہی نحوست لگ گئی یعنی شادی کے چند ماہ بعد ہی دونوں میں ان بن شروع ہوتی ہے اور طلاق کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ اس کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں کہ بے چارے کی شادی ہوئی مگر بیوی راس نہیں آئی۔ بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں طلاق بھی ہو گئی۔ طلاق نام ہنسنے کی حساس لوگ ممکن ہو جاتے ہیں اس لیے کہ ایک خاندان علیحدہ ہو گیا اس کے پھول جیسے بچوں کا کیا ہوگا جتنے بچے جن کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا ہو گیا نہ صرف دوڑ دوڑا کر تباہ ہو گئے بلکہ بچوں کی زندگیاں بھی ماں باپ کے پیلائے ہوئے ہو گئیں۔ بہر حال یہ دنیا ہے، یہاں بہت سے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور بہت سے حادثات بھی وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ ہم کہاں تک کسی کی غم زدہ کہانیاں سنتے رہیں۔ شادی کے بعد بھی جوڑے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ ہمیشہ خوشگوار زندگی گزارتے ہیں اور ایک جان دو قالب کی طرح زندگی بھر خوش رہتے ہیں اور دوسروں کے لیے ایک مثال بن جاتے ہیں ان دونوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میاں، بیوی ایک دوسرے کو راس آگئے۔ کہنا یہ ہے کہ آج بھی بہت سی خواتین ایسے خیالات رکھتی ہیں، کہ نئی ٹیلی دلہن جب گھر آتی ہے اور چند دن بعد کوئی حادثہ ہوتا ہے، کسی کا انتقال ہو جاتا ہے، کسی کو کاروبار میں نقصان ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں، بیوی کے قدم منحوس ہیں۔ بیچارے شوہر کو برس میں نقصان ہو گیا۔ اگر شوہر کو سرکاری نوکری مل گئی یا ترقی ہو گئی تو لوگ کہتے ہیں، دلہن قسمت والی ہے اس کے قدم اچھے ہیں۔ اپنے ساتھ خوشی لائی اور اس کے شوہر کو

شادی کے چند دن بعد ہی سرکاری نوکری مل گئی یا ترقی ہو جاتی ہے تو بھی دلہن کی تعریف ہوتی ہے۔ حالانکہ شوہر کو ترقی دلانے یا شوہر کو سرکاری نوکری دلانے میں بیوی کا ہاتھ نہیں ہوتا۔ خود آفس میں رشوت لیتے ہوئے پکڑا جاتا ہے اور محفل ہو جاتا ہے یا نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سزا وہ اپنی بیوی پر گھڑتا ہے۔ یہ سب پرانے خیالات گھر کی بڑی خواتین ہی پیدا کرتی ہیں اور دوسروں کو یا شوہروں کو بیویوں سے شک و شبہ میں ڈال دیتی ہیں اور اچھی خاصی زندگیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ پرانے عقائد ہمیں ذہن و دل سے نکال دینے چاہئیں اور یقین رکھنا چاہیے کہ جو بھی ہوتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہے، ہمیں کوئی نقصان پہنچا ہو تو اس میں ہمارے لیے کوئی نصیحت ہو اور آئندہ کوئی ایسے کام نہ کریں جس سے نقصان ہو۔ یوں سمجھیے کہ نقصان میں بھی فائدہ ہے اگر گھر یلو عورتیں علم کی روشنی سے محروم ہیں تو پڑھی لکھی عورتیں ان کو سکھائیں اور ان کی مدد کریں۔ اور دوبارہ ایسی بات نہ کریں کہ جس سے شادی تو ہو گئی راس نہیں آئی۔

تب۔ ایس۔ امتیاز احمد۔ کراچی

لکھنا چاہتے ہو تو لکھو

☆ لکھنا چاہتے ہو تو لکھ پڑھو

☆ کہنا چاہتے ہو تو بولیں

☆ چننا چاہتے ہو تو چھوٹ سے بچو۔

☆ عمل کرنا چاہتے ہو تو اسوہ حسنہ پر کرو۔

☆ خواہش کرنا چاہتے ہو تو جنت کی کرو۔

☆ کمانا چاہتے ہو تو نیکیاں کماد۔

☆ ڈرنا چاہتے ہو تو اللہ سے ڈرو۔

☆ سنوارنا چاہتے ہو تو آخرت سنوارو۔

☆ پڑھنا چاہتے ہو تو قرآن پڑھو۔

ثناء علی۔ ملتان

فروری ۲۰۱۸

یوم بچہ جیتی کشمیر

ایسا کیوں! سلگتے رہے چنار کشمیر کے
سکتی رہیں عفت ماب بیٹیاں
وادی ہو گئی لہورنگ
بیٹوں کی لاشیں گرتی رہیں
رہی بیان دے کر اُمہ خاموش
اور یو این او بھی خاموش
نہ جانے ایسا کیوں؟
کتنے ظلم ہوئے فلسطینیوں پر
کہ انسانیت تھر تھرا گئی
افغانستان کھنڈ رہنا
عراق برباد ہوا
ایک بار پھر اُمہ خاموش
یو این او بھی خاموش
خدا جانے ایسا کیوں
ڈرون حملے غیر انسانی ہیں..... میڈیا چلا اٹھا
مگر ارض پاک کی حسین وادیوں میں
گولہ بارود کی بارش ہوتی رہی
پہاڑوں پر لاشیں گریں
جھرنوں میں بے گناہوں کا لہو بہتا رہا
انہوں پر انہوں کی لگائی آگ میں
جلے بہاڑیں اکابر

پھر بھی اُمہ خاموش

حسب سابق یو این او خاموش
معلوم نہیں ایسا کیوں؟
برما میں مسلمان ذبح ہوتے رہے
مسجدیں جلتی رہیں اور سب کا ہمدرد
امریکہ خاموش..... اُمہ خاموش

اور

یو این او خاموش

کیوں..... ایسا کیوں؟
اب شام کے مظلوموں کی
مدد کرنے امریکہ جارہا ہے
اور اُمہ بیدار ہو چکی ہے معلوم ہے کس لیے
شام پر حملہ کرنے والوں کا ساتھ دینے کے لیے
عرب ممالک امریکہ کا ساتھ دے رہے ہیں
اور کڑھتے ہوئے میں سوچ رہی ہوں
ایسا کیوں..... ایسا کیوں؟

سیدہ شمیمہ شاہین

نیا سال آیا

نئی اُمیدیں، نئے خواب لے کر آیا ہے
سنائے پھر سے نیا سال گل آیا ہے
وہ جن کو سال گزشتہ نے کچھ نہیں بخشا
انہیں بھی پھر نئے سال سے ہیں امیدیں
وہ جن کو کامیابی دور لگتی ہے

وہ نئے عزم سے سفر میں ہیں
خدا کرے کہ نیا سال اب جو آیا ہے
کسی کو غم نہ کسی کو کوئی وبال نہ دے
سبھی کی خواہشیں پوری ہوں
بر آئیں امیدیں
نیا سال ہم سب کے لیے
مبارک ہو (آمین)

سباس گل

میری ادھوری نظم

تمہیں محسوس ہوتا ہوگا
بدلتے سال کے ہمراہ
میں بھی بدل گئی ہوں
ہست خاموش رہتی ہوں
نہ بھتی ہوں زیادہ
نہ مسکرانے پر ہوں آمادہ
آدھا سچ تو ہے یہ
محبت ہو گئی شاید
یا پھر فقط مجھ کو ہی
ایسا محسوس ہوتا ہے
میری ادھوری نظم
اپنی ڈائری میں تم
مخفوف کر لیتا

دل کی نگاہوں سے

جب بھی پڑھو گے تم

اس میں تم کو

مکمل سچ ملے گا

غزل

میرے نصیب کہ میں عرش سے اترے الفاظ سن لوں
زہے نصیب کہ میں اپنے دل کی آواز سن لوں

سیدہ عروج فاطمہ

غزل

حسن والوں کا خدا نہ بھلا
وہ میرے دل کی صدا نہ بھلا
اس کی آنکھوں میں تعجب سا ہے
وہ مجھے بھول گیا ہو نہیں
اس کے چہرے میں کشش ہے ایسی
پھول پانی میں کھلا ہو جیسے!
دن گزرتے ہیں کچھ ایسے میرے
زندگی ایک سزا ہو جیسے!
دل سے آتی ہے صداروں کی
آئینہ ٹوٹ گیا ہو جیسے
دیکھ کر اُس کو مجھے لگتا ہے
وہ کہیں مجھ سے ملا ہو جیسے
یاد آتا ہے مجھے ایسے وہ
عمر بھر ساتھ رہا ہو جیسے
حکیم خان

رات

خدا یا شکر ہے تیرا
ہم یہ تیری کرم نوازی ہے
جو تو نے یہ رات بنائی ہے
رات نہ ہوتی تو
ہم دن بھر کی مشقت اوڑھے
کہاں جاتے کہاں سوتے

ترا لرم ہے کہ ہم
رات کو سوتے ہیں تو راحت
محسوس کرتے ہیں

فیضان احمد فیضی

غزل

کہیں پھول مہکے تیری یاد میں
کہیں درد ملا تیری صدا میں
کوئی بھٹک گیا ہے منزل سے
وہ پہلے سا رنگ نہیں حنا میں
شرمندہ ہوں میں بھی تیری طرح
کوئی راحت نہیں ملتی اب وفا میں
غم ستائے گا عمر بھر تیرا ہمیں
جیسے کوئی دیوانہ پھرتا ہو صحرا میں
کسی کی نظر سے عیاں ہے اداسی جاوید
شمع جلے پھر کوئی کیسے تیز ہوا میں
محمد اسلم جاوید

غزل

ترے بغیر جب اس کا نہ دل لگا ہوگا
تری تلاش میں گھر سے نکل گیا ہوگا
نہ انجمن سے اٹھا مجھ کو بے وفائی سے
میں رو پڑا جو تری بزم میں تو کیا ہوگا
یہ بات مجھ کو کسی نے نہیں بتائی تھی
اسی کے شہر میں جینا مرا سزا ہوگا
قدم قدم پہ اٹھانے پڑیں گے دکھ تم کو
ہوا کی زد مسلسل اگر دیا ہوگا
وفا کی رہ پر چلنا نہیں ہے کھیل کوئی
ذرا تو سوچ چھڑنے کے بعد کیا ہوگا
حسان صائم

غزل

ہنسنا رانا آتا ہے

درد چھپانا آتا ہے
عشق کے رستے میں ہم کو
دیا جلانا آتا ہے
جان گر تم چاہتے ہو
سر کو جھکانا آتا ہے
زہر ہو یا کہ امرت رس
پینا پلانا آتا ہے
چاہوں گر میں ساتی جی
اُن کو منانا آتا ہے

ادیس ساتی

غزل

ادھر وہ ہاتھوں کے پتھر بدلتے رہتے ہیں
ادھر بھی اہل جنوں سر بدلتے رہے ہیں
بدلتے رہتے ہیں پوشاک دشمن جانی
مگر جو دوست ہیں پیکر بدلتے رہتے ہیں
ٹھکانا آج کے احباب کا نہ موسم کا
جو رنگ روپ برابر بدلتے رہتے ہیں
مہک انھیں نہ غریبوں کے خون کے دھبے
امیر زادے تو چادر بدلتے رہتے ہیں
بدل سکیں نہ مقدر لکیریں ہاتھوں کی
ہم اپنے آپ کو مقدر بدلتے رہتے ہیں
یہ دبدبہ یہ حکومت یہ نشہ دولت
کرائے دار ہیں سب گھر بدلتے رہتے ہیں
ہم ایک بار جو بدلے تو آپ روٹھ گئے
مگر جناب تو اکثر بدلتے رہتے ہیں
غریب لوگ تلاش معاش میں امتیاز
وطن سے دور سمندر بدلتے رہتے ہیں
ادیس امتیاز احمد

☆

عائشہ احمد

دوستوں کے لئے

ثناء کنول کے نام

ثناء کنول ہماری بہت پیاری رائس ہیں اور بہت کم
وقت میں انہوں نے مصنفات کی فہرست میں اپنا نمایاں
مقام بنایا ہے۔ ان کی مٹگنی ہوگئی ہے۔ ادارے اور ہماری
جانب سے ان کو بہت بہت مبارکباد اور ہماری دعا ہے
کہ ان کی زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے بھری رہے۔

آپنی

صالیہ علی کے نام

پیاری آنی جانان اسلم حال ہے؟ سب سے
پہلے تو میری طرف سے تمام کا مین، مہررز، مدیر
نظران، اسٹاف اور باقی تمام بہنوں کو مبارکباد
سے سلام و آداب اور ڈھیروں دعاؤں کا طوفان
صورت اور ننھا ساتھ قبول ہو ہمیشہ خوش رہیں اور
خوشیاں بانٹتے جائیں۔ اللہ پاک کی ذات سے دعا ہے
کہ وہ ہمارے ملک پاکستان کو صدائے حفظ و امان
میں رکھے اور ہمارے پیارے ردا کو دن رات
چمکتی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین) گو کہ مجھے ردا سے
بڑے زیادہ عرصہ نہیں ہوا مگر پھر بھی ردا میرے لیے
سب سے خاص سب سے انمول بن چکا ہے۔ وجہ
آپ سب کی محبت اور خلوص ہے پھر صالہ آنی کا
خلصانہ رویہ، کیا بتاؤں صالہ آنی مجھے آپ بہت اچھی
لگتی ہیں۔ آپ کے لیے ایک دعا

ہر لمحہ تو آباد رہے

تیرا چہرہ مانند گل رہے

دعا میری یہ رب سے

ہر قدم پر تو کامیاب رہے

دائیں آفرین مٹگنی کے خوب صورت اور نازاں
سے بندھن میں بندھنے کے لیے بہت بہت مبارک
باد۔ اللہ پاک آپ کو صدا خوش اور آباد رکھیں،
(آمین)۔ عائشہ آپ اور میری پیاری یاسمین آفریدی
آپ کو ردا میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ زور قلم اور
زیادہ کرے۔ اب قلم سے نادمہ مت توڑیے گا۔ میری
دعائیں صدا آپ کے ساتھ ہیں۔

ثناء نازر جانہ

میری جان کے نام دل کا پیغام

السلام علیکم صالحہ آنی، نورین آنی، افشاں علی،
کشف ضیاء، مہرین کنول، سعدیہ عابدہ، ربما نور،
دعناک ناز، عائشہ نیازی، صبا سحر، نورالصباء،
جیہا، آسہ علی اور میری دوستوں سب کو نیا سال
نئی خوشیاں، صالہ کنول شہزاد کی طرف سے بہت بہت
مبارک ہو۔ آپ سب ہمیشہ خوش رہیں
مسکراتے رہیں اور لب لباب سے شوہر شہزاد آپ
ہمیشہ خوش رہیں جہاں رہیں اللہ آپ کی قدم قدم پر
حفاظت کرے۔ ہمیشہ آپ کے نام کے ساتھ میرا نام
جزا رہے آمین۔ اور ہاں چاہے کچھ بھی ہو آپ مجھ پر
ضرور یقین کرنا کیونکہ اعتبار اور یقین پر ہی نکاح قائم
رہتا ہے۔ میں آپ سے بے حد محبت کرتی ہوں آپ
میرے لیے میری سانسوں سے بھی بڑھ کر عزیز ہیں۔

اے جانے والے بھی یہ تو سوچا ہوتا کہ

تم بن کوئی کتنا اداس ہے

تم بن ٹوٹ کے بکھر گیا ہے
رات رات جکوں کی نذر ہو جایا کرتی ہے
تمہارے سوا مجھے کوئی نہیں بھاتا پل
افیت میں میرا وجود رہتا ہے کاش تم
سمجھ پاتے تم بن کوئی ہنسنا بھی بھول چکا ہے
میں بہت تمہارہ گئی ہوں پلیر اس نئے سال
تم مجھ سے ملنے آ جاؤ

صرف ایک نظر
میں تمہیں اس نئے سال کے سورج کی
پہلی کرن کے ساتھ
دیکھنا چاہتی ہوں
نیا سال مبارک ہو شہزاد میری جان!
تمہاری معصوم سی بیوی

کسی اپنے کے نام
السلام علیکم! میرا عشق میری زندگی اور دھڑکن
نئے سال میں تمہیں کچھ نئے تجھے دیتی ہوں میرے
دل کی ترجمان یہ میری نظم صرف محمود کے نام، اس کی
بیوی کا پیغام۔

نجانے کیوں اس نئے سال
میرے دل میں اک نیا خیال
نئے احساسات جاگ رہے ہیں
تمہیں پانے کے خواب میری آنکھوں میں
بس رہے ہیں اس نئے سال نجانے کیوں
میرا دل چاہ رہا ہے کہ
تم سے اس بار نئے وعدے نئے عہد ہوں
جن میں تم اقرار کرو کہ

تم میرے صرف میرے ہو اس نئے سال
ہر بار کی طرح اس بار بھی نئے سال کی پہلی صبح
میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر گزاروں

اور
تمہیں اپنے دل کا حال سناؤں

مگر جانتی ہوں کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی
میری یہ خواہش
کبھی پوری نہیں ہوگی
لیکن پھر بھی اک امید سی ہے
میری امید مت توڑنا پلیز!

مسز محمود۔ لودھراں

دوستوں کے نام

السلام علیکم! صالحتی اور نورین، کیسے ہیں آپ
دونوں؟ ردا کی محفل میں پھر سے شامل ہونے جا رہی
ہوں۔ اس شاعرے میں بھی میری دوسری کہانی آئی
کافی لوگوں نے پڑھی اور پسند کیا گیا اس کے لیے ان
سب دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ ندا حسنین،
صائمہ قریشی، گریا بخاری، عکس علی، حنا درانی، ماہ
دوش، صدقہ آصف، ریمیل آرزو، وفا علی، مشال
حاجہ، عینہ فاضل اور بھی بے شمار لوگ ہیں لیکن میں ان
سب کی تہنیتیں شکر گزار ہوں۔ حیا بخاری آپ
سب سے میرا حوصلہ بڑھایا ہے اور اس امید کے
ساتھ کہ آگے جا کر کسی نام سب سا تھر ہیں گے انشاء
اللہ۔ افشاں علی اور دانیہ انجین کا بھی بے حد شکریہ
جنہوں نے میرا پہلا افسانہ پسند کیا۔ افشاں علی کا
افسانہ پڑھا واقعی لوگ ابھی بھی جاہلیت میں گم رہے
ہوئے ہیں۔ صالحتی آپ کا ناولٹ پڑھا بہت پسند
آیا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں ردا کے ساتھ شامل ہوں
اور آگے بھی رہوں گی۔ چلیں اب اجازت دیں۔
جن دوستوں کا نام رہ گیا ہو ان سے معذرت اور
دوبارہ ضرور نام لوں گی۔ انشاء اللہ۔

سحرش فاطمہ۔ کراچی

ماہا اور دیگر کے نام

السلام علیکم! کیوٹ سی صالحتی آئی اینڈ نورین آئی
کیا حال چال ہے؟ سب سے پہلے ملاکہ کی جانب
سے سال نو کی مبارک باد قبول کیجیے۔ دسمبر کی 12
تاریخ کو ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ماہانے کا لک کر کے

مجھے دس کیا تھا، ہمیشہ کی طرح بارہ بج کر 12 منٹ پر
کال بند کی تھی۔ اس کے آخری الفاظ میرے کانوں
میں اب بھی گونج رہے ہیں۔ ”منزہ اپنا بہت سا خیال
رکھنا، مگر وہ خود اپنا خیال نہ رکھ سکی۔ میں اسٹوری لکھ
رہی تھی تبھی میرے سیل پر بپ ہوئی، وہ ماہا کی ماما کی
کال تھی جو روتے ہوئے مجھے ایکسٹنٹ کا بتا رہی
تھیں۔ ملاکہ کو ایک پل کے لیے لگا سکی نے اس کی
جان نکال لی ہے، وہ آئی کو قتل کے دوپل بھی نہ دے
سکی۔ وہ جانتی تھیں ماہا کے لیے منزہ اور میرے لیے
ماہا کیا ہے۔ تم تو مجھے ہمت دیتی تھی نا؟ تو پھر آج تم
خود کیوں ہمت ہار رہی ہو؟ تم جانتی ہو نا ملاکہ تمہارے
بغیر ادھوری ہے پلیز بار بند کی ہے شک ہو، میں اپنے
رب سے تمہاری زندگی مانگوں گی، مجھے اپنے رب پر
بھروسہ ہے۔ میری ماما بہت جلد تندرست ہو جائے
گی۔ میری اپنے تمام فرینڈز سے یہ بات
درخواست ہے ملاکہ کی ماہا کے لیے دعا کیجیے گا۔ یوٹو
ملاکہ (منزہ) ادھوری ہے ماہا کے بغیر..... اراجر خان،
ایقان علی، صاحبہ، افشاں علی، زاہدہ ہاشمی، سعدیہ جاوید،
بسملہ علی، فرزانہ شوکت، دھنک نا، حنا علی، امیر اکمل
آپ سب کو نیا سال بہت مبارک ہو۔ افسانہ آفتاب،
رضوانہ، سباس آئی، حافظہ مون شاہ، عائشہ خان، سہلی
والی فرینڈ شپ۔ جواب کی منتظر رہوں گی۔ شترین گل
فرام مبارک پور 5 جنوری کو تمہاری برتھ ڈے ہوئی
ہے بہت بہت مبارک ہو۔ آخر میں آپ سب سے
ایک مرتبہ پھر درخواست کروں گی اینڈ نیا سال آپ
سب کے لیے خوشگوار تبدیلیاں لائے، آمین۔

ملاکہ اسلم۔ خانیوال

نوشین منڈر کے نام

مائی ڈیئر اینڈ لونی نوشین! صدا خوش اور مسکراتی
رہو مدثر بھائی اور اپنے چھوٹے شہزادے کے سنگ
تمہاری گاہے بگاہے نگارشات ردا میں پڑھ کر بہت
خوشی ہوتی ہے کہ لاہور جا کر بھی تمہارا ردا سے تعلق جڑا

ہوا ہے جو ایک خوش آئند بات ہے اس بار ردا
توسط سے میں تمہیں نئے سال کی مبارکباد دینا
چاہتی ہوں خدا کرے کہ یہ نیا سال تمہارے لیے
بہت سی خوشیاں اور کامیابیاں لے کر آئے۔ آمین۔
عینی شاہ۔ چکوال

چاہنے والوں کے نام

آج میں نے سوچا تم سب کو ٹھوڑا ڈفرنٹ طریقے
سے نیوایزوش کروں۔ ہر سال گھر بلا کر پارٹی تو کرتی
ہی ہوں ہا ہا۔ تم لوگ منہ نہ بناؤ پارٹی بھی کروں گی
ڈونٹ وری ناں مگر بس دل چاہا کہ اپنے پیارے ردا
میں تم سب کو مخاطب کر کے دس کروں۔ تو سنو! میری
پیاری پیاری پریوں ردا، حنا، وشم، باریشے، عینا تم سب
کو یہ سال بہت بہت مبارک ہو اور اللہ سے دعا ہے اس
سال تمہاری خواہشات اور تمناں پوری ہوں اور ہم
سب کا ساتھ یونہی قائم و دائم رہے، آمین۔

رابعہ منیر۔ سرگودھا۔

مون کے نام

مائی ڈیئر ڈارلنگ! سہینڈ! آپ سے کہنا تو
بہت کچھ چاہی، مگر اس کا لفظ نہیں ملتا یا پھر مجھے وہ
تمام لفظ اظہار کے لے کر مل گئے ہیں۔ آپ نے میری
زندگی کو خوشیوں سے بھر دیا ہے آپ کا ساتھ میرا اعتماد
اور میرا مان بڑھا دیتا ہے ہر بات میں میرا خیال میری
پروا مجھے خود پر پراؤ ہوتا ہے کہ آپ میرے ہیں اور
مجھ سے محبت کرتے ہیں آپ کے ساتھ میرا ہر دن
خوب صورت ترین ہوتا ہے۔ مجھے آپ کے پیار سے
زیادہ آپ کا ڈانٹنا اچھا لگتا ہے ہا ہا۔ آئی لو پو اب یہ
لفظ مجھے بہت کم ملتا ہے۔ آپ کو نئے سال کی بہت
مبارکباد اور بہت سی دعائیں اور پیار۔ خدا آپ کو
بہت کامیابی اور ترقی عطا کرے اور آپ یونہی میرے
سنگ ہنستے مسکراتے رہیں۔

نور حبیب۔ کراچی

☆.....



پنیر اور سبز یوں کے کباب

- اجزاء
پھول گوہی : ایک پاؤ
بروکی : ایک پاؤ (ہرے رنگ کی گوہی کی ہی شکل کی ہوتی ہے)
پنیر : آدھا پاؤ (کیوب کی شکل میں لکھا ہوا)

Batter کے اجزاء

- میدہ : ڈیرکپ
بیکنگ پاؤڈر : دو چائے کچھ
کری پاؤڈر : دو چائے کچھ
گرم مصالحہ : آدھا چائے کچھ
چینی : ڈیڑھ چائے کچھ
انڈے : دو عدد
نمک : حسب ذائقہ
دودھ : حسب ضرورت

ترکیب: پھول گوہی اور بروکی کو نمکین پانی میں ابال کر قدرے نرم کر کے فوراً ٹھنڈے پانی میں ڈال دیں اور پھر نیچو کر خشک کر لیں۔ بانس کے تنکے جو بازار میں عام مل جاتے ہیں ان پر دونوں گوہی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اور کیوب شدہ پنیر پرودیں اور خشک میدے میں رول کر کے فالتو میدہ جھاڑ

دیں۔ Batter کے اجزاء میں مناسب مقدار میں دودھ ملا کر پھینٹ لیں۔ کڑا ہی میں تیل گرم کریں (تقریباً چار کپ)۔ سبزیاں اور پنیر پروئے ہوئے تنکوں کو Batter میں ڈبو کر نکالیں اور گرم تیل میں تل کر گولڈن کر لیں۔ دہی کے پیالے کے ساتھ پیش کریں۔ (نوٹ: کوئی اور سبزیاں بھی اپنی پسند کے مطابق لی جاسکتی ہیں)۔

قیمہ کے کٹلس

- اجزاء
قیمہ (باریک) : ایک کلو
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا) : ایک کپ
پیاز (باریک کٹی ہوئی) : ایک عدد
ٹماٹر (ٹکڑے ہوئے) : ایک کپ
دھنیا (ٹکڑے ہوئے) : ڈیڑھ کلو
ہری مرچ (ٹکڑے ہوئی) : ایک چائے کچھ
انڈے : دو عدد
کونگ آئل : حسب ضرورت

ترکیب: سب سے پہلے تیل گرم کریں۔ جب آلو اچھی طرح گل جائیں تو لٹین کا جھکا اتار کر کانٹے کے ساتھ بھرتہ بنالیں ایک دہنی میں ایک کھانے کا چمچ تیل ڈال کر اس میں قیمہ اور سارا مصالحہ ڈال دیں۔ جب قیمے کا پانی خشک ہو جائے تو تھوڑا سا بھون کر اتار لیں اور ٹھنڈا ہونے دیں پھر تھوڑے سے آلو لے

کر اس کو پھیلا دیں اب اس میں تھوڑا تھوڑا قیمہ بھر کر کٹلس بنالیں انڈا لگا کر بریڈ کر مزگ لیں اور بکلی آج میں فراہمی کریں، قیمہ کے کٹلس تیار ہیں۔

مشرقیہ

- پیاز : ایک عدد
ٹماٹر : تین عدد
ہری مرچیں : چھ سات عدد
سرخ مرچ : حسب ذائقہ

ترکیب: پیاز کاٹ کر سرکہ میں بھگو کر نکال لیں۔ انڈے ہاف بوائس کر کے چھیل لیں اور ان کے گول ٹکڑے کاٹ لیں۔ گوشت دھو کر سرکہ میں بھگو دیں اور اس میں پیسی ہوئی سرخ مرچ، نمک، لہسن اور ادھرک بھی ملا لیں اور دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اب فرانک پین میں تیل ڈال کر گرم کریں اور گوشت کے ٹکڑے سرکہ سے نکال کر تیل میں تلیں۔ اگر یہ گلے نہ ہوں تو پانی ڈال کر گلا لیں پھر فراہمی کریں۔ جب یہ سنہری ہو جائیں تو انہیں ایک پلیٹ میں نکال لیں اب بوٹیوں کے چاروں طرف ابلے ہوئے انڈوں کے قتلے سجائیں پھر ٹماٹر اور پیاز کے ٹکڑے اور آخر میں ہری مرچ۔ اس مزے دار بوٹی گوشت کو راستے اور کچپ کے ساتھ نوش فرمائیں۔ مہمانوں کی تواضع کے لیے بھی یہ ایک اچھی اور ذائقہ دار ڈش ہے۔

تکے بوٹی

- اجزاء
گوشت (پنیر ہٹا کر) : ایک کلو
دہی : ایک کپ
گرم مصالحہ : ایک چائے کچھ
ادھرک لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ

دہی : ایک چمٹا ک
نمک، سرخ مرچ : حسب ذائقہ
سوکھا دھنیا پاؤڈر : ایک چائے کچھ
سفید زیرہ : ایک چائے کچھ
تیل : ایک کپ
ترکیب: گوشت کے ایک ایک انچ کے چوکور

ترکیب: قیمے کو گھی میں بھون لیں۔ پیاز اور ادھرک کے اس میں سارے مصالحے ڈال کر بھون لیں۔ اب اس میں قیمہ اور آلو ڈال دیں ڈرا دیر بعد مٹر کے دانے بھی ڈال دیں ایک ڈیڑھ گلاس پانی ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ جب گل جائے تو چولہے سے اتار لیں۔ ہاڈل میں نکال کر گرم مصالحہ چمڑک کر سلاد اور دہی کے ہمراہ پیش کریں۔

بوٹی گوشت

- اجزاء
گائے کا گوشت : ڈیڑھ کلو (آدھے انچ کے چوکور ٹکڑے کر لیں)
سرکہ : ڈیڑھ کپ
لہسن اور ک پیسٹ : ایک چائے کچھ
انڈے : دو عدد
تیل : دو کھانے کے چمچ

سنگھار

جلد چکانیں

چکنی جلد کے لیے اسکرپ

1- خمیر پاؤڈر، ایک بڑا چمچ، لیموں کا رس، ایک چھوٹا چمچ، گاجر کا جوس ایک چمچ، زیتون، بادام کا تیل ایک چمچ۔ ان تمام اجزاء کو ملا کر اچھی طرح مکس کریں اور 15 منٹ کے لیے چہرے پر لگا رہنے دیں۔ اس کے بعد نیم گرم گرم پانی سے دھو لیں۔ اگر اسکن بہت زیادہ چکنی ہو تو اسکرپ میں آئل نہ ملائیں۔ اگر اسکن خشک ہو تو تیل تھوڑا زیادہ ملا لیں۔ اس کو مکمل مہاسے والی جلد پر استعمال نہ کریں لیموں کا رس کے استعمال سے انفیکشن ہو سکتا ہے۔

2- گاجر 50 گرام، شہجم 50 گرام، دودھ 25 ملی لیٹر۔ گاجر، شہجم کو اچھی طرح ابال لیں اور پانی کا اچھی طرح گودا بنا لیں پھر اس میں دودھ مکس کریں اور اس مکچر کو چہرے پر لگا لیں۔ پہلے اس کو رگڑتے ہوئے چہرے سے دور کریں اور پھر نیم گرم پانی سے چہرہ دھو کر صاف کر لیں۔

نارمل جلد کا فیس اسکرپ

1- خشک دودھ پاؤڈر ایک چمچ، جو کا آٹا ایک بڑا چمچ، لیموں کا رس دو بڑے چمچ۔ ان تمام اشیاء کو اچھی طرح ملا لیں اور چہرے پر لگا لیں جب خشک ہونے لگے تو اس کو رگڑ کر اتار لیں۔ پھر نیم گرم پانی سے چہرے کو دھو لیں اور اس کے بعد تھنڈے پانی سے بھی دھو لیں۔

2- ایک کیلا، انڈے کی زردی، زیتون یا بادام کا تیل، ایک چمچ انڈے کی زردی اور تیل کو اتنا پیسٹ بنائیں جب تک کہ وہ یکجان نہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ایک کپے ہوئے کیلے کے گودے میں انڈے اور تیل کے آمیزے کو ملا کر چہرے اور گردن پر لگا لیں۔ اس کو آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں۔ پھر چہرے کو تھوڑے سے لیموں ملے پانی سے دھو لیں بعد میں چہرے کو تھنڈے پانی سے دھو لیں یہ داغ دھبے دور کرنے کے لیے موثر نسخہ ہے۔

3- خشک دودھ کا پاؤڈر دو چمچ، شہد ایک چھوٹا چمچ، آڑو یا خوبانی کا گودا دو بڑے چمچ، لیموں کا رس ایک چھوٹا چمچ۔

تمام اجزاء کو مکس کر کے چہرے اور گردن پر ملیں۔ چہرے کو لیموں ملے پانی سے دھو لیں اور تھنڈے پانی سے دھو لیں۔

4- بارہک پے ہوئے بادام ڈھائی سو گرام، دودھ یا پانی سو ملی لیٹر، بارہک پے ہوئے بادام میں دودھ یا پانی ملا کر ایک پیسٹ بن جائے۔ پھر اس کو چہرے اور گردن پر ملیں۔ اس کو تیس منٹ لگا رہنے دیں اس کے بعد نیم گرم پانی سے دھو لیں اور تھوڑے سے بادام کے تیل سے جلد پر مالش کریں۔ یہ جلد سے داغ دھبے دور کر کے نرم و ملائم بنا دے گا۔

5- اسٹراپیری فیس اسکرپ: اسٹراپیری سو گرام، خشک دودھ کا پاؤڈر دو چمچ، لیموں کا رس ایک چھوٹا چمچ۔ اسٹراپیری کا گودا لے کر اس کو پاؤڈر ملک اور

ترکیب: تیل میں پیاز براؤن کر کے گوشت اور مصالحہ ڈال کر بھون لیں۔ گوشت گلا لیں پھر اس میں تمام سبزیاں مناسب سائز میں کاٹ کر ڈال دیں اور اتنا پانی ڈال دیں کہ سبزیاں گل جائیں۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر بھون لیں اور ہر ادھیا چھڑک کر اتار لیں۔

اروی کے پتور

اجزاء
اروی کے پتے : دو عدد
سرخ مرچ نمک : حسب ضرورت
پیاز : آدھا پاؤ
ہر ادھیا : آدھی گھی
نمک : ایک پاؤ
انار دانہ : دو کھانے کے چمچ
سبز مرچ : چار عدد (باریک کٹی ہوئی)
خشک ادھیا : دو چائے کے چمچ
کھجور : حسب ضرورت

ترکیب: اروی کے پتوں کو دھو کر باریک کاٹ لیں۔ ہر ایک مرچ کو بھی باریک کتر لیں پیاز کو باریک پھون میں کاٹ لیں۔ دھنیے کو توڑے پر لگا سا بھون لیں۔ ہرے دھنیے میں چن کر باریک کاٹ لیں۔ انار دانے کو چن کر صاف کر لیں۔ اب ان تمام اجزاء کو نمک میں ملا دیں۔ نمک مرچ بھی ڈال دیں اور پانی ڈال کر اس آمیزے کی پیسٹ سی بنا لیں کچھ دیر رکھا رہنے دیں۔ ایک کڑا ہی میں تیل گرم کر کے اس میں پہلے سے تیار کردہ آمیزے سے پتور بنا کر تیل لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر کڑا ہی سے نکال لیں اور ہری مرچ انار دانے کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

فکڑے کڑا لیں۔ گوشت ابال کر نیم گلا لیں اور پانی خشک کر کے اتار لیں (پانی اتنا ہی ڈالیں جو مناسب ہو) سب مصالحے پیس کر دہی میں ملا دیں۔ گوشت کے فکڑے تھنڈے ہو جائیں تو ان پر یہ دہی لگا دیں۔ اب یہ فکڑے سلاخوں پر پرو دیں اور دیکھتے ہوئے کونکوں پر سینک کر سرخ کر لیں۔ ساتھ ساتھ تھوڑا تھوڑا سا گھی ڈکاتے جائیں۔ جب وہ کونکوں پر گرنا ہے اور اس کا دھواں نکول کو لگتا ہے تو بہت مزے دار ہو جاتے ہیں۔ کٹی ہوئی پیاز کے پھوں اور لیموں کی قاشوں کے ساتھ پیش کریں۔

باؤلی ہنڈیا

اجزاء
پھول گوبھی : ایک پاؤ
آلو : ایک پاؤ
منر : آدھا پاؤ
گاجر : ایک پاؤ
چندر : آدھا پاؤ
نیتھی : چند پتیاں
ہر ادھیا : چند پتیاں
ادرک لہسن پیسٹ : ایک کھانے کا چمچ
گوشت : آدھا کلو
تیل : ایک پاؤ
گرم مصالحہ : ایک چائے کا چمچ
شہجم : ایک پاؤ
بینگن : ایک پاؤ
ٹماٹر : چار عدد
نمک، مرچ : حسب ذائقہ
شملہ مرچ : دو عدد
ہلدی : ایک چائے کا چمچ
دھنیا (پسا ہوا) : دو چائے کے چمچ
ہری مرچ : چار عدد

MEDICAM

Pro-Tech
Dental Cream

DOUBLE ACTION

Sensitivity

Bleeding Gums

MEDICAM

Pro-Tech

Dental Cream

Personal Dentist!

مسوڑھوں سے نمون اور Sensitivity سے مکمل نجات!

ہمب اپنے چہرے پر لیں۔ اس سے چہرے کے مسام کھلتے ہیں۔ چہرہ صاف و شفاف رہتا ہے۔ رنگ بھی گورا ہو جاتا ہے۔

☆ گاجر کھائیں۔ گاجر کھانے اور گاجر کا جوس پینے سے بھی رنگ سرخ و سفید ہو جاتا ہے۔

☆ پودینے کی پتیاں اُبال کر انہیں ٹھنڈا کر کے رکھ لیں۔ نہار منہ پودینے کا ایک کپ پانی پینے سے بھی رنگ صاف ہوتا ہے۔

☆ لیموں کا رس چہرے پر ملنے سے بھی رنگ گورا ہوتا ہے۔

آسان ٹوٹکے آزمائیے

☆ بالوں کو چمکدار بنانے کے لیے لیموں کا رس نکال کر اس کی مالش کر کے تھوڑی دیر کے بعد دھو لیں۔ اس کے علاوہ شیمپو کرنے سے ایک یا دو گھنٹے پہلے سر پر تیل کی اچھی طرح مالش کرنے سے بھی بالوں کی چمک بڑھ جاتی ہے۔

☆ ناخنوں کو مضبوط بنانے کے لیے ایک گہری پیالی یا پیسٹ میں زیتون کا تیل ڈال کر اس میں ناخنوں کو ڈالیں۔ اس کے بعد نیم گرم تیل میں ڈال کر ناخنوں کو نشوونما سے صاف کر لیں۔ کچھ دنوں کے بعد ناخن مضبوط ہو جائیں گے۔

☆ سردیوں میں بچے ہونٹوں پر گائے کا کچا دودھ لگانا چاہیے اس طرح ہونٹ نرم ہوتے ہیں۔

☆ مٹی کے ایک ڈبے میں پچی گول پینڈے والی کٹوری کے ارد گرد مہندی، چینی اور چائے کی پتی ڈال کر ڈبے کو گوند سے ہونے آئے سے بند کر کے آگ پر آدھا گھنٹہ کے لیے رکھ دیں آدھے گھنٹے کے بعد لوشن تیار ہو جائے گا۔

☆ روزانہ دو سے تین چمچے شہد ملا کر پینے سے سردیوں میں چہرے کی خوب صوری میں اضافہ ہوتا ہے۔

☆ شام کنول۔ لودھراں

لیموں کے رس کے ساتھ ملائیں۔ اس کو چہرے اور گردن پر مل لیں۔ رگڑائی کے عمل سے پہلے پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر اس کو نیم گرم پانی سے جس میں لیموں کا رس ملا ہوا ہو دھو لیں اور آخر میں چہرے کو ٹھنڈے پانی سے دھو لیں۔

ہونٹوں کے لیے

ہونٹوں پر خشکی کی وجہ سے پھڑی آتی ہے۔ آپ رات کو باقاعدگی سے گلیسرین لگائیں۔ گائے کا کچا دودھ ہونٹوں پر لگانا بہت مفید ہے۔ بالائی لگانے سے بھی ہونٹوں کا خشک دور ہو جاتی ہے۔

ایڑیوں کا پھٹنا

چار چمچ گلیسرین، ایک لیٹل لیموں کا عرق ملا لیں۔ دو چٹنی پیسی ہوئی، چھوٹی ملائیں۔ دہان میں تین بار لگائیں۔ رات سونے پہلے چارک لگا پانی میں ایک چمچ، نمک اور ایک چمچ سرسوں کے تیل ملا لیں۔ دس منٹ تک دونوں پیر اس محلول میں رکھیں۔ پھر جھانوس سے رگڑ کر صاف کر لیں۔ اس کے بعد پاؤں خشک کر کے اچھا سا پاؤں لوشن لگائیں۔ اگر پاؤں لوشن نہ ہو تو گلیسرین اور عرق گلاب کا محلول بنا کر رکھ لیں سونے سے پہلے پیروں پر لگائیں۔

بالوں کے لیے

دہی میں ایک چمچ ناریل کا تیل ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ سر دھونے سے آدھا گھنٹہ پہلے اس کو اچھی طرح سر اور بالوں پر لگائیں۔ پھر سر دھو لیں بال چمک دار ہو جائیں گے۔ کچھ لوگوں کو دہی کے استعمال سے خشکی بڑھ جاتی ہے ان کے لیے مشورہ ہے کہ ناریل کے تیل میں لیموں کا رس ملا کر اس سے سر کی خوب مالش کریں اور ایک گھنٹے بعد سر دھو لیں۔

رنگ گورا کرنے کے لیے

☆ کسی برتن میں پانی اُبال لیں۔ پھر اس کی